ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it

DUE DATE

Cl. No. ٨١٣ ن۲ع ۳ Acc. No. C 11502

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1 per day, Over night book Re 1 per day.

پہلا باب

بخار

صبح سویرے سے لے کر بارہ بجے تک دالان میں دھوپ رہتی۔ ایک در پر جوہی کی بیل تھی۔ اس حصے میں ذرا ٹھنڈک رہتی تھی۔ بیچ کے در سے آنے جانے کا راستہ تھا۔ اسی در کے سامنے دالان میں ایک میز اور ٹوٹی کرسیاں تھیں۔ میز پر کتابوں کا انبار رہتا۔ اور آخری در کے مقابل پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک موٹا سا گدا تھا اور اس کا بچھونا جو ایک سوزنی، دو تکیوں اور ایک کمبل پر مشتمل تھا۔ دن کو پلنگ پر بھی کتابیں پڑی رہتیں۔

جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ فروری کے ان دنوں میں سے تھا جب حیدرآباد میں جاڑے برائے نام ہی سہی، گرمی کے موسم میں بدلنے لگتے ہیں۔ دن بھر خفیف سی لیکن [illegible] رہی تھی جس کی وجہ سے نعیم نے پڑھتے پڑھتے کئی بار دل میں کہا [illegible]

: : گرمی شروع ہو گئی۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد دھوپ بھی دالان سے جا چکی تھی۔ صرف دالان کے کھلے ہونے کی وجہ سے فضا میں گرمی کی سی تاثیر تھی۔ نعیم پڑھتے پڑھتے سو گیا اور ساڑھے تین بجے کے قریب اٹھا تو سر میں کسی قدر گرانی تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے کا ارادہ کیا۔ دالان کے اندر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں اس کے کپڑوں اور کتابوں کے صندوق تھے۔ اس نے سب قمیصوں کا جائزہ لیا۔ کوئی ٹھیک حالت میں نہ تھی۔ کسی کے کف پھٹ گئے تھے۔ کوئی کالر کے قریب کسی قدر پھٹی ہوئی تھی۔ غرض ان میں ایک قمیص کسی قدر بہتر حالت میں تھی۔ وہ نکالی۔ اسی طرح ایک پاجامہ اور شیروانی انتخاب کی۔ پھر کپڑے پہن کے وہ دالان میں آکر بیٹھ گیا۔ بازار سے اس نے ایک آنے کی چائے کی پیالی منگوائی۔ بہت گاڑھی چائے، جس پر نصف انچ موٹی بالائی کی تہ تھی اور اس کے متعلق اکثر دوستوں کا نظریہ تھا کہ اس میں نشہ بھی ملا ہوتا ہے تاکہ جو لوگ اس چائے خانے کی چائے پیتے ہیں ہمیشہ پیتے رہیں۔ چائے کی پیالی کے ساتھ ہی ٹین کا ایک میلا سا چمچہ بھی چائے خانے سے آتا تھا۔ نعیم کو یہ چمچہ چائے سے زیادہ ناگوار تھا۔

اس نے چائے پینے کے بعد پاتا بے پہنے جو بہت میلے تھے اور ان کی وجہ سے اس کے پیروں سے بُو آتی تھی۔ جوتے پہنتے ہوئے اس نے دالان کی سرخ مٹی کو دیکھا جس پر کسی قسم کا فرش نہیں تھا اور اس سے گرد اُڑ اُڑ کر بہت مدت تک اس کے اس پلنگ اور بچھونے پر پڑتی رہی تھی۔

"خدا وہ دن لائے کہ مجھے اس دالان سے باہر کہیں اور رہنا نصیب ہو یا اس دالان کو فرش نصیب ہو۔"

دل میں کہا اور اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

عابد شاپ سے اس نے قمیضوں کا کپڑا خریدا اور درزی کو دیا۔ اس احساس کے ساتھ کہ ممکن ہے مہینے میں پندرہ دن چائے ناغہ کرنا پڑے۔

سیمنٹ کی سڑکوں پر سے ہوتا ہوا وہ ایک گلی میں مڑا۔ جہاں نیچی نیچی دکانوں میں ٹین کا سامان، غلّہ اور مٹھائیاں بکتی تھیں۔ اس کے آگے ایک سینڈی خانہ تھا جس کے سامنے سرِشام ایک ہجوم رہتا تھا اور آگے دو تین پختہ مکانات تھے لیکن چھوٹے چھوٹے۔ ان میں دیسی عیسائی رہتے تھے۔ ان کی لڑکیاں کبھی گہرے نیلے یا گہرے آسمانی رنگ کی فراکیں پہن کے نکلتی تھیں اور نعیم ان کی طرف بڑی حسرت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے بعد کچھ کھلا ہوا حصہ تھا۔ کچھ اور دکانیں تھیں۔ بیچوں بیچ ایک نالی بہتی تھی۔ دکاندار اور ان کے گاہک سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے والوں کو باہم گالیاں دیا کرتے۔ اس کے آگے کچھ کھلا ہوا میدان تھا جس میں بدبودار نالیاں بہتی تھیں اور پھر وہ محلہ آتا تھا جو جدید حیدرآباد کے اچھے محلّوں میں شمار ہوتا ہے یعنی صفدر نگر۔ یہاں سیمنٹ کی ایک سڑک تھی جس پر بند اور کھلی موٹروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ پیدل چلنے والے سڑک کے کنارے اس حصے پر چلتے تھے جہاں سیمنٹ کی تہ نہیں ہے۔

صفدر نگر میں نئی وضع کے بہت سے مکانات بنے تھے۔ مکانات کے متعلق حیدرآباد میں عجیب و غریب تجربے ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ انہی نئے مکانوں میں سے ایک میں عاقل خاں رہتے تھے۔ ان کی بیوی خاندان بھر میں "خانم" کے نام سے مشہور تھیں۔ اس نام کے سوا اگر کسی اور چیز کو شہرت حاصل تھی تو ان کے حسنِ اخلاق اور وضعداری کو۔ ان دونوں

میں تمیز کرنا دشوار تھا۔

نعیم اپنے خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا ——— جن میں صرف موٹروں کی آمد و رفت لمحہ بھر کو سے گزر جانے کے باعث خلل واقع ہوتا تھا ——— بایاں شانہ دائیں شانے کے مقابل زیادہ جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

عاقل خاں صاحب کے مکان میں پہنچ کر اس نے کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ کسی قدر خاموشی سی تھی۔ وہ درمیان کے ہال میں پہنچا جہاں ایک پرانا صوفہ، چند بے ربط کرسیاں اور کچھ ایسا فرنیچر جس کا ڈرائنگ روم سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، بے ترتیبی سے پڑا تھا۔

یہاں بھی خاموشی تھی وہ پردہ اٹھا کے، پہنچا جہاں ایک بہت وسیع دالان تھا اور دالان کے دونوں جانب دو بہت بڑے کمرے۔ دالان میں بھی کوئی نہیں تھا ——— سیدھے ہاتھ کے کمرے میں ایک پلنگ کے پاس کرسی پر خانم بیٹھی تھیں۔ ایک تپائی پر کچھ دوائیں رکھی تھیں اور پلنگ پر ہلکی سی رضائی اوڑھے خانم کی لڑکی بلقیس لیٹی تھی۔

بلقیس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ خانم کہا کرتی تھیں کہ ان کے بال بھی ہلکے بھورے تھے مگر ان کی ماں نے شاید کھوپرے یا کسی اور چیز کا تیل لگا لگا کے سیاہ کر دیئے۔ بلقیس کا چہرہ گول تھا اور رنگ اس قدر صاف جیسے اینگلو انڈین لڑکیوں کا، اس کی عمر تیرہ برس کی تھی مگر ابھی خاصی بھرے بھرے جسم والی تھی اس کی ہنسی چوڑی تھی بچپن ہی سے۔ لڑکی جاذب توجہ تھی۔

لیکن بلقیس سے پہلے خانم کا تعارف ضروری ہے۔ خانم کی عمر اس وقت کوئی پینتیس سال ہوگی لیکن باوجود اس کے کہ وہ تین بچوں کی ماں تھیں، ان کے چہرے پر حسن کے آثار ویسے ہی باقی تھے۔ جہاں تک چہرے کی ساخت کا تعلق ہے وہ بلقیس سے زیادہ خوبصورت تھیں۔

ان کا رنگ بلقیس سے دبتا ہوا تھا۔ بلقیس کا دہانہ اچھا نہیں تھا، خانم کا بہت خوبصورت تھا۔ ناک نقشہ میں بلقیس کو ماں کی میراث نہیں ملی تھی۔

نعیم نے پوچھا "کیوں خیریت ہے۔ بلقیس کی طبیعت کیسی ہے؟"

خانم نے کہا "اسے بخار آگیا ہے ڈاکٹر نے ٹائیفائڈ تشخیص کیا ہے۔"

نعیم نے تفصیلات پوچھیں کب سے بخار ہے؟ کس کا علاج ہے؟ بہت فکر و تردد کا اظہار کیا اور اس کے بعد تیمارداری کے لئے آمادگی ظاہر کی۔

اس دن سے وہ کالج سے چھٹی کے بعد سیدھا خانم کے یہاں آنے لگا اور تیمارداری کے سلسلہ میں جو خدمت اس کے سپرد کی جاتی اسے انجام دیتا۔

(۲)

ایک دن سہ پہر کے وقت بلقیس سو گئی تھی۔ خانم دالان میں تخت ہی پر لیٹے لیٹے اونگھ رہی تھیں اور بے خیالی میں ان کے پیر گھٹنوں تک کھلے ہوئے تھے۔ نعیم ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظر خانم کے پیروں پر پڑی۔ پھر خانم کے چہرے پر جو نیند میں اور بھی بھلا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ذہن میں برنرڈ شا کے ان ڈراموں کا خیال آیا جن میں کم عمر نوجوان تیس سالہ عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خانم کی پوری زندگی کے متعلق سوچنے لگا۔ جو کچھ اس نے دوسروں سے سنا تھا، جو کچھ خود دیکھا تھا، ایک فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔

خانم کے والد اورنگ آباد میں وکیل تھے۔ آج تک ان کا مکان وہاں ہے اور ان کا بیٹا وہاں ڈاکٹر ہے۔ خانم سے بڑی ان کی ایک اور بہن تھیں — خانم سے کوئی سات سال بڑی۔ ان کی شادی پندرہ سولہ سال کے سن میں ہو گئی تھی۔ خانم ابھی بہت چھوٹی تھیں۔

جب خانم بڑی ہوئیں تو گھر میں اکیلی تھیں۔ کیونکہ ان کی ماں گٹھیا میں مبتلا ہونے کے باعث صاحب فراش رہتیں اور ان کے والد دن کا وقت کچہری میں اور شام کا وقت کلب میں عہدہ داروں کی خوشامد میں گزارتے۔

نعیم نے سنا تھا کہ بچپن میں خانم بہت شوخ اور طرار تھیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ خانم کی شوخی اور ظرافت عمر بھر باقی رہی۔ اسی لئے لوگ خانم سے مل کر خوش ہوتے تھے۔

خانم نے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا بھی سیکھا تھا مگر اس زمانے میں عورتوں کے لکھنے پڑھنے کا رواج ذرا کم ہی تھا۔ اضلاع میں یہ کمی اور زیادہ تھی مگر خانم یوں بہت سمجھدار تھیں۔

خانم کے دشمنوں سے نعیم نے خانم کے متعلق ایک قصہ سنا تھا۔

قصہ یہ تھا کہ خانم بالاخانے سے مٹی اٹھا اٹھا کے سڑک پہ آنے جانے والوں پہ کنکر پھینکا کرتی تھیں۔ ایک دن کوئی منچلا نوجوان ان کی اس ادا پر عاشق ہو گیا۔ خانم کی عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ عاقل خاں سے خانم کی نسبت ہو چکی تھی۔ اس کمسنی اور الھڑپن میں کہا جاتا ہے کہ انہیں ان ذمہ داریوں کا احساس نہ رہا جو ہندوستانی لڑکیوں کے لئے زندگی سے زیادہ اہم ہیں۔ منچلا نوجوان کسی نہ کسی ترکیب سے خانم کے کمرے میں پہنچا۔ معلوم نہیں اس عشق نے کیا مدارج طے کئے۔ مگر یہ ضرور مشہور ہے کہ خانم کے والد کو شبہ ہوا۔ وہ خانم کے کمرے میں پہنچے۔ خانم خود چراغ لے کر آگے بڑھیں کہ آئیے دیکھئے یہاں کوئی نہیں۔ کمرے کے بیچ میں پردہ بندھا تھا۔ پردے کے پیچھے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی اور خانم کے والد اس طرف لپکے لیکن اتنے میں [illegible] فرش سے مٹھی بھر مٹی اٹھا کر خانم [illegible] آنکھوں [illegible] منچلا عاشق یہ جا وہ جا!

اس رات غالباً خانم کے والد اپنی صاحبزادی کیلئے اور اپنے لئے طرح طرح سزائے موت تجویز کرتے رہے۔ چلّو بھر پانی سے لے کر تلوار اور طمنچہ، پسی ہوئی کانچ اور زہر تک۔ اور خانم کی والدہ اپنا سر پیٹتی رہیں۔ خانم روتی رہیں۔ لیکن صبح کو خانم کے والد نے نہ اپنا کام تمام کیا اور نہ اپنی لڑکی کا۔ ہاں صاحبزادی کو شادی کے وقت تک قید رکھا اور شادی کی تاریخ جلد مقرر کرائی۔ ہر طرح کی کوشش کی کہ بدنامی اور زیادہ نہ ہو۔ پھر بھی ایسی خبریں کہیں چھپتی ہیں قریب تھا کہ نسبت چھوٹ جائے مگر عاقل خاں کے والد وضعدار بزرگ تھے۔ انہوں نے اس قصہ کو بہتان قرار دیا اور عاقل خاں سے خانم کی شادی ہوگئی۔

شادی کی پہلی رات کو ممکن ہے عاقل خاں کو اس کا علم ہو جاتا کہ ان کی بیوی صاحبہ کنواری ہیں یا نہیں مگر عاقل خاں اس زمانے میں کسی طرح اسم بامسمّٰی نہیں تھے اور شب عروسی کو ضرورت سے زیادہ بوکھلائے ہوئے تھے۔

اس لئے نہ انہوں نے یہ غور کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہ انہیں اس کا ہوش تھا۔

یہ پورا قصہ نعیم نے متعدد بار سُنا تھا۔ مگر اسے کبھی اس پر یقین نہیں آیا۔

شادی کے بعد خانم پر بہت سے بہتان باندھے گئے۔ مثلاً یہ کہ عاقل خاں کے بھائی فاضل خاں سے ان کے تعلقات ہیں۔ مگر نعیم کو یقین تھا کہ کم از کم یہ الزام تو بالکل جھوٹ ہے۔ کیونکہ اس نے ملقیس کی علالت ہی کے زمانے میں دوسرے کمرے سے خانم اور فاضل خاں کو باتیں کرتے سُنا۔ ان دونوں کو اس کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ باتیں ایک عورت کے متعلق تھیں جو فاضل خاں کی داشتہ تھی۔ فاضل خاں کے بچے کی تعلیم تھی جو دوسروں کے سامنے ہوتی تھی طرز کلام اور نفس گفتگو سے نعیم کو یقین

ہو گیا کہ یہ الزام غلط ہے۔

مگر یوں خانم کافی شوخ و شنگ تھیں۔

(۳)

بلقیس خانم کی اولاد میں سب سے بڑی تھی۔ پہلے پہل تو خانم کو ذرا افسوس ہوا کہ کاش لڑکا پیدا ہوتا مگر بہت جلد یہ تمنا بھی پوری ہو گئی۔ دو تین سال کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوئے اور دو تین سال کے بعد ایک اور۔ خانم کا افسوس بہت جلد اس وجہ سے بھی کم ہو گیا کہ جو کوئی بلقیس کو دیکھتا کہتا "کیسی پیاری لڑکی ہے" بچپن میں اس کے بال اور بھی زیادہ ہلکے بھورے تھے اور رنگ بھی انگریزوں کا سا تھا۔ خانم اپنے دل میں کہتیں کہ بڑی ہو کر یہ لڑکی میموں سے زیادہ خوبصورت نکلے گی لیکن انہیں اس کا خیال کبھی کبھی ضرور آتا کہ جب یہ لڑکی بڑی ہو گی تو وہ خود بوڑھی ہونے لگیں گی مگر یہ سب مستقبل بعید کی باتیں تھیں اور اس زمانے میں تو خانم ماشاءاللہ جوان اور خوبصورت تھیں۔

جوں جوں بلقیس بڑھنے لگی خانم کا شوق بھی بڑھنے لگا کہ ان کی لڑکی کسی میم سے کم نہ ہو انگریزی انگریزوں کی طرح بولے۔ انہی کی طرح رہے۔ خانم کے کچھ متمول عزیز حیدرآباد میں تھے اور ان کی لڑکیاں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی ایک لڑکی نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف بجائے اپنے بڑے چچیرے بھائی کے چھوٹے چچیرے بھائی سے شادی کی تھی۔ الغرض ان مالوں سے خانم نے، اور ان کی دلیلوں سے قائل ہو کے عاقل خاں نے یہ تصفیہ کیا کہ "، کی لڑکی انگریزی پڑھے گی اور انگریزی بولے گی۔ اور جب تک سن بلوغ کو نہ پہنچے (اس کے بعد دیکھا جائے گا) انگریزی کپڑے پہنے گی۔

عاقل خاں بیچارے میٹرک فیل تھے۔ پہلے وکالت درجہ سوم کا امتحان دیا ــــ پھر

عہدہ داران مال و عدالت کی توجہ سے ان کا کام چل نکلا۔ اس کے بعد جوڈیشل امتحان پاس کیا اور وکیل درجۂ اوّل ہو گئے، اپنے نام کے آگے وکیل ہائی کورٹ لکھنے لگے۔ قحط کے زمانے میں تھوڑی بہت جائیداد پیدا کر لی اور اس زمانے میں جبکہ صفدر نگر تقریباً دلدل اور ملیریا کا گھر تھا، بہت سی زمین خرید لی۔ اس کے بعد جب صفدر نگر شہر کے بہت اچھے محلوں میں گنا جانے لگا اور وہاں بہت سے مکانات بن گئے تو زمین بہت منافع کے ساتھ بیچی۔ صرف ایک پلاٹ اپنے پاس باقی رکھا اور اس پر بہت اعلیٰ درجے کا جدید وضع کا مکان بنوا لیا۔ یہ وضع حیدرآباد میں "جرمن ڈیزائن" کے نام سے مشہور ہے۔

قصہ مختصر عاقل خاں ـــ جو برعکس نہند نام زنگی کافور سے قطع نظر ـــ تعلیم سے بھی تقریباً محروم تھے، اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ خانم کی دُور رس نظر کی قدر کریں اور اپنی لڑکی کو انگریزی قسم کی اعلیٰ درجہ تعلیم دلائیں۔

اس زمانے میں کئی اینگلو انڈین عورتوں نے بورڈنگ ہاؤس کھول رکھے تھے جن میں حیدرآباد کے ترقی پسند نواب اپنی چار سے آٹھ نو برس کی عمر کی لڑکیوں اور اسی عمر کے لڑکوں کو داخل کر دیا کرتے اور ان کے بچے ان کو پاپا اور اپنی ماؤں کو ماما یا ممی کہا کرتے۔ نیز انگریزی اتنی اچھی بولنے لگتے کہ یونیورسٹی کے گریجویٹ کو ان بچوں کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان بچوں کے والدین کا یہ خیال تھا کہ سب سے اچھا بورڈنگ ہاؤس وہی ہے جس کی فیس سب سے زیادہ ہو۔

انہی میں سے ایک بورڈنگ ہاؤس کا نام کارنش کلف CORNISH CLIFF تھا۔ بلقیس کو عاقل خاں نے اس میں داخل کر دیا۔ میڈم جب ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرتیں تو عاقل خاں اس اعزاز سے پھُولے نہ سماتے اور خانم اس درجہ مرعوب تو نہ ہوتیں مگر

خوش ضرور ہوتیں بلقیس جب تعطیلوں میں گھر آتی تو خانم اس کے لئے انگریزی کھانے پکواتیں اور جب اسے دیکھنے کارنش کلف جاتیں تو چاکلیٹ لے جاتیں۔

خانم اور عاقل خاں کے بعض عزیزوں نے انہیں یہ سمجھانا چاہا کہ انگریزیت کی نقل اور چیز ہے اور انگریزوں کے ہنر سیکھنا دوسری بات ہے۔ مگر جب بلقیس گھر آ کے پاپا اور ماما سے صاف صاف انگریزی میں پیاری پیاری باتیں کرتی تو انہیں یہ محسوس ہونے لگتا کہ ان کے جاہل عزیز ان سے جلتے ہیں اور اس کے بعد وہ یا تو اس قسم کے اعتراضات کا سخت جواب دیتے یا بے توجہی سے اس کان سنتے اور اس کان اڑا دیتے۔

(۴)

دن کی گرمی میں نعیم اپنی ٹوٹی پھوٹی آرام کرسی پر لیٹ جاتا تو عشرت منزل پہنچ جاتا۔ عشرت منزل میں بہت سی تصویریں تھیں، بہت سے مجسمے تھے اور بہت سی جاندار چلتی پھرتی عورتیں تھیں۔ عشرت منزل میں مونالیسا تھی۔ وینس تھی۔ گاڈیوا گا رہی تھی عشرت منزل میں ان تمام عورتوں کی تصویریں تھیں جن کو اس نے ریل گاڑیوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا تھا اور پسند کیا تھا۔ اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جن کے نام وہ کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ عشرت منزل میں آہستہ آہستہ بلقیس کی تصویر کھنچ رہی تھی۔ یہ تصویر مجسمہ بن گئی اور مجسمہ چلنے پھرنے لگا۔ زندہ ہو کر یہ مجسمہ اور بہت سے مجسموں کی طرح کبھی سب کے ساتھ کبھی تنہا عشرت منزل میں نعیم کے ساتھ گشت لگاتا۔ کبھی بیداری میں کبھی خواب میں، کبھی اس حالت میں جب حواس نیم خفتہ اور نیم بیدار ہوتے ہیں۔

عشرت منزل کے ساتھ عموماً کوئی نہ کوئی کہانی وابستہ ہوتی۔ عشرت منزل ایک

ملنسار تھی جس کی ہر رہنے والی اور نعیم میں ایک معاشقہ ہو چکا تھا اور معاشقہ بھی وہ جو داستان کی سی شکل رکھتا تھا۔

جب بلقیس عشرت منزل میں آئی تو داستان بخار کے متعلق تھی۔ نعیم نے جو تیمارداری کی ہے اس سے رفتہ رفتہ بلقیس کو محبت ہوتی جاتی ہے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر دیکھتی ہے کبھی نعیم اس کی پیشانی پر یوڈیکولون کی پٹیاں رکھ رہا ہے۔ کبھی اس کے پلنگ کے قریب کتاب پڑھ رہا ہے اور اونگھ رہا ہے اور اسی طرح نعیم نے جاگ جاگ کے تین ہفتے گذارے ہیں وہ دن کو بھی نہیں سویا اور اس کی آنکھیں جل رہی ہیں اور بالآخر ایک روز صبح ہوتے وقت جب سب لوگ سوئے ہوتے ہیں، بلقیس اس سے کہتی ہے سو جاؤ۔ نہیں سوتا۔ بلقیس پھر کہتی ہے۔ وہ کچھ جواب نہیں دیتا۔ بلقیس کی آنکھیں صاف صاف بتا رہی ہیں کہ وہ اس کی اس محبت کی قدر کرتی ہے۔ بلقیس کو بھی اس سے کچھ محبت ہے، بیشک محبت ہے، بہت محبت ہے۔ بلقیس اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے رخسار پر رکھتی ہے۔ بخار کی وجہ سے بلقیس کے رخسار جل رہے ہیں......

اتنے میں نعیم کے کوئی دوست اس سے ملنے آئے اور وہ اس سلسلۂ خیال سے چونک پڑا۔ اس کے بعد ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا تو گویا پانی کے ساتھ عشرت منزل بھی پگھل کر حلق کے نیچے اتر گئی۔

دوسرا باب

نعیم کی ڈائری کے کچھ ورق

۲۲ جون ۱۹۳۵ء۔ اب جو میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو صبح کی سپیدی
اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا اور بستر کو جلدی جلدی باندھنے لگا۔ اتنے میں کوئی
اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی تین یا چار منٹ ٹھہری۔ ایک برتھ پہ مہتمم صاحب آبکاری بلا کچھ اوڑھے
ہوئے مزے میں سو رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے موٹے آدمیوں کو سردی نہیں لگتی۔ مجھے تو
اپنے قریب کی کھڑکیاں بند کر دینی پڑی تھیں اور اس کے علاوہ کمبل اوڑھنا پڑا تھا۔ نیچے
کی ایک اور برتھ اور اوپر کی دو برتھوں پر ریلوے کے تین ملازمین سو رہے تھے۔ جب
سٹیشن آیا تو ان میں سے ایک صاحب جاگ اٹھے اور "بوگل کنڈ" کی انگریزی میں دوسروں
کو پکارا۔ وہ بھی یکے بعد دیگرے اٹھے اور اپنے اپنے بستر لپیٹنے لگے۔ پیچھے کے ڈبے
سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نواب صاحب

کا ہاتھ ٹرین سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اب کے مولا علی کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری میں نیچے اُتر کے پیچھے کے ڈبہ میں پہنچ گیا جس میں نواب صاحب اور سب ہمسفر تھے۔ ملازمین ان سب کے بستر باندھ کر نیچے اُتر چکے تھے۔ نواب صاحب نے ان لوگوں سے کہا "ان کا بچھونا بھی تو باندھ دو"

میں نے کہا "میں اپنا بستر باندھ چکا"

انہوں نے پوچھا "باندھ چکے؟"

میں نے کہا "جی ہاں!"

کہنے لگے "سونے سے پہلے ہی باندھ چکے؟"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ غنیمت ہے کہ آج نواب صاحب کے مذاق میں طنز کا وہ اثر نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا "حیدرآباد شروع ہو گیا؟"

میں نے کہا "جی ہاں تقریباً شروع ہو گیا"

نواب صاحب ہنسنے لگے "تقریباً شروع ہو گیا" پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کے کہنے لگے "بھئی سُنا ڈاکٹر صاحب آپ نے؟ میاں نعیم کہہ رہے ہیں تقریباً شروع ہو گیا" اس پر سب تھوڑا بہت ہنسے۔

کل میں نے تقریباً کا لفظ زیادہ استعمال کیا تھا۔ نواب صاحب کو اور لطف کا بہانہ آگیا تھا۔

نواب صاحب نے کہا "تم جس ڈبے میں سوئے تھے وہاں بھی بہت کھٹمل تھے کاٹا ہوگا؟"

میں نے کہا "جی ہاں اس سے بالکل ملا ہوا ڈبہ ہے۔ رات کو تقریباً نیند نہیں آئی"

اس تقریباً پر نواب صاحب نے اور پھر سب نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ کی ایک خاص قسم وہ ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اب کچھ کہنے والے ہیں۔ ان کے ہونٹ کچھ تھرتھرائے۔ پھر انہوں نے کہا "نواب صاحب!"

نواب صاحب نے جلدی سے خشک لہجے میں کہا "جی!"

"تت۔ تت تقریباً پر مجھے ایک قصہ یاد آگیا۔۔۔۔۔۔۔ شہزور خاں بھی تقریباً ب۔ بب۔ بہ۔ بہت بولتے ہیں۔ ان سے ک ک کسی نے پوچھا 'یہ آپ کا۔۔۔۔۔ ل ۔۔۔۔۔۔ل۔۔۔۔۔۔ لڑکا ہے۔۔۔ ان کے لڑکے کے مت۔۔۔۔ مت۔۔۔۔ت"

نواب صاحب اور راجد نے یک زبان ہو کے لفظ پورا کر دیا "متعلق"

ڈاکٹر صاحب بھی اس اثنا میں اس لفظ کو پورا کرنے پر قادر ہو گئے "متعلق۔۔۔

تو شہزور خاں نے جواب دیا۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ تقریباً"

اس پر سب خوب ہنسے۔ نواب صاحب نے کہا "بھئی خوب"

سکندر آباد اسٹیشن آگیا۔ نواب صاحب مع تمام ساتھیوں کے اترے سامان اترنے لگا۔ صرف میں کاچی گوڑہ اسٹیشن پر اترنے والا تھا۔ مہتمم صاحب آبکاری بیدار ہو چکے تھے۔ ان کا موٹا زبردست چہرہ کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جاتے ہوئے کہا "اچ۔۔۔۔۔ اچھا نعیم صاحب کاچی گوڑہ اسٹیشن سے ہمارا س۔ س لام کہہ دیجئے گا"

میں نے کہا "بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!"

بڑی دیر کے بعد گاڑی چھوٹی۔ میں انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تھا۔ موسم بہت اچھا تھا۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس سے برسات کی

خوشبو آتی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ دور دور خوبصورت بنگلے ہجامعہ عثمانیہ کا اسٹیشن اور عمارتیں، کاچی گوڑہ اسٹیشن۔ گاڑی ٹھہری، میں اترا۔ مہتمم صاحب آبکاری سے ہاتھ ملایا۔ تانگے پر گھر پہنچا۔

پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے متعلقہ کچہریوں کا طواف کرنے دس بجے گیا اور تین بجے واپس آیا۔ سو گیا۔ پھر اُٹھا۔ داڑھی بنائی۔ واپسی میں ریزیڈنسی کے قریب اتر گیا۔ کچھ دیر کے بعد بس آئی۔ صفدر نگر پہنچا۔ راستے میں میں نے کہا "اگر آج میں اس (لڑکی) کو دیکھ لوں گا تو وہ میری ہو کر رہے گی"

بلقیس اندر دالان میں در کے پاس کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی "آداب بھائی!"

اس کے چہرے کی بہت سی خصوصیتیں جو صرف اس کے سامنے طرح طرح کی لطیف رنگینیوں کی شکل میں موجود رہتی ہیں اور پھر ذہن سے محو ہو جاتی ہیں، پہلی ہی نظر میں ایک مستقل اور معین حقیقت کی طرح نگاہوں کے سامنے آگئیں۔

اندر کے کمرے میں خانم موجود تھیں۔ بہت محبت سے ——— یا اخلاق سے ملیں۔ پوچھا "تمہارے متعلق سب طے ہو گیا؟" اور یہ سوال بہت متفکر لہجے میں کیا۔

میں نے کہا "جی ہاں خدا کے فضل سے سب ہو گیا"

کہنے لگیں "کب جاؤ گے؟"

"کہاں؟"

"ولایت کو کب روانہ ہو گے؟"

بلقیس اندر آگئی۔ اس کا گداز چہار دہ سالہ جسم بل کھاتا ہوا، اس کا ہاتھ دوپٹے کے آنچل کو جو زمین تک پہنچ رہا تھا، اٹھاتا اور لپیٹتا ہوا۔ اس کا سر سیدھی جانب ایک شانِ دلربائی

سے جھکا ہوا تھا۔ سر کے بھورے بال ـــــ محو کر دینے والے بال جن کا ثانی آج تک میں نے کبھی نہیں دیکھا)

میں نے خانم کے سوال کے جواب میں کہا "ستمبر میں" پھر ان سے پوچھا "آپ وقارآباد سے کب آئیں؟"

"ابھی شام کو۔"

میں نے کہا "میں بھی صبح کو اورنگ آباد سے آرہا ہوں"

بلقیس بولی "خواہ مخواہ انگلستان پڑھنے کے لئے پہنچنے سے کیا فائدہ؟ ہندوستان میں تعلیم نہیں ہو سکتی؟"

خانم نے کہا "تمہارے آئی۔سی۔ایس میں جانے سے جو لوگ جلتے ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے"

بلقیس نے حیرت سے سانس کھینچ کر کہا "سب بھلا حسن کی؟" اس کے لہجے میں شکایت کی جھلک تھی۔

"نہیں" میں نے کہا "انگلستان تعلیم کے لئے جانا غلامی ہے چونکہ ہم لوگ غلام ہیں اس وجہ سے جاتے ہیں۔ نہیں تو کیا یہاں تعلیم نہیں ہوتی۔ وہاں جا کے صرف شان بڑھ جاتی ہے۔"

میں نے خانم سے کہا "اس کو بھی کچھ دنوں کے لئے انگلستان بھیج دیجئے۔ اس کی بھی شان بڑھ جائے گی"

خانم نے کہا "تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ"

بلقیس بولی "نہیں۔ ہم نہیں جاتے"

میری نظر بلقیس کی باہوں پر پڑی۔ اگر اس حسین چہرے، اس ذہانت وجودت اور اس پر لطف ہلکی سی شرارت کے ساتھ اس نے چھریرا، حسین، بھول سا نازک جسم بھی پایا ہوتا تو پھر کیا تھا۔

میں بات بات سے یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ کیا خانم نے سچ مچ بلقیس کے لئے مجھے انتخاب کر لیا ہے۔ خانم میرا اس قدر خیال کرتی ہیں۔ میں اس گھر میں اتنا زیادہ آتا جاتا تھا کہ اکثر لوگوں سے بھی میں نے یہی سُنا ——— اور پھر آئی سی۔ بس۔

اکثر باتوں سے اور خصوصاً خانم کے اس جملے سے کہ تم بلقیس کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ، میرے برخود غلط مفروضات تقویت پکڑ گئے۔

راستے بھر خیالات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ ایسے خیالات جن کی بنیاد مفروضات پر تھی اور جن کو احساسات نے رنگین بنا دیا تھا۔

اکسلسیئر میں ایک فلم دیکھا۔ اچھا خاصا دلچسپ تھا۔ جتنی توقع تھی اس سے اچھا نکلا۔

۲۲ رجون۔ پاسپورٹ کے لئے "پیروی" کرنے شہر جا رہا تھا۔ بس پر سامنے کی نشست پر ایک منشی صاحب ایک طالب علم سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ وہ خبر میں نے ننغ یار جنگ کے جنازے کی نماز تو پڑھ لی مگر اب قسم کھالی ہے کہ کسی گزیٹڈ عہدہ دار کے جنازے کی نماز نہ پڑھوں گا" طالب علم نے پوچھا" اور اگر آپ خود کسی گزیٹڈ عہدے تک پہنچ جائیں؟" کہنے لگے " پہلے تو میں یہ دعا کروں گا کہ خدا میرا دماغ خراب نہ کرے اور اگر دماغ خراب ہو گیا تو پھر تم لوگوں کو یہ وصیت ہے کہ میرے جنازے کی نماز نہ پڑھنا"

واپس گھر پہنچ کر کچھ دیر سو گیا۔ اُٹھا تو بادل چاروں طرف سے گھرے آ رہے تھے۔ کڑک اور چمک بڑھتی جاتی تھی۔ اس لئے شام کو کہیں نہ جا سکا۔

عشرت منزل اور بلقیس کا تصور

۲۴ رجون۔ دن بھر ضروری کاغذات وغیرہ کے سلسلے میں پھرتا رہا۔ پھر عاقل خاں کے یہاں گیا۔ عاقل چچا سو رہے تھے خانم دوسرے پلنگ پر سو رہی تھیں۔ میں نے عاقل چچا کو جگا دیا۔ انہوں نے کہا "کتنے بجے ہیں" میں نے کہا "چار بجے ہیں" انہوں نے کہا "چار بج گئے۔ مجھے ابھی شیو کرنا اور نہانا ہے" مجھ سے کہنے لگے "تم روزانہ نہیں نہاتے۔ یہ کیا عادت ہے آج تم نہیں نہاؤ" میں نے کہا "اچھی بات ہے"

اتنے میں گاراج سے موٹر کے نکلنے کی آواز آئی۔ کہنے لگے "نعیم تم بڑے جھوٹے ہو۔ ابھی تین بجے ہیں" میں نے کہا "نہیں چچا" کہنے لگے "نہیں کیا؟ دیکھو اب بلقیس کو لینے موٹر اسکول جا رہی ہے۔ تین نہیں بجے تو اس وقت موٹر کیسے نکل رہی ہے" میں نے کہا "چچا میں نے آپ کو اٹھانے کے لئے کہہ دیا کہ چار بجے ہیں۔ آپ سوتے رہتے تو کیا میں دیواروں سے باتیں کروں گا؟" "جاؤ تم بھی جاؤ دوسرے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کے سو رہو" میں نے کہا "نہیں آپ سوئیے میں نہاتا ہوں" کہا "نہیں پہلے سو جاؤ پھر نہانا"

دوسرے کمرے میں پہنچ کے میں نے شیروانی اتار کے رکھ دی۔ پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کے آثار نہیں معلوم ہوئے۔ گالسوردی کی FLOWERING WILDERNESS میرے پاس تھی۔ اس کو پڑھنا چاہا۔ نہیں پڑھی گئی بند کر دی۔ اتنے میں عاقل چچا کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ بلقیس اسکول سے آ گئی تھی۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے عاقل چچا سے پوچھا "آپ سوئے نہیں؟" کہنے لگے "نالائق تم نے آ کے مجھے جگا دیا" خانم بھی اُٹھ چکی تھیں

عاقل خاں نے خانم سے کہا "یہ نعیم نالائق نے نہ مجھے سونے دیا نہ تمہیں" پھر مجھ سے کہا "جاؤ نہاتے ہو تو نہالو میں شیو کرتا ہوں"۔ میں نہانے چلا گیا۔

نہا کے باہر نکلا تو خانم کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں بلقیس پہلے ہی سے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ زرد پاجامہ جس پہ بڑے بڑے سرخ اور سبز بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ہلکا زرد دوپٹہ، باریک جالی کا کرتہ اور اس پر گہری آسمانی جاکٹ۔ باریک کرتے سے اس کی شفاف باہیں صاف نظر آتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھ نور کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ سرخ اور سفید رنگ اس کی باہوں میں بھرا ہوا تھا جیسے شیشے میں شراب جس کا نشہ دیکھنے والے کو بھی مخمور کر دے۔ جب وہ اپنے ہاتھوں کو ملاتی تھی تب بھی اس کی نفیس جلد میں کسی خاموش سمندر کے منجمد سکوت کی سی وہ کیفیت موجود تھی جس کی لہریں ساکن معلوم ہوتی تھیں۔ "جنبش" جو نسوانی حسن میں ایک خاص متحرک و متلاطم سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، بلقیس کے ساکن اور متین حسن میں کوئی فرق پیدا نہ کر سکتی تھی۔ بلقیس زندہ مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

اس کے گداز جسم کو پہلی مرتبہ میں نے اس نظر سے دیکھا کہ وہ عورت سے زیادہ "نسوانیت" کا مجسمہ معلوم ہو رہی ہے۔ ایسا مجسمہ جو چل پھر سکتا ہے مگر اس نقل و حرکت سے اس کے مرمریں وقار میں فرق نہیں آسکتا۔ اس کے گداز جسم میں رافائیل کی تصویروں کا سا تناسب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے کسی مصور کی خیالی مجسمہ زندہ ہو گئی ہے۔

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ کیا الفاظ اس کیفیت کو بیان کر سکتے ہیں جو نظر کو سرشار کر دیتی ہے۔ اس کے گھنے، گتھے ہوئے، بھورے بالوں کے

اس کی شفاف پیشانی۔ اس کی چمکدار آنکھیں جن میں دیدے کی سیاہی چمک چمک کر اپنے پورے ماحول کو روشن کر رہی ہے اور جو ایک خاص سرشار کر دینے والا اثر رکھتی ہیں۔ اس کے لبوں میں شباب کی ساری تازگی گم گئی ہے۔ ان کی ساخت کرنوں کی حدت اور شباب کے کیف و خمار کی سُرخی سی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہر لمحے ان لبوں میں ایک تازہ کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کبھی کبھی جب وہ سر جھکا کے سوچنے لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی لمبی لمبی پلکوں اور سُرخ لبوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ باتیں کرتے ہیں اس کے دانتوں کی قطار ان لبوں میں سے نظر آ جاتی ہے۔ یہ بہت اچھا ہے کہ وہ پان نہیں کھاتی۔ پان کی مصنوعی سُرخی اس کے لبوں کی اس کیف پرور سُرخی کا لطف کم کر دے گی۔

اس کے رخسار مونا لسا کے سے ہیں۔ اس کا کتابی چہرہ مونا لسا کا چہرہ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ابھی اس کے چہرے سے بچپن کے آثار پوری طرح رخصت نہیں ہوئے اگر لیونارڈو ڈاونچی نے مونا لسا کے ابتدائے شباب کی تصویر کھینچی ہوتی تو بالکل ایسی ہی ہوتی۔ بلقیس کا جسم مونا لسا کا جسم ہے۔ مونا لسا کا جسم اگر پورا نظر آتا تو ایسا ہی ہوتا۔ اس میں وہی گداز، شاداب کیفیت ہے، وہی جمال ہے، وہی وقار ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ بلقیس سے اگر زیادہ التفات سے باتیں کروں تو وہ بے رُخی برتنے لگتی ہے اور میری ہنسی اڑاتی ہے۔ مجبوراً مجھے اس کو ستانا پڑتا ہے۔ اس کو ستانے کے لئے ایک آدھ بات ایسی کہہ دیتا ہوں کہ وہ یا تو بگڑ کر جواب دیتی ہے یا بحث کرنے لگتی ہے۔ خانم ایسی باتوں پر ہنستی ہیں۔

آج میرے کسی جملے پر اس نے کہا "ہم نے کیا کیا نعیم بھائی؟ آپ اس مرتبہ ہم سے

بہت ناراض ہیں"

میں نے کہا " ناراض نہیں ۔ صرف تم کو ستانے کے لئے" میں اس جملے کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکا ۔ کیا وجہ ہے کہ نسوانیت کی آگ کے سامنے میں بالکل پگھل جاتا ہوں ۔ مجھے اپنے اُوپر قابو نہیں رہتا ۔

اس نے کہا " اچھا یہ بات ہے" اور خاموش ہو گئی ۔

رات کو سوتے وقت تک اس کے چہرے، اس کے جسم کی مختلف کیفیتوں کا تصوّر اور اس تصوّر پر خیالی افسانے !

۲۵ / جون ۔ بھائی عادل کو اب بھی مجھ سے وہی للّہی بغض ہے ۔ ایک آدھ بار مجھے اس بات کا شک ہوا کہ بلقیس کے لئے چچیرے بھائی ہیں اور بلقیس کو اپنا حق سمجھتے ہیں میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر کہنے لگے "جمیل الحق صاحب کے صاحبزادے نفیس الحق سے بلقیس کی نسبت ہو رہی ہے" ان کے سامنے تو میں مسکراتا رہا لیکن پھر یہ خیال رفتہ رفتہ اس قدر حاوی ہونے لگا کہ اختلاج سا ہونے لگا ۔

میں سوچتا ہوں کہ یورپ جا کے حسین سے حسین لڑکیوں سے ملوں گا ۔ یہاں آنے کے بعد حسین سے حسین لڑکی سے شادی کرنے کا موقعہ مل سکے گا ۔ ممکن ہے کہ میری واپسی تک بلقیس اچھی خاصی موٹی ہو جائے ۔ ابھی تو شباب کی تازگی اور تناسب کی وجہ سے اس کا جسم بدنما نہیں معلوم ہوتا ۔ ممکن ہے کہ بھدا پن پیدا ہو جائے ۔ پھر وہ بہت زیادہ ہوشیار ہے ۔ ممکن ہے کہ شادی ہونے کے بعد اس کی ہوشیاری خطرناک ہو جائے ۔ آزادی کی مؤید ہے فیشن اور نمود کا اسے شوق ہے ۔ اگر شادی ہو بھی جائے تو

کیا اسے میں قابو میں رکھ سکوں گا؟

جب سے میں نے سُنا تھا کہ خانم چاہتی ہیں، اس کی شادی مجھ سے ہو، تب سے بلقیس کی "شانِ نارسائی" میں فرق آگیا تھا۔ کشش کا بہت بڑا باعث یہ تھا کہ میری مفلسانہ طالب علمی کے زمانے میں وہ میری پہنچ سے باہر تھی۔ آئی۔ سی۔ ایس کے انتخاب نے مجھے اتنا اوپر اٹھا دیا کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے ناامیدانہ اشتیاق کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ اور اس کی جگہ دلچسپی، لطف اور زیادہ مادی قسم کے جذبات نے لے لی تھی۔ مگر میاں عادل سے یہ سُن کر کہ اس کی نسبت کہیں اور ہو رہی ہے، کچھ تو مجھے یہ خوشی ہوئی کہ اچھا ہے، مجھے موقع ملے گا کہ خوب سے خوب تر کو تلاش کروں۔ مجھے آزادی حاصل رہے گی۔ شادی کی زنجیروں میں جکڑ کے انسان تنگ خیال بن جاتا ہے۔ میرے جذبات مجھے اس کی طرف کھینچتے تھے۔ اس وجہ سے کہ جتنی لڑکیوں سے ملنے کے مواقع مجھے ملے، وہ ان سب سے زیادہ حسین تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

مگر اب پھر وہی تھوڑا سا "شانِ نارسائی" کا ناامیدانہ لطف پیدا ہوگیا۔ یہ محسوس کر کے کہ وہ میرے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ ایک اضطراب سا معلوم ہوتا تھا کہ کاش وہ میری ہی ہو کے رہے۔

۲۶ جون۔ شام کو خانم کے یہاں گیا۔ بلقیس ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے، ہلکا سا زرد، تقریباً ملگجا سا دوپٹہ، سفید کرتا پہنے بیٹھی تھی۔ اس کا گداز جسم "گداز" سے کچھ زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے گھنے بھورے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کی

کمر تک پہنچتے تھے۔ میں نے پھر محسوس کیا کہ اس سے قبل میں بارہا محسوس کر چکا ہوں مگر بار بار بھول جاتا ہوں کہ اس کا حسن لباس کا کس قدر پابند ہے۔ کھلے دوپٹے اور تنگ پاجامے میں وہ حسین معلوم ہوتی ہے اور ساری میں کہیں زیادہ حسین۔ خدا کا شکر ہے اِدھر ڈیڑھ دو سال سے اس نے فراک پہننا چھوڑ دیا۔

خانم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ اتنے میں عاقل خاں بھی آ گئے۔ خانم کو غالباً علم نہیں تھا کہ مجھے بلقیس کی نسبت کی گفت و شنید کا علم ہو چکا ہے۔ وہ بے تکلفی میں جمیل الحق صاحب کی بیوی کا ذکر کرنے لگیں (انہیں کا چھوٹا لڑکا جو انجینیئر ہے میرا رقیب رو سیاہ ہے) میں نے کہا "جمیل الحق صاحب کی ایک بھانجی پاگل ہو گئی ہے اور وہ اس طرح سے کہ اس کی بہن کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ بہن سے زیادہ اس کو صدمہ ہوا اور وہ پاگل ہو گئی۔"

خانم نے بظاہر خالی الذہن طور پر پوچھا "تم نے جمیل الحق صاحب کے چھوٹے لڑکے کو دیکھا ہے؟"

میں نے کہا "جی ہاں، دیکھا تو ہے، انجینیئر ہے۔"

انہوں نے کہا "بلقیس اس کی شکل و صورت کی بہت برائی کرتی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں صورت تو اچھی خاصی ہے۔"

خانم نے کہا "بلقیس تو کہہ رہی تھی، ان کا رنگ بہت سانولا ہے۔"

بلقیس بول اٹھی "وہ سانولا نہیں بلکہ اچھا خاصا کالا ہے۔ نعیم بھائی آپ نے ان کو اچھی طرح نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "میں نے انہیں بارہا دیکھا ہے۔"

خانم نے کہا "جمیل الحق صاحب کی بیوی مجھ سے بولیں۔ آپ اجازت دیں تو میں بلقیس بی بی کو اپنے لڑکوں سے ملاؤں۔ میں نے کہا۔ لے جائیے، یہ ایسا کیا پردہ کرتی ہیں اور سچ بھی بے پردہ ہی کیا کرتی ہیں۔ خیر تو وہ لے گئیں۔ ان کو ملایا۔ یہ تو کہہ رہی ہیں کہ صورت اچھی نہیں، ذرا کالی ہے۔"

بلقیس نے کہا "اچھے خاصے کالے ہیں۔"

میں نے اسے چھیڑنے کو کہا "نہیں جی وہ سب بھائی بہت خوبصورت ہیں۔"

بلقیس نے سانس کھینچ کر کہا "اوہ نعیم بھائی۔ خوبصورت! خوبصورت کہاں! اچھے خاصے بدصورت ہیں۔" پھر اس نے عاقل چچا سے پوچھا "کیوں بابا جانی آپ نے دیکھا ان کو؟"

عاقل چچا کچھ سوچ رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اس گفتگو سے بے خبر ہیں۔ چونک اٹھے اور پوچھا "کیا؟"

خانم نے پوچھا "تم نے جمیل الحق صاحب کے چھوٹے صاحبزادے کو دیکھا ہے؟ کیسی صورت ہے؟"

عاقل چچا نے کہا "ذرا سیاہ رنگ ہے۔"

اب تو میں بھی قائل ہو چلا۔ میں نے اپنے رقیب کی دو تین بار جھلک سی دیکھی تھی اور یہ اندازہ تھا کہ کافی وجیہ آدمی ہیں۔ ان کے خلاف یہ رائیں سن کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

بلقیس کو غالباً اس نسبت کے سلسلے کا علم بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ اس آزادی سے گفتگو نہ کرتی۔ لیکن مجھے سب سے بڑھ کر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ اس شخص کو پسند نہیں کرتی۔

باتوں باتوں میں میری زبان سے ایک ایسا فقرہ نکل گیا جس سے ایک عجیب پُراسرار کچھ طنز اور کچھ اطمینان کی مسکراہٹ خانم کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ فوراً مجھے احساس ہوا کہ جمیل الحق صاحب کے صاحبزادے کا ذکر محض مجھ کو سُنانے کے لیئے تھا باوجود انتہائی کوشش کے میں سمجھ نہ سکا کہ ان کی یہ مسکراہٹ مخالفانہ ہے یا موافقانہ۔ یا وہ مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ بلقیس کی نسبت کے لئے وہ محض میری محتاج نہیں۔

۲۷ر جون۔ شام کو نواب صاحب کے یہاں گیا۔ امجد اور ڈاکٹر صاحب "تفریح" کے ارادے سے نکلے ہی تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ ان لوگوں نے شکایت کی کہ آپ اس دن سے جو غائب ہوئے تو اب تک نہیں ملے۔

امجد نے کہا "میں تو آپ کا مکان دریافت کرنے کی فکر میں تھا کہ کہیں آپ اس دن کسی بات سے خفا تو نہیں ہو گئے"

میں نے پاسپورٹ اور سفر کی دوسری تیاریوں کا ذکر کیا اور کہا فرصت ہی نہیں تھی۔

امجد نے کہا "نعیم صاحب بتایئے کوئی اچھا فلم کہیں دکھایا جا رہا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "ہاں نعیم صاحب کوئی اچھا فلم ہو تو بتایئے"

میں نے کہا "کڈ ملینس تو آپ دیکھ ہی چکے ہوں گے؟"

"ن.... نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا"

"پروفیسر ایس۔ کے سید صاحب کہہ رہے تھے آپ سے سینما میں ملاقات ہوئی تھی"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "نہیں وہ...... وہ...... وہ دوسرا فلم تھا۔ کڈ ملینس نہیں بل.... بلکہ ال.... ال۔ البیلی.. ."

امجد نے جلدی سے کہا "ہاں اس روز تو آپ الیلی بھٹیارن دیکھنے گئے تھے"
ڈاکٹر صاحب نے کہا "نہیں ال..... ال... الیلی رقاصہ"
امجد نے کہا "نہیں الیلی بھٹیارن کہئے"

پروفیسر ایس۔ کے۔ سید صاحب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے اور تانگے کے موڑ میں کہیں جا رہے تھے۔ ہم سب کو آتے دیکھ کر موٹر روک کے اترے اور کہا "چلئے میں آپ ہی کو ڈھونڈھنے نکلا تھا....."

رات کے کھانے پر پروفیسر صاحب نے روک لیا۔ خانم اور بلقیس سے آج ملاقات نہیں ہوئی۔ آج اس وجہ سے ان کے یہاں نہیں گیا کہ مجھے معلوم تھا کہ ان کے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔

۲۹ رجون۔ نواب صاحب کے یہاں مضافات لکھنؤ کے ایک نوجوان شاعر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تعارف کے بعد میں نے مزاج پوچھا۔ کہا "سب خیریت ہے"۔ خیریت کہتے ہوئے وہ ذرا ہکلائے۔ ان کا بالائی لب اٹھ کر ذرا ٹیڑھا ہوا، کانپا اور ان کے دانت جن سے لکھنویت جھلکتی تھی، نمایاں ہوئے۔ یہ ان کی گفتگو کا خاص طریق معلوم ہوتا ہے۔ باتیں کرتے وقت، خصوصاً نواب صاحب سے باتیں کرتے وقت ان کا جسم لکھنوی انداز سے کچھ جھکتا اور کچھ لچکتا ہے۔
شام کو خانم کے یہاں گیا۔ طبیعت کچھ صاف نہیں تھی۔ بلقیس بھی کچھ زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوئی۔ تصنع کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ میں زبردستی باتیں کر رہا تھا۔

۲۳ر جولائی ۔ یقینی کا قصہ ایک جمود کے عالم میں ہے ۔ میرے ذہن میں نہیں بلکہ خانم وغیرہ سے طرزِ عمل پر جمود کی سی کیفیت ہے ۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی تو پانی برس رہا تھا ۔ آج بھی پانی برس رہا ہے ۔ متواتر تین دن سے گھٹا چھائی ہے ۔ ارادہ کرتا ہوں کہ اُٹھوں، تفریح کو جاؤں ۔ پھر کاہلی سے یہ عذر کر کے ٹال دیتا ہوں کہ آج تو سڑک پر بہت زیادہ کیچڑ ہوگی ۔ کچھ دیر تک اسی طرح لیٹا رہا ۔ پھر آنکھیں بند کیں تو عشرت منزل ہر بار جب عشرت منزل کو دیکھتا ہوں نیا نقشہ، کبھی یہ جھونپڑا بن جاتا ہے، کبھی محل ۔ کبھی کسی دور دراز جزیرے میں ہرا بھرا میدان، کبھی دریا کا کنارہ، کبھی ہمالیہ کا ایک محفوظ غار ۔ عشرت منزل کی انہیں شکلوں میں سے کسی شکل میں بلقیس چھپ رہی تھی اور مجھے اشارے سے بلا رہی تھی ۔

اُٹھ بیٹھا اور اس دالان میں جس سے رخصت کے دن قریب آتے جا رہے تھے ازار سے منگا کر چائے پی ۔ چائے مزے کی تھی ۔ بھائی عادل تشریف لائے ۔ پوچھا "کچھ کام کر رہے تھے ؟"

میں نے کہا "جوتا صاف کر رہا ہوں ۔"

انہوں نے کہا "یہ تو امریکہ کے ہونے والے پریسیڈنٹوں کا کام ہے ۔"

میں نے کہا "وہ جی !" تو اُٹھ کر ٹہلنے لگے ۔ پھر بیٹھے تو فرمایا "ایک لڑکا جو بچپن میں جوتوں پر پالش کیا کرتا تھا آگے چل کر امریکہ کا پریسیڈنٹ ہوگیا ۔"

میں نے کہا "میں پالش نہیں کر رہا تھا جوتا صاف کر رہا تھا اور اب کر چکا ۔"

انہوں نے پوچھا "تم انگلستان کب جاؤ گے ؟"

میں نے کہا "غالباً ۲ ستمبر کو ۔"

مجھے میاں عادل سے نفرت سی ہونے لگی۔
انھوں نے کہا "کسی طرح بلقیس کی شادی ہو جاتی تو چچا جان کی گردن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔"
میں نے کہا "گھبراتے کیوں ہو۔ تمہارے ہی ساتھ ہو گی۔"
کہنے لگے "کیا مہمل بکتے ہو۔ نفیس الحق صاحب کے ساتھ نسبت طے ہو چکی ہے۔"
میں نے کہا "یہ پھر فکر کی کیا بات ہے۔ عاقل چچا کی گردن کا بوجھ ہلکا ہوا ہی چاہتا ہے۔"
عادل صاحب نے سگریٹ ختم کی اور دفعتاً خدا حافظ کہا۔ میں نے زبان سے خدا حافظ و ناصر کہتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ "اچھا تو محض یہ خبر سنانے آئے تھے۔"

۲۵ جولائی۔ خانم کے یہاں گیا۔ بلقیس کے سر میں درد ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھی۔ میں نے پوچھا "کیوں کیسی ہو؟" وہ آہستہ سے کچھ جواب دے کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے کمرے میں گیا۔ وہ کوچ پر لیٹی تھی۔ سنبھل کے اُٹھ بیٹھی۔ میں نے کہا "تمہارے سر میں درد ہوا کیسے؟" بولی "کچھ نہیں نعیم بھائی اسکول سے آنے کے بعد سے سر میں ذرا درد ہے۔"
میں دوسرے کمرے میں خانم سے باتیں کرتا رہا۔ خانم آج ظرافت اور ہسٹیریا کے ملے جلے عالم میں تھیں۔ بلقیس کچھ دیر بعد آئی تھی۔ اس کی قمیص کا ایک بٹن کھل گیا تھا۔ گردن کے نیچے سینے کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ معلوم ہوتا تھا بجلی کا سا۔ خون تیزی سے بھی کر میرے سر میں پہنچ گیا۔
رات کو سونے سے پہلے طرح طرح کے رومان انگیز خواب، عاشقانہ تخیلات

عشرت منزل، ایک مسافر بنگلہ بن گئی۔ موٹر کا سفر، حادثہ، مسافر بنگلے میں رات، بند کمرہ، دروازے بند، باہر حفاظت کے لئے آدمی۔ حادثہ کا پہلے یہ تصور کہ میں زخمی ہوں اور بلقیس تیمار داری کر رہی ہے۔ پھر یہ کہ بلقیس حادثے میں زخمی ہو گئی اور میں تیمار داری کر رہا ہوں۔ عین وہم واپسیں بلقیس کا اقرارِ محبت!

اس کے بعد میں رویا اور اپنے بگڑٹ تخیل کی حماقتوں پر ہنس کے سو گیا۔

۲۶ جولائی۔ صبح کو بہت دیر میں آنکھ کھلی۔ مطلع صاف تھا۔ ہلکے ہلکے سفید بادلوں سے آفتاب کی روشنی چھن رہی تھی۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ طاق پر ناشتہ رکھا تھا چڑیاں آج بھی پراٹھے کا ذرا سا ٹکڑا نوچ کر کھا گئی تھیں۔

فرائڈ کے مجموعۂ مضامین کو پڑھنا چاہا۔ ایک آدھ مضمون ختم کرنے پر طبیعت اکتا گئی۔ اس میں گیارہ بج گئے۔ بس سے جانا تھا۔ بس سٹینڈ گیا۔ صفدر نگر سے خانم نے بُلا بھیجا تھا۔

بلقیس کے لئے تصویروں کے فریم لینا گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی اور اس وقت بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میاں عادل لاکھ نفیس الحق کا ذکر کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ بلقیس کی شادی مجھ سے ہو گی، یہی ذکر میں خاندان بھر میں سنتا ہوں۔ کیا خانم دیوانی ہیں جو اچھا خاصا لڑکا، پھر ماشاءاللہ آئی۔سی۔ایس، اس کو چھوڑ کے اِدھر اُدھر اپنی لڑکی کی نسبتیں تلاش کرتی پھریں۔

خانم نہا رہی تھیں۔ نہا کے نکلیں تو میں انہیں سلام کرنے گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں سمجھا کچھ لکھ رہی ہیں۔ مگر کنگھی کر رہی تھیں۔ پوچھا کون ہے

پھر میری طرف پلٹیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر تکدر کے کچھ آثار تھے۔ پوچھا "کیوں جی تم یہ سب سے کہتے پھرتے ہو کہ ہم تمہاری خوشامد کرتے ہیں کہ بلقیس سے شادی کر لو۔ ہماری جوتی کو غرض ہے کہ کسی کی خوشامد کریں؟ پہلے ہی میرا دل خاندان کے جھگڑوں سے پک کے چھوڑا ہو گیا ہے۔ اپنوں سے غیر اچھے۔ میں تو غیروں ہی میں اپنی لڑکی کی شادی کروں گی۔"

میں نے خانم کو سمجھانا چاہا تو خانم نے کہا "یہ عادل معلوم نہیں کہاں کہاں سے سن کے آئے ہیں بلقیس نے بھی سنا ہے اور وہ کل سے بہت ناراض ہے۔"

میں نے خانم کو سمجھایا کہ میں نے اس قسم کی کوئی بات کبھی زبان سے نہیں نکالی۔ یہ سب آپ سے لڑانے کی ترکیبیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ عاقل چچا آ گئے اور جمیل الحق صاحب کے لڑکوں کی بستیوں کا تذکرہ چھیڑ دیا جس میں سے ایک بھی انگلستان جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ خیال ہے اس وقت کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ان کی والدہ بلقیس سے نسبت کرانے میں کوشاں ہیں۔

ممکن ہے یہ واقعہ ہو یا ممکن ہے یہ ڈرامہ اس لئے اسٹیج کیا جا رہا ہو کہ میرے کان میں یہ بات مرعوب کرنے کے لئے ڈال دی جائے کہ ہمیں تمہاری پروا نہیں۔ بہرحال میں نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا اور بالکل انجان بنا رہا۔

اس نے اس فائل سمجھا لو میں سول سروس کے انتخاب کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ اگر اسے منظور ہے سب ٹھیک ہے۔ اور اگر اس کو منظور نہیں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب حسابات سے قطع نظر میں ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بلقیس میں میری دلچسپی پیدا کی ہوئی ہے اتفاقی نہیں۔ ممکن ہے کہ انگلستان سے میری

واپسی تک بلقیس بھدی اور موٹی ہو جائے۔ اب تک جتنی لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں، ان میں وہ غنیمت اور بہت غنیمت ہے۔ مگر مجھے اس سے "عشق" نہیں، ورنہ اس کی اور کہیں نسبت ہو جانے کی خبر اور اندیشہ کا مجھ پر کم اثر نہ ہوتا۔ بہرحال اس سے پہلے بھی مفلسی اور طالب علمی کے زمانے میں جب میرا سن صرف سترہ سال تھا، مجھے "عشق" ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ دن کے بارہ بجے سے رات کے دو بجے تک اسی عشق کے غم میں رو تا رہا اور اس کے بعد وہ عشق اچھا ہو گیا۔ انگلستان جا کے بلقیس کو بھول جانا کونسی بڑی بات ہے۔

میں اللہ میاں سے دعا کر کے بلقیس کو نہیں مانگنا چاہتا تھا۔ بقول ڈاکٹر صاحب کے "چھ ..... چھ . . چھوٹی چیز" اس سے تو ابھی بہت کچھ مانگنا ہے۔ پھر بھی بلقیس ملنا ہو گی مل جائے گی، نہ ملنا ہو گی نہ ملے گی۔"

رات کو سونے سے پہلے "بانگ درا" میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا:-

ہم نے اسے اقبال یورپ میں لسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی!

اس سے زیادہ مناسب فال اور کیا نکلتی۔ دل کو اطمینان سا ہو گیا۔ مگر طبیعت پست رہی۔ روزنامچہ لکھتا رہا۔ رات بہت ہو گئی ہے۔

۲۷ر جولائی۔ صبح کو محمد خاں صاحب کے یہاں گیا۔ جمیل الحق صاحب کے یہاں کی نسبتوں کا جو ڈرامہ خانم نے اسٹیج کرایا تھا، اس کی حقیقت معلوم کرنی تھی۔
محمد خاں صاحب کی دریافت کامیاب رہی۔ انہیں کی زبانی واقعہ یوں معلوم ہوا۔

"میں گیا تو جمیل الحق ٹہل رہے تھے۔ میں نے بُلا کر پوچھا تو کہنے لگے۔ عجیب احمق ہو۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں اور وہ کون احمق ہیں جو بار بار تم کو بھیجتے ہیں۔ نفیس الحق کا ابھی شادی کرنے کا بالکل ارادہ نہیں ہے۔ میں نے نام بھی بتا دیا کہ کوئی وکیل ہیں، عاقل خان صاحب ان کی لڑکی سے تو نسبت وغیرہ کا قصد نہیں؟ انہوں نے بگڑ کر کہا نہیں جی، ہمارے پاس بہتر سے بہتر پیام موجود ہیں اس لڑکی میں ایسی کون سی خاص بات ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہاں ہمارے گھر میں ایک بار اس کا ذکر کیا گیا تھا مگر انیس الحق کی والدہ نے انکار کر دیا۔"

میں نے پوچھا یہ چھوٹے بھائی نہیں تو ممکن ہے کہ بڑے بھائی کے ساتھ ہو۔ انہیں کی فکر زیادہ ہوگی۔"

محمد خاں صاحب نے کہا یہ نہیں جی وہ حضرت اور کہیں کرنا چاہتے ہیں۔"

پھر میں اور محمد خاں صاحب دونوں تفریح کو ساتھ نکلے اور بالآخر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے میں بس اسٹینڈ پہنچا اور مطمئن گھر واپس آ! ۔ خانم کا تخیل خوب پرواز کرتا ہے۔ پھر بھی میں ان کو مایوس نہیں کروں گا۔ مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ کئی حیثیتوں سے بلقیس بہت اچھی لڑکی ہے۔

سہ پہر کو میں خانم کے یہاں گیا۔ بہت بحال نہیں۔ خانم نے پھر نفیس الحق اور ان کی والدہ سے اپنی ملاقات اور بلقیس کی نسبت اور اچھے سے اچھے پیاموں کا قصہ سنانا شروع کیا۔ اور میں مسکراتا رہا۔

تیسرا باب

ایشیا، افریقہ، یورپ

۹ ستمبر بمبئی۔ صبح کو ناشتہ کر کے ہم سب اپنا اپنا اسباب باندھنے لگے۔ اس کے بعد ٹرام پر طامس کک اینڈ کو کے دفتر پہنچے۔ جہاز کے جانے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے لیکن نرسر کے نام خط جو مجھے مل جانا چاہیے تھا وہ ابھی تک نہیں ملا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اطالوی جہاز سے جانے پر اصرار کیا۔ پی اینڈ او کے کسی جہاز سے جاتا تو کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ میرے تینوں ساتھی مطمئن تھے اور میری الجھن پر ہنس رہے تھے۔ اتنے میں ایک اور صاحب آئے اور انصاری ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ پھر مجھے بلایا "نعیم!" میں ان صاحب سے ملنے کے لئے بڑھا۔ "نعیم آپ سے ملو۔ آپ بھی حیدرآباد سے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کا نام یوسفی ہے۔"

اس عجیب نام پر مجھے تعجب سا ہوا۔

میں نے پوچھا: "آپ بھی تشریف لے جا رہے ہیں؟"
یوسفی صاحب نے کہا: "نہیں میری بیوی جا رہی ہیں۔ انہیں جہاز تک پہنچانے کے لئے آیا ہوں۔"

اس کے بعد ہم سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلرک نے برہم کے نام چٹھی میرے حوالے کی اور مجھے اطمینان ہوا اور اس اطمینان کے عالم میں جب میں یوسفی صاحب سے باتیں کر رہا تھا تو مجھے تین دن پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا جب سکندر آباد اسٹیشن پر میں نے اپنے سب دوستوں کو اور خصوصاً خانم اور بلقیس کو خدا حافظ کہا تھا۔ خدا حافظ کہتے وقت میں نے بلقیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ خانم نے میری طرف چونک کے دیکھا تھا۔ اس وقت خانم کی نگاہیں میری آنکھوں کے سامنے پھر گئیں اور وہ ہاتھ جو بلقیس کے کندھے سے مس ہوا تھا، دل کی طرح دھڑکنے لگا۔

"کرنتے وی تو رسکا" جہاز کا نام کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا اور جہاز بھی بہت خوبصورت تھا۔ انصاری، نصیر اور ایوب کے ساتھ میں نے بھی جہاز کے مختلف حصوں کو دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد سب نے مناسب سمجھا کہ عرشے پر ٹھہر جائیں۔ پانچ دس منٹ میں جہاز چھوٹنے ہی والا تھا۔ سب مسافر عرشے پر تھے۔ دو تین سکھ اور ان کی بیویاں جن میں ایک خوبصورت تھی، اور باقی بدصورت، کئی انگریز یا انگریز نما لوگ، ایک ہندوستانی نوجوان اور اس کے ساتھ ایک ساڑھی پوش میم اور مختصر ہندوستانی، دو تین چینی یا شاید جاپانی اور انگریزوں کے مقابلے میں کسی قدر سانولے اطالوی۔ پایر پہ کھڑے لوگ رومال ہلا رہے تھے۔

اتنے میں انصاری نے دفعتاً کہا: "ابھی آئیے راجہ صاحب۔ ہم سمجھ رہے تھے آپ نے اس جہاز سے جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔" نصیر اور ایوب بھی ان راجہ صاحب سے ملے لیکن انصاری نے

مجھ سے تعارف کرایا " راجہ ہمت نواز ونت بہادر اور مسٹر نعیم حسن ۔"
راجہ صاحب جو پچیس چھبیس سال کے وجیہہ آدمی تھے اور انتہائی خوش پوش "بڑی خوشی ہوئی" کہہ کر پھر انصاری سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ "عجیب بددماغ آدمی ہے۔"

ساحل پر جو مجمع تھا، میں نے اس پر نظر ڈالی۔ اس مجمع میں میرا کوئی نہیں تھا۔ ایک رومال بھی میرے لئے نہیں ہل رہا تھا اور مجھے دنیا میں اپنی تنہائی اور بے بسی کا سخت اور تکلیف دہ احساس ہوا۔ کاش میرے قریبی عزیزوں میں سے کوئی زندہ ہوتا۔ اتنے میں نصیر نے میرا ہاتھ پکڑ کے نیچے ایک رومال کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میرے ایک حیدرآبادی دوست تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔ انہوں نے اس ہندوستانی نوجوان کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ ساری پوش بیم تھی۔ اس ایک رومال ہلانے والے ہاتھ سے مجھے تسلی ہوئی۔ کوئی عزیز نہ سہی مگر ایک دوست جو اتفاق سے بمبئی میں تھا مجھے خدا حافظ کہنے آ پہنچا تھا۔

جہاز نے سیٹی دی اور حرکت کی۔ راجہ ہمت نواز ونت بہادر یکلخت مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا "ہندوستان کو خدا حافظ کہئے۔" اور پھر سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ میں انہیں جوابات دیتا جا رہا تھا اور ہندوستان سے جدا ہونے پر کچھ رنج محسوس کر رہا تھا اور کچھ خوشی۔ رنج بہت کم تھا۔ کیا اس ملک سے مجھے ذرا بھی محبت تھی؟ خوشی اس وجہ سے تھی کہ میں ہندوستان کو ایک قید خانہ سمجھنے لگا تھا جس سے رہائی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ میں ان سمندروں کے پار جا سکوں گا جو اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ یا ان پہاڑوں کے دوسری طرف جاؤں گا جو قید خانے کی دیواروں کی طرح ہیں۔ ایک طرف اونچی اونچی دیواریں اور دوسری طرف خندق۔

راجہ صاحب برابر جرح میں مصروف تھے اور بالآخر مجھے بے توجہ دیکھ کے پھر
ماری یا نصیر سے باتیں کرنے لگے۔

بمبئی اور ہندوستان کا ساحل دور ہوتا جا رہا تھا۔

کھانے کی گھنٹی بجی۔

نصیر، ایوب اور انصاری نیپولی " سکنڈ وائیجو ٹونک " میں سفر کر رہے تھے میں
سرے درجے میں تھا۔ کھانے کے کمرے میں پہنچ کے میں نے محسوس کیا کہ دوسرے
جے میں بہت تھوڑے مسافر ہیں۔ ایک میز پر ایک بدشکل ہندوستانی عورت بیٹھی تھی۔
نے اپنے دل میں کہا " مسز یوسفی۔" ایک اور میز پر تین بوڑھی سی میمیں بیٹھی زور زور
باتیں کر رہی تھیں۔ ایک میز پر تین ہندوستانی نوجوان بیٹھے میری طرف غور سے دیکھ
ہے تھے۔ مجھے پریشانی سی ہوئی کہ آیا میرے لباس میں کوئی خاص خرابی ہے یا میرے
ل ہونے کے انداز میں۔ اور میزوں پر تین تین چار چار کی ٹکڑیوں میں اور ہندوستانی تھے۔
میز پر دو یورپین تھے۔ ایک ضعیف العمر تقریباً ساٹھ سال کا، ایک تنومند نوجوان،
اور میز پر ساری پوش میم اور وہی ہندوستانی نوجوان بیٹھے تھے جن کی طرف میرے
ست نے ساحل سے اشارہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا تو ساری پوش لڑکی بڑی خوبصورت
م ہوئی ـــــ پھر میں بھی ایک خالی میز کی طرف بڑھا۔ اطالوی ویٹر نے دونوں ہاتھ
کر کچھ شائستگی اور کچھ طنز سے ایک میز کی طرف اشارہ کیا " سنورے۔" میں بیٹھ
تو میرے آگے " مینو" بڑھایا۔ اتنے میں ایک اور صاحب آ کے اسی میز پر بیٹھ گئے
، پر میں بیٹھا تھا۔ ان کا سر بالکل صاف منڈا ہوا تھا اور باوجود سیاہ فام رنگت کے
مجھے ایک حد تک مشہور سینما ایکٹر ایرچ فان اشٹروہائیم سے مشابہ معلوم ہوئے۔

چھری کانٹوں کے استعمال میں بار بار غلطیاں کیں اور سان ایریچ فان اشتروہایم نے میری طرف بار بار کڑوی نظروں سے دیکھا۔ کھانا بالکل کھایا نہیں گیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ میں نے پورا یوروپین کھانا کھایا تھا۔ پھر اطالوی کھانا روغن زیتون میں پکتا ہے۔ جہاز کی حرکت ناگوار معلوم ہونے لگی تھی۔ ہلکی ہلکی سی مالش معلوم ہوئی اور میں اٹھ کے کھانے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ جاتے ہی جہاز نے ذرا سی حرکت کی اور میں لڑکھڑا کے سنبھلا اور لوگوں نے میری طرف دیکھا اور میں نے کچھ الجھن اور کچھ خفت سی محسوس کی۔

میں عرشہ جہاز پر ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ سمندر کی نیلی موجیں اٹھ رہی تھیں اور جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔ موجوں کا کف مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ سر میں دردسا معلوم ہونے لگا اور طبیعت مالش کرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے دماغ کو جہاز کی حرکت کا عادی بنانا چاہا۔ پھر سونا چاہا اور آنکھ لگ گئی اٹھا۔ لڑکھڑاتا ہوا اپنے کیبن کو گیا میں اپنے کیبن میں اکیلا تھا۔

منہ دھویا۔ چائے کی گھنٹی ہوئی۔ چائے پی۔ سر کا درد کم ہوا مگر طبیعت برابر مالش کر رہی تھی۔

چائے پی کے میں کھانے کے کمرے سے باہر نکلا تو ایک صاحب سلک کی شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنے جہاز کے عرشے پر کھڑے کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا "یہ جہاز حیدرآبادیوں سے بھرا ہوا ہے۔" میں ان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "کیا آپ حیدرآباد سے تشریف لائے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا "نہیں کئی بار حیدرآباد جانے کا اتفاق ضرور ہوا ہے کیوں
کیا آپ کا وطن حیدرآباد ہے؟"
میں نے کہا "جی ہاں!"
کہا "میں کلکتہ کا رہنے والا ہوں"
میں نے کہا "معاف کیجئے گا آپ کے لباس سے مجھے دھوکا ہوا"
انہوں نے ہنس کر کہا "کیوں؟ شیروانی تو ہندوستان بھر میں پہنی جاتی ہے"
پھر پوچھا "آپ کا اسم شریف؟"
میں نے کہا "نعیم حسن!"
کہنے لگے: "میرا نام عبدالرحیم فاروقی ہے"
میں نے ہاتھ ملایا اور کہا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کا ذکر میں نے اکثر سنا ہے" مجھے وہ تمام ظریفانہ جملے یاد آگئے جو ان حضرت کے سیاسی کارناموں پر اُردو اخباروں کے اڈیٹروں نے اپنے مزاحیہ کالموں میں لکھے تھے۔
پھر کچھ دیر تک میں ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ساری پوش مہم اسی ہندوستانی نوجوان کے ساتھ چائے پینے اندر گئی۔ اس وقت وہ ساری نہیں بلکہ سایہ پہنے تھی اور پہلے کے مقابلے میں کم حسین معلوم ہوتی تھی۔ فاروقی صاحب نے کہا "یہ کلکتہ کے ایک مشہور سیٹھ ہیرا چند کے صاحبزادے ہیں۔ اپنے والد کی ٹائپسٹ سے شادی کی ہے"
میں نے سوال کیا "یہ لڑکی اینگلو انڈین ہے؟" میں نے سُنا تھا کہ کلکتے میں اینگلو انڈین آبادی بہت زیادہ ہے۔

فاروقی صاحب نے کہا۔ "نہیں، ہے تو انگریز مگر بہت معمولی طبقے کی۔"
میں نے مالش کی شکایت کی۔ فاروقی صاحب نے کہا "ٹہلو۔" میں ٹہلنے لگا۔ پھر کٹہرے کے پاس کھڑا ہو کر موجوں کو دیکھنے لگا۔ موجیں شاعری کر رہی تھیں۔ ریشم کے پہاڑ بلند ہو رہے تھے اور پھٹ رہے تھے اور گر رہے تھے۔ ریشم کی چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔

آفتاب غروب ہونے لگا۔ کئی لوگ آرام کرسیوں پر پڑے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ حال پتلا ہے۔ بالآخر میں نے بھی شکست قبول کی۔ اپنے کیبن میں پہنچا۔ نے کی، بیٹ گیا۔ بلقیس نظروں کے سامنے تھی۔ کیا پریشانی اور تکلیف کا وقت تھا۔ بلقیس کا تصور سامنے تھا، مگر میری طبیعت مالش کر رہی تھی اور جہاز دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا اور موجوں کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ موجیں ریشم کی چٹانیں تھیں اور بلقیس کے بھورے بال ریشم کے تھے۔ سیٹھ ہیراچند کے لڑکے کی معمولی طبقے کی انگریز بیوی کے بال بھی ریشم کے تھے۔ مگر وہ کٹے ہوئے تھے اور بلقیس کے بالوں سے چھوٹے تھے۔
میں سو گیا تو خواب میں بلقیس کو دیکھا۔ کچھ عجیب طرح کا خواب تھا کچھ یاد نہیں آتا۔ پھر آرام سے نیند آئی۔ جہاز دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔

(۲)

۱۰ ستمبر، سمندر۔ نو بجے سو کے اٹھا۔ بمشکل تمام حجامت بنائی۔ کپڑے پہنے۔ چائے نہیں پی گئی۔ عرشے پر پہنچا۔ عبدالرحیم صاحب فاروقی براج رہے تھے۔ راجہ بہت نواز دنت سا در کیمرہ ہاتھ میں لیے، دھوپ کی عینک لگائے درجۂ اوّل سے تشریف لائے۔ ان کی اور فاروقی صاحب کی طبیعت ذرا بھی خراب نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی ڈھارس ہوئی۔

راجہ صاحب بہت بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ یہ ساتویں مرتبہ ہے کہ وہ یورپ تشریف لے جا رہے ہیں۔ سیٹھ ہیرا چند کے صاحبزادے اور ان کی میم سے خوب واقف ہیں۔ کہنے لگے "مسز چاند کو میں شادی سے پہلے بھی اچھی طرح جانتا تھا بہت اچھی طرح" یہ کہہ کے ہنسے۔

راجہ صاحب گئے تو میں نے عبدالرحیم صاحب فاروقی سے کہا "کسی ترکیب سے مجھے نصیر یا ایوب کے پاس سے اچار لا دیجئے۔ یہ دونوں اکنامک کلاس میں ہیں۔"

فاروقی صاحب نے کہا "اچھا آپ اپنے کیبن میں جائیے میں لاتا ہوں۔"

کیبن پہنچتے پہنچتے زور سے قے ہوئی۔ ایک اطالوی کیبن لڑکے نے ہمدردی میں کچھ الفاظ کہے۔ باوجود متلی اور درد سر کے اطالوی زبان بہت اچھی معلوم ہوئی۔ کاش میں سمجھ سکتا۔ فاروقی صاحب اچار لائے کیبن لڑکے بسکٹ لے کر آیا۔ اچار کے ساتھ بسکٹ کھائے۔ فاروقی صاحب نے کہا "کپلنگ جھوٹ بکتا ہے کہ مشرق اور مغرب کبھی نہیں مل سکتے۔ دیکھئے آپ اچار کے ساتھ بسکٹ کھا رہے ہیں۔" میں ہنسا خود بھی ہنسے۔ چند لمحے کے بعد پھر ہنسے اور کہا "سیٹھ ہیرا چند کے لڑکے نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی ہے۔ یہ بھی مشرق اور مغرب کا سنگم ہے۔ کہیں آپ اس حماقت میں نہ مبتلا ہو جائیے گا۔ خدا حافظ۔"

میں ہنسا اور جواب میں "خدا حافظ" کہا۔ قبض کی صورت لفظوں کے سامنے آگئی۔ سو گیا اور سہ پہر کے پانچ بجے تک سوتا رہا۔ فاروقی صاحب کی آہٹ معلوم ہوئی۔ کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دوسری اطالوی خادمہ جو مسافر خواتین کی خدمت کرتی تھی، فاروقی صاحب سے میرے متعلق کچھ انگریزی میں پوچھ رہی تھی کہ اب کیسے ہیں ہم

اٹھا تو مشفقانہ انداز سے مسکرائی۔ اس کے جانے کے بعد فاروقی صاحب نے کہا۔
"عرشے پر آ بیٹھیے" اور چلے گئے۔ میں نے کپڑے پہنے طبیعت برابر مالش کر رہی تھی اور سخت کمزوری معلوم ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سر پر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں۔ کچھ بسکٹ کھائے۔ قے ہو گئی۔ ہمت نہیں ہاری اور پھر بسکٹ کھائے۔ عرشے پر پہنچا۔ فاروقی صاحب وہاں نہ تھے طبیعت متلائی۔ بھاگا۔ کیبن پہنچ کے پھر قے کی۔ کپڑے بدل کے بچھونے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جہاز پابندی سے دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔ کبھی دائیں طرف بہت زیادہ جھک جاتا کبھی بائیں طرف اور کبھی جھٹکا سا لگتا تو معلوم ہوتا کہ ساری آنتیں اُلٹ پلٹ گئی ہیں۔ آنکھیں بند کرنے سے کسی قدر تسکین ہوتی۔

دماغ نے ذرا سی کوشش کی تو بلقیس سامنے کھڑی تھی۔ مذاق اُڑا رہی تھی کہ سمندر کے اس ذرا سے تلاطم میں آپ کا یہ حال ہو گیا۔ فاروقی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ اس کو طوفان نہیں کہتے ہیں محض تلاطم کہتے ہیں۔ جب تک سمندر میں اتنا تلاطم نہ ہو جہاز کے سفر میں لطف نہیں۔ واہ نعیم صاحب واہ۔ پھر مذاق اُڑاتے اُڑاتے مجھے بیمار اور پریشان دیکھ کے وہ خود بھی پریشان ہو گئی اور تسلی دینے لگی۔ جہاز نے دائیں جانب حرکت کی تو اس نے میرے بائیں کان میں جھک کے محبت کا اقرار کیا۔ پھر وہ مسکرائی پھر میرا مذاق اڑایا، پھر ہنسی، پھر میری ہنسی اڑائی، پھر فرشتوں کی طرح میری پریشانی سے پریشان ہوئی۔ مجھے تسلی دی اور نیند کے ساتھ گھل مل کر غائب ہو گئی۔

(۳)

۱۱ ستمبر، بحیرۂ عرب۔ صبح: جلد ہی آنکھ کھلی۔ میں نے اپنے [illegible] سے

پوچھا۔ "سبنورسے لیمن یا بسکٹ؟" میں نے کہا۔ "بسکٹ"۔ جہاز ہلتا رہا۔ موجوں کی آواز آتی رہی۔ میری طبیعت ذرا ہلکی تھی۔ وہ بسکٹ لے کر آیا۔ کل کا اچار رکھا تھا میں نے مشرق کے ساتھ مغرب کو کھایا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک سنترہ کھایا اور لیموں کا عرق پیا۔ پھر سر چکرایا اور متلی سی ہونے لگی۔ فاروقی صاحب آئے اور کہا "اٹھئے، خاک پاک عرب قریب آ رہی ہے۔ آپ یہاں گرمی اور بند موٹر میں پڑے رہتے ہیں۔ اس میں طبیعت اور خراب ہوتی ہے۔ ذرا باہر عرشے پر تشریف لائیے۔" میں نے ان سے وعدہ کیا اور وہ تشریف لے گئے۔ میں نے حجامت بنائی۔ آج شدت کا قبض تھا۔ عرشے پر پہنچ کے فاروقی صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ انصاری اور ایوب مجھے دیکھنے آئے۔ میری طرح وہ تینوں بھی فریش تھے۔ انصاری نے کہا۔ نصیر تو ابھی تک بستر پر دراز ہے اور سمندر کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہے۔ سمندر بہت متلاطم تھا مگر اوروں کی وجہ سے مجھے فرحت معلوم ہوئی کیونکہ پوچھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب قے ہوئی اور اب ہوئی۔ روکا اور پوری طرح کامیابی ہوئی۔ کھانے کے وقت مربا اور بسکٹ کھا کے لیموں کا عرق پیا۔ بے چینی سی معلوم ہوئی۔ اٹھ بیٹھا۔ عرشے پر گیا۔ سمندر کا تلاطم کم ہو چکا تھا۔ انصاری اور ایوب پھر آئے اور کہا۔ نصیر ابھی تک نہیں اٹھا انصاری نے کہا۔ "چلو پہلے درجے میں۔ دیکھیں تو سہی راجہ صاحب کس حال میں ہیں۔" اوپر پہنچے تو راجہ صاحب مسز چند کے ساتھ ڈیک ٹینس کھیل رہے تھے ٹینس ختم کر کے ہم لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ اور پھر گپ چلایا۔ عورتوں کے متعلق مذاق کیا۔ میری "معصومیت" کا مذاق اڑایا۔ جہاز پہ سنیما کا فلم دکھایا جانے والا تھا۔ عجیب مہمل فلم تھا۔ دو ریل دیکھ کے میں باہر نکل آیا اور فاروقی صاحب

سے باتیں کرنے لگا۔ رات کے کھانے کے وقت تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اپنے کیبن میں چلا آیا۔ اسٹیوارڈ نیم برٹش بلکہ ربع برٹش انڈے لے کر آیا بسکٹ اور سنترے بھی منگوائے۔ اسٹیوارڈ نے کہا "آپ اچھے ہو گئے ہیں۔ اب کھانے کے کمرے میں کیوں کھانا نہیں کھاتے۔" میں نے گجراتی ایریج نان اشتر و سیم کا خیال کر کے دل ہی دل میں اسٹیوارڈ کو برا بھلا کہا پھر عرشے پر پہنچا تو عبدالرحیم صاحب فاروقی اسی طرح براجے رہے تھے میں نے کہا "آپ نے کھانا نہیں کھایا" جواب دیا "بھوک نہیں تھی۔" پھر عبداللہ المامون سہروردی، سر راس مسعود اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے متعلق انھوں نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار فرمایا۔ پھر مشہور و معروف لیڈروں سے اپنی دوستی کے قصے سنائے۔ سب سے آخر میں مصطفےٰ کمال پاشا اور رومن رسم الخط کو گالیاں دیں اور رخصت ہوئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: خدا ہندوستانی مسلمانوں کو نیم خام اور ناکام لیڈروں سے محفوظ رکھے۔" فاروقی صاحب کے متعلق میری رائے بدلنے لگی ہے۔

رات کو اچھی طرح نیند نہیں آئی۔

(۴)

۱۲ ستمبر۔ خلیج عدن۔ صبح تڑکے ہی اٹھا۔ نہایا۔ جہاز کے غسل خانے کے اسرار و رموز اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئے۔ اسٹیوارڈ سے ناشتہ منگوایا تو وہ بڑبڑایا۔ مگر چائے، بسکٹ اور لیموں کا عرق لا دیا۔ کل رات کو ہم جزیرۂ سقوطری کے پاس سے ہو کے گذرے تھے۔ جہاں سے مون سون ہوائیں چلنا شروع ہوتی ہیں۔ اس لئے سمندر میں سمندر متلاطم تھا مگر اب تو ہم خلیج عدن کے دہانے پر ہیں اور سمندر کافی ساکت ہے۔

کیبن سے اوپر چڑھا تو درجہ دوم کے ڈرائنگ روم کے سامنے میں نے ان
بڑی بڑی تصویروں کو غور سے دیکھا جو مصری اثر کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ آج سمندر ساکت
تھا تو جہاز بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ جہاز کا نام ہی کتنا پیارا تھا "کونتے دی ٹوسکا"
نصیر اور انصاری مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے فاروقی صاحب سے ان دونوں کا تعارف
کرایا۔ انصاری اپنے ساتھ کچھ ہندوستانی رکارڈ لایا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں
گراموفون پر ان رکارڈوں کو لگانا شروع کیا۔ قریب ہی مسٹر اور مسز چند بھی بیٹھے
ہوتے تھے۔ مسز چند آج بھی ساری پہنے تھی۔ معلوم ہوا مسٹر چند قانون کی ڈگری
حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ درمیان میں تعطیلات بسر کرنے آئے تھے۔ انصاری کو لوگوں
سے ملاقات پیدا کرنے اور دوستی بڑھانے کا ڈھب خوب آتا ہے۔ بے تکلفی
سے ان میاں بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ مسز چند اس سے ہنس ہنس کے باتیں
کر رہی تھی اور میں دور بیٹھا ہوا رشک کر رہا تھا۔

کھانے کے وقت میں نے صرف پھل کھائے اور وہ بھی اس ہندوستانیت اور
اس سادگی سے کہ گجراتی ایرچ خان اشترو ہام کی نگاہیں غصہ اور افسوس سے لبریز
تھیں۔ گجراتی ایرچ خان اشترو ہام نے سنترے کو بیچوں بیچ چھری سے کاٹا۔ میں سمجھا کوئی
سفلی عمل کرنا چاہتا ہے مگر اس نے چائے کے چمچے سے رس نکال نکال کے
پینا شروع کیا۔ کھانے کے بعد وہ مجنونانہ تیزی سے عرشے پر ٹہلنے لگا۔ اس کے
بعد جب وہ فاروقی صاحب سے باتیں کر رہا تھا تو میں بھی بحث کرنے قریب گیا۔ میرا اندازہ
صحیح نکلا وہ گجراتی شاہ ہے کینیا یا افریقہ کے کسی اور حصے میں کاروبار کرتا ہے
ایک بیوقوف بنگالی طالب علم سے ملاقات ہوئی جو آس کو آش کہتا ہے اور گلاگو

جا رہا ہے۔ سُنا ہے بڑا ذہین آدمی ہے۔ ایک سندھی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد فاروقی صاحب نے گالی دے کر کہا۔ "میں اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس کے بعد اس کے باپ کو بھی ایک گالی دی۔ سندھی کا نام مرچنڈانی ہے۔ یہ نام مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ فاروقی صاحب یورپ اور یورپ کی عورتوں کے قصے سناتے رہے۔

رات کا کھانا میں نے پھر کھانے کے کمرے میں کھایا۔ مرغ خراب تھا۔ پھل کھائے۔ پھر عرشے پر فاروقی صاحب کو "بالِ جبریل" کے کچھ حصے سناتا رہا۔ سندھ کے مسٹر مرچنڈانی انگریزی میں بہت خوب، بہت خوب کہتے رہے۔ میں نے اردو میں بات کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ اُردو نہیں بول سکتے۔ ان کے جانے کے بعد فاروقی صاحب نے پھر انہیں گالیاں دیں اور کہا "سال بھر انگلستان میں رہنے سے گدھا آدمی نہیں بن سکتا۔ مسخرا اُردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور اقبال کی نظموں کی داد دے رہا تھا۔" اس کے بعد فاروقی صاحب نے اقبال کے متعلق عجیب و غریب الفاظ استعمال کئے اور کہا "بس ایسے ہی لوگ ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تعریف کرتے ہیں جو اُسے سمجھ نہیں سکتے۔ مثلاً یہ مسخرا ـــــ مرچنڈانی۔"

اب تو فاروقی صاحب سے باتیں کرتے ہوئے مجھے کوفت سی معلوم ہوتی ہے شاید ہی دنیا میں کوئی آدمی گالیاں دینے میں ان سے زیادہ ماہر ہو۔

عدن قریب آ رہا ہے۔ مگر نیند عدن سے بھی زیادہ قریب ہے

(۵)

۱۳ ستمبر۔ رات کو جہاز عدن پہنچ کر ٹھہرا۔ نصاری اور نسیم وغیرہ نے وعدہ
کیا تھا کہ مجھے جگا دیں گے مگر جگایا نہیں۔ جب جہاز ٹھہرا ہوا تھا تو چار بج کر بیس
کے لیے میری آنکھ کھلی۔ عرب شور مچا رہے تھے اور عرب لڑکے وحشیوں کی طرح کام کر رہے
تھے میں نے اپنے دل میں کہا یہی وہ لوگ ہیں جن

لرزتے تھے جن سے تمدن کے دربار ان میں کبھی
شعلۂ جانسوز نہاں جن کی تلواروں میں تھے

(جہاز سے گیا)
صبح کو جا کر سب دیکھا۔ وہاں خشک حالت پہاڑ سے کوئی ساکن مالی نہ تھا۔ اس
لیے ناشتہ کے بعد ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں گیا۔ مسٹر اور مسز حمید نے میری
تعریف کی۔ اور وہاں سے عرب کے ساحل کی طرف تو دور تک نظر آتا تھا ریت کی چٹانیں
دھنسی بیٹھی تھیں۔ بڑی لڑکی بھی ساتھ آئی اور انصاری ملنے آئے اور عرشے پر
آرام کرسیوں پر لیٹ گئے۔ یہ بیدی کے سب کے سب۔ اتنے میں مسز حمید نے
کالا لباس پہنے اپنے شوہر کے ساتھ آئی۔ اس کی مشہد کے بالائی حصے اور شانے پر بال
میں ... گرمی زیادہ ہے۔ چہرہ ... ہم کو گرمی کی لہر کے ساتھ جشن
کی ایک لہر۔
اس لہر کو دیکھ کر ہم چاروں اُٹھے اور نصیر کے کیبن میں بیٹھے۔ اگلی کلاس
میں سفر شاید وہ ہوتا ہوگا۔ ... بندی ہموں کا شربت بنایا گیا اور سب
نے پیا۔

میں واپس آیا تو دیکھا کہ دوسرے درجے کے عرشے پر راجہ ہمت نواز ونت بہادر مسز چند سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کے بلایا اور مسز چند سے ملایا۔ ہاتھ ملاتے وقت میں نے اپنے سر میں خون کی گرمی اور تیزی محسوس کی۔ مسز چند وہی نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھیں جس سے اُن کی پیٹھ اور سڈول کاندھے اپنی پوری شانِ عریانی کے ساتھ باہر تھے۔ اس سے پہلے میں نے ایسے منظر صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ اپنے دل میں کہا کہ یورپ میں ایسے ہزاروں منظر دیکھنے میں آئیں گے۔

یہ دیکھ کر کہ میں راجہ صاحب اور مسز چند کی باتوں میں مخل ہو رہا ہوں وہاں سے ہٹ گیا اور فاروقی صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ جنگِ بلقان کے قصے سنانے لگے اس زمانے میں وہ بقولِ خود ترکی گئے تھے۔

جہاز باب المندب سے ہو کر گذرا۔

لنچ کے وقت کری اور چاول کھانے جو پسند آئے۔ اطالوی کھانے نا ولوں ہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ چیزوں کے نام کیسے اچھے اچھے ہیں "اسپاگیٹی" "ماکرونی" شاید جستی پہ چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہوں یا عادت ہو جانے پر۔ فی الحال تو ہندستانی یا ہندوستانی نما کھانا ہی غنیمت ہے۔ مر چنڈانی نے بھی ہماری ہی میز پر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ سیدھا سادہ مگر بہت شریف آدمی ہے۔ باتیں کرتے کرتے میں کنکھیوں سے ایک آدھ بار مسز چند کی نیم برہنہ پیٹھ کو دیکھ لیتا تھا۔

مر چنڈانی کے جانے کے بعد کچھ دیر تک وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر گرمی اس قدر تھی کہ کچھ نہ پڑھ سکا۔ عرب کا ساحل نظر آتا

اوجھل ہو چکا تھا۔ باوجود اس کوشش کے کہ اس ساحل سے محبت کا احساس دل میں
پیدا ہو، اس ساحل سے کوئی اُنس نہیں پیدا ہو سکا۔ بچپن کی تربیت رائیگاں گئی۔ جس طرح
ہندوستان سے کوئی اُنس نہیں محسوس ہوا تھا، اسی طرح اس ساحل سے بھی نہیں۔ جہاز
بحیرۂ قلزم میں چلا جا رہا تھا۔ عرب اور افریقہ دونوں کنارے نظر سے اوجھل تھے اور
صرف گرمی ہی گرمی تھی۔ خدا جانے اس سمندر کو قلزم کیوں کہتے ہیں۔

کھانے کے وقت بھی مرچنڈانی ہمارے ہی میز پر بیٹھا۔ اس کے بعد ایک فلم دکھایا گیا
جس کا نام تھا "اندھیرے میں جاسوس"۔ عجب واہیات فلم تھا مگر مرچنڈانی کو بہت
پسند آیا اور اس نے بہت تعریف کی —— عجب خر نام شخص ہے۔ فاروقی صاحب
نے پھر انگلستان اور فرانس کی جنسی زندگی پر تبصرہ شروع کیا اور کچھ اپنے تجربے بھی سنائے
رات کے کھانے کے وقت گجراتی ایرح فال اشتر، راجہ صاحب بہت مہربان تھے
میں مچھلی کھانے کا کانٹا غلط غلط استعمال کر رہا تھا انھوں نے اصلاح کی

کھانے کے بعد کچھ پڑھتا رہا۔ انصاری نے آ کے کہا راجہ صاحب بلا رہے ہیں
پہلے درجے میں ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو مے کا شغل فرما رہے تھے ضیافت کرنا
چاہی تو میں نے معافی چاہی۔ میرے لیے لیمونیڈ منگوایا اور کہا یہ تو عورتوں کے پینے
کی چیز ہے۔ ان کے درجے میں ایک امریکن لڑکی سفر کر رہی تھی۔ راجہ صاحب اس
کے حسنِ جسمانی سے آج سہ پہر سرخرو ہوئے تھے۔ اس لیے بہت خوش تھے اور
مجھ سے اور انصاری سے اپنے کارنامے کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔

(۶)

۱۴ ستمبر بحیرۂ قلزم۔ صبح کو حجامت بنائی۔ نہایا۔ پھر اوپر آ کے ناشتہ کیا چار خطوط

لکھے۔ اس کے بعد انصاری وغیرہ سے ملنے اکنامک کلاس جانے کا ارادہ کیا۔ راستے میں انجن کے بائلر کے پاس سے گذرا۔ انجن میں کام کرنے والے (ذکر (جو سب کے سب اطالوی تھے) میلے متعفن کپڑے پہنے گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں کھا رہے تھے۔ اس خیال سے خوشی ہوئی کہ غربت اگر ہندوستان میں بہت ہے تو یورپ میں بھی بہرے سے مفقود نہیں۔ مسولینی حبش فتح کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کے ہم وطن مزدور وحشیوں کی طرح نیم برشت بوٹیاں کھا رہے ہیں۔ انصاری اور نصیر وغیرہ کے ساتھ درجہ اوّل میں گیا۔ راجہ صاحب ورزش کر رہے تھے وہاں سے انصاری وغیرہ کے ساتھ اپنے درجے میں واپس آیا۔ انصاری نے کہا "راجہ صاحب اور مسز چند کے تعلقات کچھ زیادہ گہرے ہیں۔" میں نے دریافت کیا "پہلے سے یا ابھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہے؟" نصیر نے کہا "آپ تو احمق واقع ہوئے ہیں ورنہ جہاز پر جتنے نوجوان ہندوستانی ہیں سب نے کچھ لطف اُٹھایا ہے۔" مجھے یقین نہیں آیا اور اس خیال سے کہ اور پوچھوں گا تو یہ لوگ اور زیادہ بے وقوف بنائیں گے' خاموش ہو گیا۔ یہ لوگ لنچ کے وقت رخصت ہوئے۔ لنچ کے بعد مرچنڈانی نے مسٹر چند سے میرا تعارف کرایا اور جب مسز چند سے تعارف کرایا تو وہ کہنے لگی میرا تعارف ہو چکا ہے۔ یہ کہہ کے وہ مسکرائی۔ میں انصاری اور نصیر کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اب جو مجھے خیال آیا تو یاد آیا کہ بارہا میں نے راجہ صاحب اور مسز چند کو یکجا دیکھا تھا۔ میں نے اپنے دل میں غور کیا کہ اس کا شوہر کتنا احمق ہوگا کہ اسے اپنی بیوی کی حرکتوں کا پتہ نہیں چلا۔ معمولی قسم کی یورپین لڑکی سے شادی کرنے کا یہی نتیجہ ہے یا شاید وہ خود شادی کرنا نہ چاہتا ہوگا۔ پھنس گیا ہوگا۔

اس کے بعد عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ادھر میں مرچنڈانی سے باتیں کر رہا تھا۔ ادھر

راجہ صاحب آئے اور مسٹر اور مسز چند سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد آہستہ سے میرے پاس آ کے کان میں کہا "تم ذرا مسٹر چند کو باتوں میں لگاؤ۔ تاش کھیلنا آتا ہو تو رمی شروع کرو۔ میاں سیکھو یہ باتیں!" پھر میرے پاس سے سرک کر مسٹر اور مسز چند کی میز پر پہنچے ان سے تاش کھیلنے کو کہا۔ وہ تیار ہو گئے تو ان دونوں کو بھی ہماری میز پر لے آئے میں دیکھ رہا تھا کہ راجہ صاحب برابر مسز چند سے اشارہ بازی کر رہے تھے۔ ایک آدھ بازی راجہ صاحب نے خود بھی کھیلی۔ اس کے بعد کہا میں نہانے جاتا ہوں۔ مسز چند نے بھی نہانے کی خواہش ظاہر کی۔ راجہ صاحب نے کہا فرسٹ کلاس کا سوئمنگ پول بہت زیادہ آرام دہ ہے اور وہاں بہت اچھا مجمع ہوگا۔ مسٹر چند نے کہا میں بھی چلتا ہوں۔ راجہ صاحب نے میری طرف دیکھ کے آنکھ کا اشارہ کیا میں نے کہا مسٹر چند گیم ختم ہو جانے دیجئے۔ پھر ہم سب ساتھ ہی چلیں گے۔ مسٹر چند نے کہا اچھا اور کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ بازی شروع ہونے کے بعد ہی مسز چند نے اپنے شوہر سے کہا "ڈارلنگ! مجھے گرمی بہت معلوم ہو رہی ہے تم جلدی گیم ختم کر کے آؤ۔ میں نہانے جاتی ہوں۔" دو تین منٹ بعد راجہ صاحب بھی ٹل گئے

اب تو مجھے کامل یقین ہو گیا۔ کبھی یہ جی چاہتا تھا کہ مسٹر چند سے کہہ دوں "ابے جا دیکھ تیری بیوی کیا کر رہی ہے" لیکن راجہ صاحب کے خیال سے خاموش رہا اور مسٹر چند خود ہی رمی میں اس قدر محو تھا کہ چائے کا وقت آ گیا اور چائے کے وقت مسز چند بھی آ موجود ہوئی۔

چائے پی کے میں نے فاروقی صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا "راجہ اس کے شوہر کو بھی خوب پیسے دیتا ہے۔ چند کا باپ کنجوس ہے اور صرف ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ دیتا ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کے ٹھاٹ باٹ کے لیے یہ کافی نہیں۔ یہ بھی ایک پیشہ ہے۔ میرے خیال میں تو چند جانتا ہے اور چشم پوشی کرتا ہے۔" یہ کہہ کے انھوں نے

مسٹر اور مسز جنید کی شان میں کچھ مغلظات ارشاد فرمائے۔

بحیرۂ قلزم میں غروبِ آفتاب کا سماں بہت اچھا معلوم ہوا اور رات اس سے بھی زیادہ اچھی۔ اس وقت ہمارا جہاز حرمین شریفین کے بہت قریب سے گذر رہا ہوگا۔ چاند بادلوں میں چھپ چھپ کے نکل رہا تھا جو بحیرۂ قلزم پر شاذونادر ہی نظر آتے ہیں۔ نور کی ہلکی ہلکی خاموش موجوں پہ چاندنی کی چمک عجب لطف دے رہی تھی۔ میں چاند کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس قدر مدہوش سا تھا کہ فاروقی صاحب میرے پاس آکے کھڑے ہوگئے تو مجھے معلوم بھی نہ ہوسکا۔ انھوں نے پوچھا: "بتائیے مولانا اشعار کی آمد آمد ہے یا وحی کی۔ یہ سارا خطّہ، یرموک سے یمن تک اور یہ وہاں سے لے کر خلیج عدن تک انبیاء اور شعراء دونوں کو راس آتا رہا ہے۔"

مَیں نے کہا: "صاحب! شاعر تو میں ہوں ہی نہیں، اور رہ گئی وحی تو وہ قوم کے لیڈروں پر اترتی ہوگی۔"

اس کے بعد چاندنی کی تعریف ہوتی۔ فاروقی صاحب نے کہا: "ابھی کیا کل کوہِ سینا پر چاندنی کی بہار دیکھیے گا۔"

دفعتاً میرے دل میں بلقیس کا خیال آیا۔ حضرت سلیمان کی محبوبہ بلقیس ملکۂ سبا کی سواری فلسطین کو خشکی کے راستے سے گئی تھی یا سمندر کے راستے؟ میں جانتا تھا کہ اس قسم کا سوال احمقانہ ہوگا اور فاروقی صاحب میری ہنسی اڑائیں گے، پھر بھی میں پوچھ بیٹھا "بلقیس ملکۂ سبا کی سواری حضرت سلیمان کے پاس حجاز کے راستے گئی تھی یا بحیرۂ قلزم سے ہوکر۔"

فاروقی صاحب نے ہنس کے کہا: "ہوائی جہاز سے گئی تھی۔ آپ نے تختِ سلیمان کا ذکر

نہیں سُنا؟ وہ ہوائی جہاز کی غیر ارتقا یافتہ صورت تھی۔ اس میں روحانیت کے بادبان لگے تھے۔ کیوں آپ کو بلقیس کیوں یاد آئی؟"

کچھ لمحوں کے بعد میں نے جواب دیا: "جس لڑکی سے میری شادی ہونے والی ہے اس کا نام بلقیس ہے۔"

فاروقی صاحب نے کہا: "بہت اچھا ہے مبارک۔ ہمارے ہموطن نوجوان ناحق گورے رنگ اور ادرک جیسے بالوں پر مرتے ہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ مسز جنید کی طرح کا کوئی کچھوا اٹھا لاتے ہیں۔"

میں نے کہا: "میرے خیال میں ہندوستانی لڑکیاں کسی طرح بھی حسن میں یورپین عورتوں سے کم نہیں۔"

انہوں نے کہا: "بیشک ہماری لڑکیاں اگر اونچی ایڑی کے جوتے پہنیں اور اسی طرح تن کے چلیں تو کسی طرح یورپین عورتوں سے کم نہ معلوم ہوں۔"

اس کے بعد میں نے تفصیل سے بلقیس کا ذکر کیا اور خود مجھے انتہائی قلبی اطمینان اور فرحت معلوم ہونے لگی۔ فاروقی صاحب کے جانے کے بعد بھی میں چاند کو دیکھ رہا تھا اور بلقیس کے تصور میں محو تھا۔ سمندر کی لہروں کا جھاگ پانی میں چمک رہا تھا اور جھاگ پر بلقیس کی تصویریں بن رہی تھیں اور بگڑ رہی تھیں۔ اس کے بال بن رہے تھے اور سنور رہے تھے۔ موجوں کے شور سے اس کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

موسیقی سننے ڈرائنگ روم میں گیا مگر ہر چیز اور ہر شخص سے بے خبر تھا۔ چاندنی کی لہروں پر میرا دل ہندوستان تک پہنچ کے بلقیس کی صورت دیکھتا اور پھر واپس آجاتا۔ اطالوی بینڈ روزینی، درڈی، مونسارٹ وغیرہ کے انتخابات بجا رہا تھا اور یہ موسیقی

جو میرے لیے مقابلتاً نئی اور غیر مانوس تھی، باہر پھیلی ہوئی چاندنی کی مدد سے بلقیس کی تصویر بن کر میرے دل پر اثر کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پھر عرشے پر باہر نکل آیا اور کٹہرے کے پاس کھڑا ہو کر جل بن بلقیس کو سمجھنے لگا۔ دو سال گذر جائیں گے اور پھر وہ میری ہو کے رہے گی مجھے اس وقت اس کا یقین سا ہو گیا۔

اگر محبت یہی ہے تو شعرا یہ کیوں کہتے ہیں کہ یہ اندھی ہے۔ اس کو غم، درد اور مصیبت کیوں قرار دیتے ہیں۔ کیا دنیا میں اس سے زیادہ تسلی اور اطمینان بخشنے والی کوئی اور چیز بھی ہے؟

(۷)

۱۵ ستمبر۔ بحیرۂ قلزم۔ جزیرہ نمائے سینا۔ نہر سویز۔ صبح کو گرمی تھی میں جب منہ دھونے لگا تو مرزا نوشہ اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب دہلوی نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

میں نے کہا: "یہ شعر کافی ہے۔ اس غزل کے اور شعر مت سنائیے"۔ غالب نے کہا: "اچھا" اور پھر یہ دو شعر سنائے:

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

میں نے کہا: "سبحان اللہ۔ میں اپنی اور بلقیس کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جب اپنے دل ـــــ یا اپنے دماغ کی کیفیت اپنے آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں آپ کو زحمت دیتا ہوں۔ معاف کیجیے بڑی تکلیف ہوئی تحصیلِ حاصل سہی مگر آپ کی تعریف آپ ہی

کے ایک شعر سے ہو سکتی ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کیا کہنا۔ خدا آپ کو اور آپ کی وجہ سے اردو زبان کو ابدالآباد تک زندہ رکھے۔"
مرزا غالب مذاق میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر مطائباتِ غالب میں سے کوئی لطیفہ ایسا
یاد نہیں آیا۔ اس لیے محض یہ ارشاد فرمایا: میں کس قابل ہوں۔ آپ کی عنایت ہے کہ
بحیرۂ قلزم میں بھی مجھے یاد فرمایا۔

مرزا غالب کے تشریف لے جانے کے بعد اور یہ چلے کے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد
اور مسٹر چیپ سے کچھ باتیں کیں مگر دل نہیں لگا۔ بڈھا اس کا حیت فی پادری ہدایت محمود
قسم کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا اور اس قدر دلچسپی سے پڑھ رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ دوپہر
کے کھانے تک وقت اچھی طرح نہیں کٹا۔

لیکن تیسرے پہر دوسیا نظر آیا۔ جہاز کوہِ طور کے قریب سے گزر رہا تھا میں نے فاروقی صاحب
سے کہا: "حضرت موسیٰ کو دیدار نصیب ہوا بھی تو ان ریتلے خشک پہاڑوں میں۔" انھوں نے
جواب میں کہا: "بصیرت چاہیے۔" میں ان ریتلی اور بنجر پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جہاں بنی اسرائیل
کے پیغمبر پیدا ہوئے اور تلقین کی۔ جہاں سے شام سے مصر جانے والے اور عرب سے
مصر آنے والے قافلے گزرتے تھے۔ اور مجھے ان پہاڑیوں سے ایک طرح کی محبت ہو
ہوئی جس کی عقلی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ چھ بجے کے قریب ایک فلم دکھایا گیا جو اتنا
تھا کہ میں باہر آ کے پھر ان پہاڑیوں اور سمندر کے حباگ کو دیکھنے لگا۔ ڈوبتے ہوئے
سورج کی روشنی میں ان پہاڑیوں کا رنگ نکھرا اور غروب سے پہلے سمندر کے
پر قوسِ قزح کے سے رنگ جھلکنے لگے۔

پھر رات آئی اور سینا کی پہاڑیوں پر چاند چمکا۔ ایک مدراسی عیسائی کچھ فاصلہ پر کھڑا ایرچ فان اشترو ہائم سے باتیں کر رہا تھا۔ گجراتی ایرچ فان اشترو ہائم نے مجھ سے پوچھا "کیا دیکھتے ہو؟" میں نے کہا "بنی اسرائیل کے چاند کو" اس نے کہا "وہ کیا ہے؟" میں نے کہا —— "بنی اسرائیل کے چاند کو" اس نے کہا "تمہارے بال بہت غلیظ ہیں۔ ان کو زرشواؤ اور کنگھی پابندی سے کیا کرو اور کوئی تیل لگایا کرو۔" فاروقی صاحب نے کہا "جب ریت کا طوفان آتا تھا تو بنی اسرائیل سروں پر اسی طرح کی ایک جالی باندھ لیتے تھے۔ جیسے آج کل یورپ کی عورتیں باندھتی ہیں تاکہ بال جمے رہیں تم بھی ایسی ایک جالی خرید لو" میں نے دونوں کا شکریہ ادا کیا مگر دل میں ضرور خفیف ہوا۔

یہ رات بڑی خوبصورت تھی۔ ہم آہستہ آہستہ نہر سویز کی طرف بڑھ رہے تھے جہاز کا آرکسٹرا گولنوڈ کے انتخابات بجا رہا تھا اور سرشے پر اس کی دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی چاند کو بلقیس سے خاص مناسبت تھی بلقیس وہی وہ سبا تھی جس کی فال میں نے "بانگِ درا" میں دیکھی تھی مجھے ہمیشہ بلقیس، چاند اور مونالیسا میں ایک طرح کی مشابہت معلوم ہوتی ہے۔

جب جہاز بندر سویز میں ٹھہرا تو کچھ مصری سپاہی اوپر چڑھ آئے۔ ہم لوگوں سے سگرٹوں کی فرمائش کی سویز کی روشنیاں بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ طبی معائنہ ہونے والا ہے طبی معائنوں سے میں ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ اگر چاندنی نہ ہوتی تو ایک مجھ ہی کو کیا سب کو طبی معائنہ کا انتظار بڑا کھلتا۔ ڈاکٹر کسی طرح آ ہی نہیں چکتا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کو اسی مدراسی عیسائی لڑکے اور ایک سوئٹزرلینڈ کے انجینئر نے ایک دوسرے کو مقابلے کی دعوت دی کہ کون زیادہ شراب پیتا ہے۔ دونوں بار کے اسٹولوں پر بیٹھے اس بے تکلفی سے پی رہے تھے جیسے کوئی پانی پی رہا ہو بلکہ جیسے گھڑوں میں پانی ڈالا جا رہا ہو۔ کچھ دیر

تماشا دیکھ کے میں پھر باہر عرشے پر نکلا۔ مصری ڈاکٹر تمام جہازیوں کو نبض کے سلام کرتا ہوا رخصت ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہی طبی معائنہ تھا۔ اس ہنگامے کے بعد میں درجۂ اوّل کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کونے میں راجہ صاحب اور مسز چند لپٹے ہوئے کھڑے ہیں۔ میں واپس پلٹا تو راجہ نے آواز دی مگر میں معافی چاہتا ہوا واپس چلا آیا۔ رات کو ملقیس کی یاد رہرو مدینچ کی صورت میں آئی۔

۱۶ ستمبر۔ کل رات کا جادو کچھ ایسا تھا کہ جب سونے کو کیبن میں لیٹا تو نیند ہی نہیں آئی۔ مشکل سے رات بھر میں ایک آدھ گھنٹہ سویا ہوں گا۔ مگر وہی "شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا" صبح کو نہایا تو طبیعت چاق ہوئی۔ گجراتی فان اشترو ہائم کی نصیحت یاد کر کے بالوں میں بڑی محنت سے کنگھی کی۔

جہاز آہستہ آہستہ نہر سویز سے گذر رہا تھا۔ راستے میں خیابان جھیلیں اور ریل کی پٹریاں نظر آ رہی تھیں جن پر کبھی کبھی کوئی ریل چلتی یا سڑک پر کوئی موٹر گذرتی ہوئی نظر آتی جس میں کوئی مصری پاشا ترکی ٹوپی پہنے بیٹھا ہوتا۔

قنطرہ مجھے بہت پسند آیا۔ پورٹ سعید پہنچنے سے چند منٹ پہلے فاروقی صاحب نے کہا "پورٹ سعید نصف یورپ ہے" پورٹ سعید پہنچنے کے بعد میں نے اپنے دل میں کہا "اگر یہ نصف یورپ ہے تو خدا ہی یورپ پر رحم کرے" انصاری وغیرہ کے ساتھ اترا تو وہ تمام باتیں جو پورٹ سعید کے متعلق سنی تھیں دیکھیں۔ رنڈیوں کے دلال اور یہودیوں کی دوکانیں ایک صاف سڑک اور کئی گندی گلیاں اور بچے جو منہ سے سکے پکڑنے کے لیے سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ لب لب بیچنے والوں اور دلالوں کے ہجوم سے تنگ آگیا تو جہاز پر واپس پہنچا۔ ادھر

میں آیا، اُدھر دیکھا کہ مسٹر چند اُتر کر جا رہا ہے مگر مسز چنداس کے ساتھ نہ تھی معلوم نہیں شیطان نے کیا ورغلایا کہ میں دوبارہ اوّل میں سیدھا راجہ صاحب کے کیبن پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی اور مسز چند کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کے میں پلٹنے ہی والا تھا کہ راجہ صاحب نے دروازہ کھولا۔ ابھی سہ پہر کا وقت تھا مگر وہ اس قدر پیے ہوئے تھے کہ لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کے کہا: "اندر آؤ۔" میں گیا تو دیکھا کہ مسز چند بستر پر شال سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی اور وہ بھی تقریباً مدہوش تھی۔ راجہ نے اسی طرح سے لڑکھڑاتے ہوئے کہا: "یہ کیا شرارت ہے۔ تم سے اس وقت آنے کو کس نے کہا تھا۔ میں سمجھا چند ہے۔ میں نے دروازہ کھولا کہ آ اپنی جورو کو دیکھ۔ کل اسے پچاس پاؤنڈ دئے تھے۔ میں اکیلا بیوقوف ہوں؟ نہیں تو اس جہاز پر کون سا ہندوستانی لڑکا ہے جس نے اسے چھوا نہ ہو کسی نے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ میں بیوقوف ہوں بیوقوف!"

مسٹر چند اس وقت پورٹ سعید کی سیر فرما رہے تھے۔ انہوں نے بعد میں اپنا قصہ بیان کیا (لیکن میں نے یہ قصہ ان سے بیان نہیں کیا) کہ ایک مصری لڑکے نے ان کا پیچھا کیا اور برابر پوچھتا گیا: "کوئی فرانسیسی لڑکی چاہیئے؟" اور جب وہ چائے پینے ایک ہوٹل کے برآمدے میں پہنچے تو سامنے کی میز پر ایک فرانسیسی لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے کہا: "یہ لڑکی بھی مل سکتی ہے۔" اور مسٹر چند کو اس کا ہلکا سانولا رنگ اور اس کی مسکراہٹ بہت اچھی معلوم ہوئی۔ وہ مسکرائے اور وہ لڑکی بھی مسکرائی اور انہوں نے اس لڑکے کو کچھ انعام دے کر رخصت کیا اور وہ پھر مسکرائے اور وہ اُٹھ کے ان کی میز پر آئی اور

ن سے پوچھا" ویلے وو فیرا مور اوک ہوا ؟" اور یہ باوجود اس کے کہ معنی نہیں سمجھے تھے مطلب سمجھ گئے اور کہا "ہاں!" اور پھر انگریزی میں معاملہ طے ہوا اور ایک پونڈ معاوضہ قرار پایا (پچاس پونڈ راجہ صاحب نے دئے تھے) اور پھر مسٹر چند لڑکی کو ہوٹل میں لے گئے اور کمرے کا کرایہ پانچ شلنگ ادا گیا۔

(۸)

۱۷ ستمبر - صبح ساڑھے آٹھ بجے اٹھا اور کیبن ہی میں ناشتہ کیا۔ دن بھر پڑھتے گذرا۔ ایک کتاب پورٹ سعید پر لی تھی۔ وہ مسٹر چند نے مانگی۔ اسے دے دی۔ مسٹر چند سے ملاقات ہوئی۔ چائے کے وقت اس کا چینی نانی پادری سے برزونشا اور روشنی قبائل کے متعلق گفتگو ہوئی۔ پورٹ سعید پر ایک اطالوی عورت سوار ہوئی۔ اس کی طرف بار بار دیکھا گیا۔ اس نے بھی ایک آدھ بار دیکھا، پھر انجان ہوگئی۔
فاروقی صاحب کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ وہ "مدراسی شرابی" کو اردو کے معلی میں گالیاں دے رہے تھے۔
بلقیس ـــــ کیا مجھے بلقیس سے محبت ہے یا شاید میں اس سے محبت میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ یہ خواہش سلسلہ بر پائی کی خواہش ہے۔

۱۸ ستمبر - اب یورپ قریب آ رہا تھا اور سب بحث کر رہے تھے کہ جینیوا سے لندن کس راستے جائیں گے۔ لوزان سے ہوتے ہوئے یا برن کے رستے۔ یا تو ریل سے یا ریل یا ہوکر۔ اور بحث بہت دلچسپ تھی۔
سہ پہر کو چائے کے بعد جب جہاز پر سینما دکھایا جانے لگا تو مسٹر چند نے مجھے اشارے سے

پاس بیٹھنے کو کہا ۔ دماغ عشرت منزل جا پہنچا جہاں بلقیس ایک وزیر اعظم کی بیوی تھی۔ اور وزیر اعظم کی خواب گاہ میں ایک کھڑکی تھی اور جب وزیر اعظم ملک کے دوسرے حصوں کا دورہ کرتا تو وہ کھڑکی رات رات بھر کھلی رہتی ۔

رات کو آبنائے سینا کی روشنی دیکھی ۔ دونوں طرف نور کی ایک قطار تھی جس سے زمین اور پانی، آسمان اور ہوا سب جگمگا رہے تھے ۔ ایک طرف اٹلی اور دوسری طرف سسلی۔ وہی سسلی جہاں عربوں نے حکومت کی اور جہاں فریڈرک ثانی نے دربار لگایا اور جس کے متعلق اقبال نے ایک نظم لکھی ۔

یورپ آگیا ۔

جنگ اور خونریزی، نسلی تعصب اور سیاسی تدبر والا یورپ نہیں بلکہ جگمگاتی روشنی والا یورپ ۔ ریجیو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ستاروں کا ناچتا ہوا جمگھٹ جو زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتا جاتا تھا۔ ساحل پر روشنی کی ایک بڑی قطار سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی سڑک ہوگی ۔ مسینا کی روشنی ریجیو کے چراغوں سے زیادہ نظر فریب تھی ۔

ایک اطالوی جہازی افسر پاس ہی عرشے کے کٹہرے کا سہارا لگائے اس منظر کو دیکھ رہا تھا ۔ اس نے ریجیو اور مسینا کا ذکر کیا ۔ میں نے پراندلو کا ذکر کیا تو اس نے کہا میں اس سے واقف نہیں ۔ وہ ابی سینیا کی فتح پر تلا ہوا تھا ۔ بولا سینور سے چار سال گذشتہ جنگ میں لڑ چکا ہوں مگر اب پھر لڑنے کو تیار ہوں ۔ اور میرے جیسے بہت ہیں جو لڑنے کے لئے تیار ہیں ۔"

ایک مینار سے نیلی روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں ۔ ایک پہاڑی روشنی سے ثریا بنی ہوئی تھی ۔ مسینا کی روشن آبادی کے اوپر آسمان پر صرف ایک ستارہ جگمگا رہا تھا ۔ روشنی کی

ار ایک پہاڑی پر چڑھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔
راسی راستے سے یولی سیز اور عرب سیاحوں نے سفر کیا تھا۔

(۹)

پلز، ناپل، ناپولی۔ جوں جوں جہاز نزدیک پہنچ رہا تھا، اطالیہ کی مشہور و معروف
قریب آ رہی تھی۔ لیکن پہلے نظارے میں یہ بندرگاہ مجھے زیادہ بھلی نہیں معلوم ہوئی۔
نے یورپ کے ساحل پر قدم رکھا نیپلز کی سڑکیں غلیظ اور خوبصورت تھیں اور بے ہنگمیت
ب اچھا خاصہ تھا۔ فاروقی صاحب کے ساتھ پومپی آئی جاتے ہوئے نیپلز کے
ڑے حصے سے گذرے میں عمارتوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورتیں اتنی
معلوم نہیں ہوئیں جتنی توقع تھی۔ فاروقی صاحب نے پوچھا تھی "بتائیے سرزمین یورپ
م دیکھنے کے بعد کیا تاثرات آپ کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
پومپی آئی کے کھنڈر، سڑک پر پرانی رتھوں کے پہیوں کے نشانات، بازار، عدالت کا
چی کاری کا کام، پومپی آئی کے باغات اور مجسمے اور وینس کا محل، کھانے کا کمرہ، اور
کمرے اور دیواروں پر نقش کوک شاستر، سرخ رنگ اور سیاہ رنگ اور دیوار کے
نوش، پھر عام حمام اور اپالو کا مندر، رنڈی کے مکان کا کھنڈر، اس کی سجاوٹ او
دل پر منقش کوک شاستر اور ایمفی تھیٹر۔
پھر واپس نیپلز۔ اب عمارتیں جو راستوں پر چل پھر رہی تھیں، اچھی معلوم ہونے لگیں۔
یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ یہ شہر ہندوستان کے شہروں سے کتنا مختلف ہے۔ عورتوں
ے عمارتوں اور سڑکوں اور چہل پہل اور چلبلاپن میں جان سی ڈال دی ہے۔ اب کہیں کہیں
یسے چہرے بھی دکھائی دینے لگے جو بوتی چیلی کی تصویروں میں دیکھے تھے۔ مگر غربت

کی حکومت تھی۔

پومپی آئی اور نیپلز کی اس سیر میں دو عورتوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ ایک تو پومپی آئی کے کھنڈروں کے دروازے کے پاس سامنے سے گذری۔ اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ دوسری کو میں نے میوزیم کے پاس دیکھا۔ یہ سیاہ ماتمی لباس پہنے تھی اور اس کا سن کوئی پچیس ایک سال کا ہوگا اور اس نے ذرا تجسس سے میری طرف اور میرے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر سڑک پار کرنے کو چلی۔

سر میں شدید درد تھا، گرمی کی وجہ سے۔ لیموں کی سکنجبین پی۔ مگر سر کا درد کم نہ ہوا۔ کھانا کھایا پھر کچھ دیر آرام کیا۔ جہاز نیپلز سے چلا۔ درد سر باقی رہا۔ رات کے کھانے کے بعد دیر تک باہر ہوا میں بیٹھا رہا کہ سر کا درد کم ہو۔ عرشے پر کئی لوگ جمع ہوئے۔ باتیں کرتے رہے۔ رات کے بارہ بجے سب لوگ چلے گئے۔ میں بیٹھا رہا۔ عرشے پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور میں گرم کپڑے پہنے تھا۔ ایک بجے۔ ڈارلتی چند باہر نکلی معلوم نہیں کس کے کیبن سے نکل کے کس کے کیبن کو جانا چاہتی تھی۔ مجھے اکیلا دیکھ کے قریب آئی۔ کہا کہ "اجنبی" کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔

(۱۰)

۲۰ ستمبر۔ جہاز کے ملازم نے ساڑھے چار بجے ہی اُٹھا دیا تھا مگر چھ بجے تک اونگھتا رہا۔ صبح کو جہاز جنیوا کی بندرگاہ میں داخل ہو رہا تھا جہاں کا قبرستان بہت خوبصورت ہے۔ مجھے تو یہ شہر نیپلز سے زیادہ حسین معلوم ہوا۔ یہاں آ کے معلوم ہوتا تھا کہ یورپ میں ہوں۔ میں نے اور مرچنڈانی نے یہ طے کیا تھا کہ دونوں برن کے راستے انگلستان جائیں گے۔ شہر کے اطراف میں دُور دُور تک پہاڑیوں پر مکانات کا سلسلہ چلا گیا تھا۔

بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ان مکانات کے منظر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ ریلوے
یشن پہنچے۔ جس ڈبہ میں سوار ہوئے، اس میں میں، اور مسٹر اور مسز چند بھی تھے جو لوزان
ے راستے سے جا رہے تھے۔ کچھ دور تک ہمارا ان کا ساتھ تھا۔ میں خاموش تھا اور
ں چاہتا تھا کہ باتیں نہ کروں پھر بھی مسٹر اور مسز چند سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چلی تو
ولتی چند فرش پر بیٹھ گئی اور میاں کے دونوں پیروں کو گود میں رکھ کے بھینچا۔ مرچنڈانی
نے مجھ سے کچھ عرصے کے بعد چپکے سے کہا کہ ان دونوں میاں بیوی کے بیٹھنے کا یہ
ریقہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ جب ریل چلی تو کچھ عرصے تک تو میں جنیوا کے
اڑی مکانوں کا سماں دیکھتا رہا۔ چند نے نیپلز کی سیر کے بعد دلسوویس کا سفر کیا تھا اور
اں سے کچھ انگور چرائے تھے۔ وہ انگور سب نے کھائے۔

میلانو کا اسٹیشن بڑا خوبصورت تھا۔ سب نے مل کر ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ یہ شہر مقابلتاً
بید معلوم ہوتا ہے اور اس میں "یورپائیت" زیادہ ہے۔ پھر لیونارڈو ڈاونچی کے نقشِ دیوار
آخری طعام" کو دیکھا۔ میلانو کا مشہور و معروف کلیسا دیکھا۔ اس کی عظمت اور اس کے
ن کا اثر دل پر بہت دنوں رہے گا۔

واپس پہنچ کے کیک اور کچھ پھل خریدے۔

لوگے ماجیور رہے۔ کیا دنیا میں اور بھی کوئی جھیل اتنی خوبصورت ہوگی۔ مگر اب تک
نے کوئی اور جھیل دیکھی ہی نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ منظر دنیا کے حسین ترین مناظر
ے ہے۔ ریل جھیل کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی اور افسوس یہ ہے کہ استریزا
نہ اتر سکا۔ مگر ریل ہی سے اس کا منظر ایسا دلکش معلوم ہوتا تھا کہ بیان میں نہیں آ
تا۔ ایک قلی نے آ کے کہا: "سنیورے استریزا اے بیلا"۔ چند نے اس کے معنی

سمجھاتے ”یہ آسٹریا خوبصورت ہے“ جزیرے سجے ہوئے اور آباد تھے۔ ایک موٹر بوٹ پر کچھ لوگ سوار تھے۔ انہوں نے چلتی ریل کے مسافروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور مسافروں نے ان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ یہ جانور جسے انسان کہتے ہیں اپنی نوع کے اجنبیوں کو کتنا پسند کرتا ہے۔ اب ہم آلپ پہاڑوں میں سے گذر رہے تھے۔ ریل کبھی اُوپر چڑھتی کبھی نیچے اُترتی، کبھی سرنگوں میں سے ہو کر گذرتی، کبھی بلندی سے گہری وادیاں نظر آتیں جن میں صنوبروں کے ہجوم میں کوئی چشمہ بہتا نظر آتا۔ کبھی اُوپر برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتیں اور نشیبوں پر خوبصورت مکانات اور جھونپڑے بنے تھے۔ وہ اس منظر پر تراشے ہوئے جواہرات کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں پر آبادیاں بھی تھیں۔ کاش ریل ٹھہر جاتی اور ساری عمر یہیں گذرتی مگر کچھ دنوں کے بعد پہاڑ میں گھری ہوئی آبادی قید خانہ معلوم ہونے لگتی ہوگی جیسے ہندوستان۔

سمپلان کی سُرنگ۔ چند نے کہا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی سُرنگ ہے۔ اور جب اس سے نکل کے ہم برگ پہنچے تو مسٹر اور مسز چند لوزان جانے والے ڈبے میں چل دیے۔ [illegible] نے اُوپر چڑھنا شروع کیا۔ نیچے ایک وادی میں میلوں تک ایک ندی بہتی تھی جس کے کناروں پر صنوبروں کی قطاریں تھیں۔ منظر اس بلندی سے عظیم الشان معلوم ہوتا تھا۔ وادی کی آبادیاں مختصر تھیں اور ایسی خوبصورت کہ آدمی انہیں دیکھ کے محو ہو جاتا ہے اور ہماری گاڑی کو بڑے بھاری بھر کم پُل ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک، ایک سُرنگ سے دوسری سُرنگ تک پہنچا رہے تھے۔

ہم اب بھی پہاڑوں میں گذر رہے تھے مگر اب رات ہو گئی تھی۔ ایک [illegible] نے ہم سے کہا کہ اب ہم نیچے اُتر رہے ہیں۔

برن پہنچے تو یہاں کی صفائی اور روشنی اطالیہ کے شہروں سے اس قدر زیادہ تھی کہ معلوم ہوا ہم یورپ میں ہیں۔ مرچنڈانی کے سوئٹانی دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا اور ہوٹل نارمنڈی میں ٹھہرے۔ جب ہم ہوٹل کے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے تو تین انگریز لڑکیاں ہنستی ہوئی آئیں اور ساتھ ایک میز پر بیٹھ گئیں۔

میں زندگی سے بہت خوش ہوں۔ مرچنڈانی کے دوست بہت امیر تھے، انہوں نے توجہ تک نہیں کی۔

(۱۱)

۱۲ ستمبر۔ صبح کپڑے پہن رہا تھا کہ ایک خادمہ چائے لے کر آئی۔ اس کا سیاہ لباس اور اس پر بندھا ہوا سفید کپڑا بہت اچھا معلوم ہوا۔ لیکن کچھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کرنے نکلا۔ مرچنڈانی پہلے ہی سے میز پر موجود تھا۔ اس کے بعد ہم برن کی سیر کو . . . . ."

(یہاں نعیم کی ڈائری دفعتاً ختم ہو جاتی ہے)

چوتھا باب

عادل

مدرسۂ علومِ آثارِ قدیمہ میں طالب علموں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ جب حیدرآباد میں یہ مدرسہ قائم ہوا تو اس کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے لئے نوجوانوں کو تیار کیا جائے لیکن بہت جلد اس میں بہت سے شعبوں کا اضافہ ہو گیا۔ اس کا نام تو مدرسۂ علومِ آثارِ قدیمہ ہی رہا۔ لیکن یہاں تاریخ، فنونِ لطیفہ، تاریخِ ثقافت، طبقات الارض اور بہت سے علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب مدرسے کی عمارت بن رہی تھی جس کو ایک قابل نقشہ نویس نے اس خوبی سے تیار کیا تھا کہ دکن کی ہزارہا سال کی ثقافت کے تمام عناصر اس میں نمایاں تھے بیگم پیٹ اسٹیشن سے وہاں تک ریل کی چھوٹی سی پٹری ڈالی گئی تھی جس میں ہزارہا ٹن سامان مٹی اور پتھر سب ہی آتا اور سینکڑوں مزدور کام کرتے تھے۔ جن طلبا کو وہاں منتقل ہونا تھا وہ

اکثر اس نئی عمارت کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔ قریب ہی ان کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔

عادل بھی اسی مدرسے اور اقامت خانے میں تھا اور اچھا خاصا ہوشیار طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس امتحان کی تیاری کر رہا تھا جس کا اس مدرسے کے سوا ہندوستان میں کہیں وجود نہیں یعنی بیچلر آف آرکیالوجی۔ بورڈنگ ہاؤس میں شروع شروع میں تو اس کی اچھی گذری اور کچھ دن تو ایسے بھی آئے جب اس کی توقع تھی کہ اسے عریفِ طعام مقرر کیا جائے گا۔ اس کی ظرافت کی داد بھی دی جاتی تھی۔

اپنی ظرافت کے ایک قصے پر اسے خصوصیت سے بہت ناز تھا۔ ایک بار وہ اٹاچی کیس لئے بورڈنگ ہاؤس آرہا تھا۔ دروازے کے قریب کچھ لڑکے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "کیا آج جمعرات ہے؟" دوسرے نے کہا "جمعرات تو نہیں مگر آج حجام آیا ہے"۔ اس پر عادل سمجھا کہ بن گیا اور وہ خاموش ہی تھا کہ پہلے لڑکے نے پھر پوچھا "کیا کیا سامان اس اٹاچی کیس میں لایا ہے"؟ اس پر عادل کو موقع مل گیا اور اس نے کہا "اس میں بانکا اور فلیک دونوں ہیں جس سے کہئے اس سے حجامت کر دوں"۔

غرض بورڈنگ ہاؤس میں عادل اچھی طرح گذار رہا تھا کہ دفعتاً وہ غائب دماغ سا رہنے لگا۔ اس کے سرہانے سے ایک تصویر برآمد ہوئی (یہ تصویر بلقیس کی تھی) تصویر برآمد ہونے کی حد تک تو کوئی ہرج نہ تھا لیکن اس کے ہم کمرہ لڑکے نے اسے اس تصویر سے پیار کرتے دیکھا تھا۔ جب یہ تصویر چرائی گئی تو اسے اس قدر غصہ آیا اور زیادہ وہ ستائے جانے پر وہ اتنا مضحکہ خیز بن گیا کہ دوسرے لڑکوں کا طرزِ عمل بدلنے لگا۔ ایک دن اس نے اس لڑکے کی 'فاختہ' اڑائی جس نے تصویر چرائی تھی۔ جاڑوں کے زمانے میں اس پر ٹھنڈا پانی پھینکا جس کی وجہ سے اس لڑکے کو نمونیا کا اثر ہو گیا۔ وہ تو ہسپتال چلا گیا مگر

دوسرے لڑکے عادل کے دشمن ہونے لگے۔ وہ اسے کوئی سخت تکلیف دینا چاہتے تھے۔ مگر اسی انمونیا کے مریض لڑکے نے اس کے سامان کی تلاشی کا مشورہ دیا اور یہ اُمید ظاہر کی کہ کوئی نہ کوئی دلچسپ چیز ضرور برآمد ہوگی۔ ایک دن جب عادل باہر تھا اس کے تمام صندوقوں کے قفل توڑے گئے۔ ایک چھوٹی سی بیاض ملی جس میں بلقیس کی تعریف اور اپنے عشق کے اظہار میں نظمیں تھیں۔ اسی مریض لڑکے کے مشورے سے ذرا تصرف کے ساتھ انہی نظموں کو ہجو میں بدل دیا گیا اور یہ دیوان "ارتعاشاتِ عادل" کے نام سے شائع ہوا اور اس کی ایک ایک جلد عاقل صاحب اور ان کے بھائی کو بھیجی گئی۔

اس طرح بورڈنگ ہاؤس میں عادل کا رہنا قریب قریب دشوار ہوگیا اور وہ غالباً بورڈنگ ہاؤس کو بھی چھوڑ دیتا مگر تعطیلات کا زمانہ آگیا اور اس کے دشمن دوست اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہونے لگے۔

تعطیلات کے ختم ہو جانے کے بعد جب لڑکے پھر بورڈنگ ہاؤس میں واپس آئے تو انہوں نے عادل کا استقبال کرنے کا باقاعدہ انتظام کیا۔ دروازے سے لے کر طعام تک وہ باقاعدہ صف باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ جب تانگے سے سامان اُتروا کر وہ اپنے کمرے میں جانے لگا تو دو رویہ سنگت نے تالیاں بجا بجا کے گانا شروع کیا۔

"جب چھم سے چلیں گو دمیں چھکے سے اٹھالو"

(۲)

اس دن اس نے تہیہ کر لیا کہ بورڈنگ ہاؤس کو چھوڑ دوں گا۔ پانچ بجے کے قریب اس نے سائیکل پر صفدر نگر جانے کا ارادہ کیا۔ وہ چچی (خانم) سے پہلے یہ تذکرہ کرنا چاہتا تھا کہ بورڈنگ ہاؤس میں وہ نہیں رہنا چاہتا۔ اگر چچی اور عاقل چچا تیار ہو جائیں تو وہ صفدر نگر منتقل ہو

جائے گا، دن رات بلقیس نظروں کے سامنے رہے گی۔ وہ بیگم پیٹ سے سائیکل پر چلا۔ وہی راستہ جو اس نے اس سے پہلے ہزاروں بار طے کیا تھا آج پھر طے کیا۔ اس راستے میں وہ ایک ایک مکان، ایک ایک ٹوٹی ہوئی دیوار، میونسپلٹی کے ہرنل اور کچرے کے ہر ڈھیر سے واقف تھا۔ جوں جوں وہ صفدر نگر سے قریب ہوتا جاتا کلفت مٹتی جاتی اور بلقیس کی صورت آنکھوں میں پھرتی جاتی۔

(۲۳)

اس دن خانم کے یہاں اور بھی لوگ جمع تھے۔ خانم کا ایک رشتے کا بھائی تھا جس کا نام مختار عالم تھا۔ مختار نے ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کر کے شہر کے ایک نامور بیرسٹر کے ساتھ کام شروع کیا تھا اور اس کی وکالت کے چمک جانے کی اچھی خاصی توقع تھی۔ وہ فربہ جسم اور چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے ہوشیار معلوم ہوتا تھا لیکن طبعاً بہت نیک تھا۔ اسے خانم سے بہت لگاؤ تھا اور وہ اکثر ان کی لچھے دار باتیں سننے آیا کرتا۔ دوسرا لڑکا جو وہاں تھا، داؤد احمد تھا۔ یہ عاقل خاں کا دور کے رشتے کا عزیز تھا اور عادل کا ہم عمر تھا۔ ایم۔اے پاس کرنے کے بعد اسے ایک تعلقہ پر ایک مدرسۂ وسطانیہ کی صدر مدرسی کی خدمت مل گئی تھی اور آج کل رخصت پر یہاں آیا ہوا تھا۔

عادل کی بدقسمتی تھی کہ اسی روز اس کے بورڈنگ ہاؤس کے کچھ لڑکوں کی داؤد سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے خانم سے عادل کی گت بننے کا قصہ بیان کر دیا تھا۔ سب اسی پر ہنس ہی رہے تھے کہ عادل پہنچا۔

خانم نے کہا "میاں عادل ہم نے سنا آج آپ کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔"

اس پر بلقیس کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میاں عادل کا چہرہ غصّے اور شرم سے سُرخ ہو گیا۔ انہوں نے لڑکوں کی بدتمیزی اور بیہودگی کی بڑی شکایت کی، جن کی نالائقیوں کی وجہ سے میاں عادل کو حیدرآباد کا مستقبل بہت تاریک معلوم ہو رہا تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے الزامات پر سب مسکرا رہے ہیں اور کسی کو یقین نہیں آ رہا، میاں عادل بھی ہنسنے لگے اور اس نے اس وقت کے موجودہ ماحول کا ان کے حق میں تصفیہ کر دیا اور بات گئی گذری ہو گئی۔

بہر حال اب میاں عادل کو چچی سے یہ کہنا ٹھیک معلوم نہ ہوا کہ وہ بورڈنگ ہاؤس چھوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ اعتراف شکست ہوگا اور وہ خانم چچی اور بلقیس دونوں کی نظر سے گر جائیں گے۔

(۴)

"نعیم کا کوئی خط آیا؟" مختار عالم خاں نے چائے کی پیالی میں عزیز کمپنی کا ایک بسکٹ ڈال کے پوچھا۔

خانم نے کہا "ہاں! میرے نام آخری خط انہوں نے تین مہینے پہلے لکھا تھا اس کے بعد کوئی اور خط نہیں آیا۔"

داؤد نے کہا "ہاں! اب تو بڑے آدمی ہو گئے۔ جب واپس آئیں گے اور کلکٹر بن کے پھریں گے تو ان کے پیروں کے نیچے ہندوستان کی زمین کانپے گی۔"

اس پر مختار عالم نے کہا۔ "نہیں میرے خیال میں تو بڑی اچھی طبیعت کا لڑکا ہے۔"

بلقیس کی اوڑھنی ملگجی سی تھی۔ اس نے اسے سنبھال کے کہا "کیوں داؤد بھائی۔ ہندوستان کی زمین کیوں کانپے گی۔ سیویلین ہو جانا بڑا کمال ہے کیا۔ میں لڑکا ہوتی تو میں بھی برابر سیویلین ہو جاتی۔"

داؤد نے اس پر کہا "اب بھی کیا ہے۔ کسی سیویلین سے شادی کر لو۔ بات وہی ہوگی۔"

اور سول سروس کے امتحان کی تیاری کی زحمت سے بچی رہوگی۔"

اس پر بلقیس ذرا جھینپی، اور خالم زور زور سے ہنسنے لگی۔ داؤد مسکرایا اور عادل کا منہ سوکھ گیا۔

خالم نے کچھ دیر بعد کہا "وہاں جا کے معلوم نہیں آدمی کن کن چیزوں میں پڑ جاتا ہے ــــ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ وہیں شادی کر لے گا۔"

بلقیس نے کہا "کون ان سے شادی کرے گی۔ کوئی اندھی ہوئی تو دوسری بات ہے۔"

اس پر ایک لمحہ کے لئے سب خاموش ہو گئے۔ چھ مہینے کے اندر حالات اس قدر بدل گئے۔ مختار عالم نے خالم کی طرف دیکھا۔ خالم کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ داؤد شرارت سے مسکرا رہا تھا اور عادل کے چہرے پر ایک فاتحانہ اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔

اور اس خاموشی کو سب سے پہلے عادل نے توڑا "مجھے میاں نعیم کا ایک لطیفہ کبھی نہیں بھولے گا۔ جب وہ ولایت جانے لگے تو اسٹیشن پر ٹکٹ لینے گئے۔ ٹکٹ بابو نے کہا۔ 'دیٹ پلیز' (براہِ مہربانی ذرا ٹھہریئے) انھوں نے جواب دیا "ایک سو چالیس پونڈ۔"

اس پر سب کو ہنسی آگئی۔ بلقیس ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ داؤد یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ لطیفہ اس نے آج سے سات سال پہلے السٹریٹڈ ویکلی یا پنچ میں پڑھا تھا۔ لیکن بلقیس کو اس طرح لطف اندوز ہوتے دیکھ کر وہ مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ خالم تو مذاق کو سمجھ ہی نہ سکی تھیں۔

صرف افتخار عالم نے اتنا کہا "تم لوگ نعیم سے جلتے ہو۔"

لیکن نعیم کی قسمت پر مہر لگ چکی تھی۔

(۵)

اس واقعے کے آٹھ دن بعد کا ذکر ہے۔

عاقل خاں سونے کے لئے بستر پر دراز ہو چکے تھے۔ میاں بیوی دونوں کے پلنگ ملے ہوئے تھے۔ خانم ساڑی اتار کے بالوں میں سے پنیں نکال رہی تھیں۔ ویسٹ کوٹ اور پیٹی کوٹ میں ان کا گداز جسم عاقل خاں کو اب بھی بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا عاقل خاں ان کی طرف اشتیاق اور عاشقی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ خانم نے پلٹ کے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا اور اپنے میاں کو دیا "یہ ذرا یہ پڑھو"۔

عاقل خاں نے دل ہی دل میں بڑبڑا کے تکیے کے نیچے سے عینک کی ڈبیا اٹھائی۔ اس میں سے عینک نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔

"محترم چچی صاحبہ!

تسلیم عرض۔ آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ میں نے آپ کو ایک عرصے سے خط نہیں لکھا۔ لیکن اس درمیان میں آپ کا بھی تو کوئی شفقت نامہ نہیں آیا۔ میں ان دنوں کام میں ذرا زیادہ مصروف رہا۔ یہ ابتدائی زمانہ ہے اور ہر چیز نئی ہے۔ اب اگر آپ کا حکم ہو تو میں اور زیادہ پابندی سے خط لکھا کروں۔

مجھے آپ اور آپ سب کی عنایتیں بہت یاد آتی ہیں اور آپ کے اس خط سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ سب کی وجہ سے مجھے اپنے وطن سے کتنی گہری محبت ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ بلقیس اب جونیئر کیمبرج کی تیاری کر رہی ہے اور اس کے بڑے اچھے اچھے پیام آ رہے ہیں۔

پھر بھی مجھے بڑی ہی مسرت ہوگی اگر میری واپسی تک بلقیس کی شادی ملتوی رہے۔ آخر مجھے بھی تو بلقیس کی شادی میں شرکت کا حق ہے۔

اس سلسلے میں آپ بلقیس کی رائے بھی لے لیجئے گا۔ عاقل چچا کو بہت بہت سلام۔

آپ کا خادم نعیم"

عاقل خاں نے کہا "اس خط میں تو کوئی خاص بات نہیں۔ اس نے مذاق میں لکھا ہے"
خانم نے جواب دیا "تم تو اچھے خاصے کوڑھ مغز ہو۔ اس سے زیادہ صاف صاف وہ اور کیا لکھتا کہ وہ بلقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ بلقیس کی رائے پوچھنے کو کیوں لکھتا!"

"تو پھر۔ اچھا ہے نا؟"

"میں بلقیس سے اس کا ذکر کروں گی مگر جانتی ہوں، عادل اور راؤ والے نعیم کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ پہلے تو وہ نعیم سے مانوس تھی مگر اب جب اس کا ذکر آتا ہے وہ بھی ان کے ساتھ اس کی ہنسی اڑاتی ہے"

"بچپن۔۔۔ سمجھا دو"

"اور اس خط کا جواب؟"

"میں خود لکھ دوں گا"

دوسرے دن عاقل خاں نے اس مضمون کا خط نعیم کو لکھا۔

"عزیز و نورِ چشم، پارۂ جگر نعیم سلمہٗ اللہ تعالیٰ

خدا تمہیں عمر دراز اور مرتبہ بلندی عطا فرمائے اور اس کفرستان میں نیک ہدایت دے۔ تمہیں شجیدزاور لحم خنزیر اور زنا و ریا سے محفوظ رکھے۔ کفر کی بستی میں تمہارے ایمان اور اسلام کو توانا اور برقرار رکھے۔ آمین!

تمہارا نوشتہ مکتوب بنام تمہاری چچی کے موصول ہوا جو انہوں نے میری نظر سے بھی گذرانا، جس کو دیکھ کے مجھے تمہاری ہوشیاری اور فراست کا یقین ہوا اور بڑی مسرت ہوئی۔ تم نے بلقیس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اگر اس کا مطلب وہی ہے جو تمہاری چچی سمجھیں اور انہوں نے مجھے سمجھایا تو تم اطمینان رکھو اور مطالعۂ کتب اور اپنے کام میں دل لگاؤ۔ خدا تمہیں

ہر طرح کے شر اور لالچ سے محفوظ رکھے خصوصاً میموں کے جال سے۔ ان کا جادو ایسا ظالم ہوتا ہے جیسے سحر بنگالہ جس کا ذکر کتابوں میں موجود ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔

تمہارا چچا۔ عاقل خاں عفی عنہ'

(۶)

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ داؤد پھر رخصت لے کے آیا تھا اور عاقل خاں کے مکان کی چھت پر سو رہا تھا۔ چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی۔

اس کے کان میں آواز آئی "داؤد بھائی۔ داؤد بھائی!"

وہ چونک پڑا۔ بلقیس اس کے پلنگ کے پاس دوزانو بیٹھی تھی۔ گھنٹہ رات کے دو بجا رہا تھا وہ آنکھیں ملنے لگا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن بلقیس نے جلدی سے کہا۔" داؤد بھائی معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو اس وقت تکلیف دی مگر آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔ اماں سمجھتی ہیں کہ آپ مجھ کو نعیم کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ میں آپ سے مشورہ لینے آئی ہوں۔"

داؤد کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی اور وہ چاندنی کا ناچ بلقیس کے ہلکے سنہرے بالوں میں دیکھ رہا تھا۔ بلقیس کی اوڑھنی سرک گئی تھی اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس لئے اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ بڑا ستم خیز معلوم ہو رہا تھا۔

بلقیس نے پھر کہا "نعیم کے متعلق۔"

داؤد نے کہا "کیا؟"

(۷)

صبح کو عاقل خاں کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ مُردار، چڑیل بلقیس نے خاندان کی

عزت ڈبوئی تھی۔ رات کے دو بجے اسے داؤد سے کیا کام تھا۔ خانم اب داؤد حرامزادے کو اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیں گی۔ عادل نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو ساتھ دیکھا۔
اور عاقل خاں ساری احتیاط بھول گئے۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔
شیر کی طرح دھاڑ کے انہوں نے داؤد سے کہا "تو نے میری ناک کاٹ ڈالی"
داؤد کو ذرا بھی غصہ نہ آیا تھا، وہ اس غیظ و غضب کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس نے کہا "چچا جان! آئینہ ملاحظہ فرمائیے آپ کی ناک اپنی جگہ محفوظ ہے۔ آپ کی عزت بھی محفوظ ہے۔ میں آپ سے قسم کھا کے کہتا ہوں کہ بلقیس میری سگی بہن کی طرح ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے آپ کی صاحبزادی سے کیا دلچسپی؟"
خانم جو بلقیس کو برابر کوس رہی تھیں، پوچھنے لگیں "کم بخت، چڑیل تو وہاں اوپر کیا کر رہی تھی۔ رات کے دو بجے تو اپنے یار ہی کے پاس تو گئی تھی"
بلقیس زور زور سے روتی ہوئی رخصت ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کے دروازہ بند کر دیا۔ داؤد نے سمجھانے کی آخری کوشش کی اور کہا "وہ مجھ سے مشورہ لینے آئی تھی کہ کس سے شادی کروں۔ میں نے مشورہ دیا کہ اگر تم نعیم سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو مت کرو مگر عادل سے ہرگز مت کرنا"
عادل جو اس ہنگامے کا اصلی بانی تھا۔ اب تک خاموش تھا، اب اس نے کہا "میں نے ان دونوں کو اکثر اکیلے میں کھسر پھسر کرتے دیکھا ہے، یہ پہلی بار نہیں تھی......"
اب داؤد کا چہرہ تمتما اٹھا "جھوٹے، بدمعاش، کمینے! ذرا اپنی عینک تو اتار" یہ کہہ کر داؤد نے خانم کی چپل اٹھائی "اتار عینک۔ میں نہیں چاہتا کہ جوتیانے میں تیری عینک ٹوٹے یا تیری آنکھیں پھوٹیں"

عاقل خاں بیچ میں آ گئے۔ داؤد بھاگ گیا۔ اس کے بعد عاقل خاں نے کہا "میاں داؤد! تم میری عزت کے لاگو ہو رہے ہو۔ میری لڑکی بدنام ہو رہی ہے۔ تم میرا نہیں، خاندان ہی کی عزت کا خیال کرو اور میرے گھر مت آیا کرو"

داؤد نے کہا "جو آپ کے گھر قدم رکھے وہ کتا"

اپنا سامان باندھ کے وہ تعلقہ پر صدر مدرسی کرنے واپس چلا گیا اور اپنی بیوی کو میکے سے بلا بھیجا۔

(۸)

جب داؤد دوبارہ حیدرآباد واپس آیا تو بجائے عاقل خاں کے یہاں ٹھہرنے کے محبوبیہ ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ دوسرے درجے کا ہوٹل تھا، اور کمرے اور طعام کا خرچ تین روپے روز تھا۔ بلقیس اسکول سے اس کے آنے کی خبر سن کے اس سے ملنے آئی اور تقریباً دو گھنٹہ تک دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ ان دونوں کی دوستی اب مشورے کی حد سے گذر کے سچی ہمدردی کے مرتبے پر پہنچ چکی تھی اور بلقیس کو داؤد سے اتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ داؤد کی بیوی جلنے لگی تھیں۔ اس درمیان میں دونوں میں برابر خط و کتابت تھی۔

اس دن ہوٹل کی ملاقات کا علم عاقل خاں کو ہوا تو ان کی خانیت کو بڑا غصہ آیا۔ چھڑی لے کے انہوں نے بلقیس کی مرمت کی۔ اس نے بھی انگریزی تعلیم پائی تھی اور اب جونیر میں پڑھ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں جا کے اس نے والد کو خط لکھا کہ آپ مجھے آوارہ سمجھتے ہیں تو میری زندگی سے کیا فائدہ۔ اس نے آیوڈکس میں شکر ملا کے چاٹ چاٹ کے آدھی شیشی کھا لی اور اس کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ چھ ڈاکٹروں نے بڑی محنت اور کوشش سے اس کی جان بچائی۔

اس واقعے کے بعد عاقل خاں کے سامنے بلقیس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی کہ وہ اب داؤد سے کوئی سروکار نہ رکھے گی۔ داؤد نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی کہ وہ بلقیس کو اپنی سگی بہن سمجھتا ہے، ہاں بلقیس اگر کچھ اور محسوس کرتی ہو تو......

عادل کو راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ لینڈی کتے کی طرح بلقیس کے ساتھ لگا رہتا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا۔ پڑھائی میں اس کی مدد کرتا۔ اپنا جیب خرچ اس کے لئے تحفے خریدنے میں صرف کر دیتا اور بلقیس جب اس سے ہنس کے بات کرتی تو اسے اپنی ساری کوشش کا انعام مل جاتا۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے اور داؤد کے دور ہونے کی وجہ سے ماحول صاف ہوتا گیا۔ چیف ڈاکٹروں نے بلقیس کے علاج میں نہایت رازداری برتی تھی۔ اس لئے اس کی اقدامِ خودکشی کی داستان خاندان سے باہر نہ پھیل سکی اور یہ سب واقعات اتنے پرانے معلوم ہونے لگے جیسے گذشتہ صدی میں پیش آئے ہوں۔

دُوسرا حِصّہ

پانچواں باب

گلِ سُرخ

پیرس میں گرمیوں کا موسم اور سہ پہر خصوصیت سے خوشنما تھی۔ بولوار رساں مشیل میں بھی شہر کے دوسرے حصوں کی طرح ۱۴ر جولائی کی قومی عید کی خوشی میں ہر ریستوران سجا ہوا تھا۔ باہر کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ ابھی سے آ آ کے بیٹھ رہے تھے اور شراب پی پی کے زور زور سے کاندھے ہلا رہے تھے۔ نعیم کو فرانسیسیوں کے شانے ہلانے کی ادا شروع سے بہت پسند تھی۔

۱۴ر جولائی کا دن انقلاب فرانس کی یادگار کی عید ہے۔ نعیم اور ہروشا دونوں گرما کی تعطیلات بسر کرنے اور فرانسیسی سیکھنے آئے ہوئے تھے۔ دن بھر پھرتے رہے تھے صبح کو دونوں نے پلاس دے کونکارد پر فوجی پریڈ دیکھی تھی۔ دوپہر کو دونوں باستیل گئے جہاں وہ مشہور و معروف قید خانہ تھا جس کے افسانے فرانسیسی ناولوں میں پڑھنے سے

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس میں اسی قید خانے کو ڈھایا گیا اور اب اس کی جگہ ایک چھوٹا سا مینار رکھا۔ باستیل کے میدان میں مزدوروں اور انقلاب پسند تحریکوں سے ہمدردی رکھنے والوں کے جلوس نکل رہے تھے اور یہیں نعیم نے "گل سرخ" کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"گل سرخ" گھونگھر والے سفید و زریں بالوں والی انگریز لڑکی تھی۔ اس کے والد وسط انگلستان کی ایک مشہور یونیورسٹی میں علم ہیئت کے پروفیسر تھے اور اپنے فن کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ "گل سرخ" کا نام میری پاول تھا لیکن انگلستان اور فرانس کے انقلاب پسند طلباء کے حلقوں میں وہ "گل سرخ" کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے زیادہ حسین لڑکیاں جامعہ سربن جیسی حسن پرور یونیورسٹی میں بہت کم تھیں۔ لندن میں جب وہ سڑکوں پر چلتی تو راہ گیر پلٹ پلٹ کے دیکھتے۔ اس صوری دلکشی کے ساتھ ساتھ اس کی سادگی اور خود اعتمادی کی وجہ سے جو اس سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ غرض گل سرخ سے طالب علموں کی دنیا بہت اچھی طرح واقف تھی۔

باستیل کے جلوس دیکھ چکنے کے بعد ہروشا اور نعیم دونوں بلوار سان میشل واپس آئے۔ بہت سی دوکانیں بند تھیں مگر قہوہ خانے، کیفے، بار کے سب کھلے ہوئے تھے۔ دونوں میں بحث ہوئی کہ کہاں چلیں۔ ہروشا نے "وارکور" کا نام تجویز کیا لیکن نعیم نے اعتراض کیا کہ سر ہارکورٹ بٹلر ہندوستان میں گورنر رہ چکا ہے اور اس کیفے کا نام اس کی یاد دلاتا ہے۔ آخر تصفیہ ہوا کہ "لاسورس" جائیں۔ وہ دونوں وہاں پہنچے۔ فرانسیسی اور چرکس، مصری اور ہند چینی سب ہی طرح کے لوگ وہاں تھے۔ رنڈیوں کے آنے کا وقت آگیا تھا۔ ہروشا نے کہا "یہ عجیب بات ہے جہاں طالب علموں کی

آبادی ہوتی ہے، وہاں رنڈیاں بھی آ بستی ہیں"۔ غرض لاسورس کی مرمخ نشستیں بھری ہوتی تھیں اور گلاسوں اور ظروف اور باتوں کی آوازوں سے بڑی رونق معلوم ہو رہی تھی اور نعیم بہت خوش تھا۔

(۲)

مگر ہم نے اب تک آپ سے ہروشا کا تعارف نہیں کرایا۔ یہ نوجوان چیکوسلواکیہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد پراگ کے علمی حلقوں میں کافی مشہور تھے۔ انہوں نے یورپ کی کئی زبانوں سے ادبیاتِ عالیہ کا چیک زبان میں ترجمہ کیا تھا اور پریسیڈنٹ مسیرک کی سوانحعمری لکھی تھی۔ اپنے بیٹے زیدنک ہروشا کے متعلق انہوں نے یہ تصفیہ کیا تھا کہ وہ اخبار نویسی کرے۔ مگر وہ اتنا ذہین تھا کہ حکومت نے بہت جلد اخبارات میں اس کے مضامین کی طرف توجہ کی۔ چیکوسلواکیہ کے وزیر خارجہ جو اس کے والد کے دوست تھے اس پر رضامند ہو گئے کہ اگر ہروشا چند سال یورپ کے دوسرے ملکوں میں گذار کے وہاں کی سیاسیات کا مطالعہ کرے اور وہاں کی زبانیں سیکھے تو دفترِ وزارتِ خارجہ میں اسے کوئی اچھی خدمت دے دی جائے اور اسی سلسلے میں ۱۹۲۷ء سے اب تک ہروشا جرمنی، روس، انگلستان اور اب فرانس میں تھوڑے تھوڑے مہینے گذار رہا تھا۔

نعیم سے اس کی ملاقات آکسفورڈ ہی میں ہوئی۔ ان دونوں کا ایک مشترک دوست تھا۔ کارلووچ، یوگوسلاویہ کا رہنے والا تھا اور بے حد زندہ دل تھا۔ ابتدا میں ہروشا اور نعیم کو ایک دوسرے سے خاص مناسبت معلوم نہ ہوئی۔ لیکن کارلووچ کی ظرافت سے دونوں کو دلچسپی تھی۔ تینوں ساتھ ساتھ پھرا کرتے۔ جب کارلووچ اپنے وطن واپس چلا گیا تو ہروشا اور نعیم اچھے خاصے دوست بن چکے تھے۔

لاسورس سے نکل کے وہ زمین دوز ریل (میترو) کے اسٹیشن کی طرف چلے سڑک کے کنارے پیدل چلنے کی روش پر چھوٹی چھوٹی دوکانیں دیکھتے ہوئے۔ ان دوکانوں کی وجہ سے پیرس میں غیر معمولی مشرقیت پیدا ہوگئی ہے۔ روش پر ایک اژدہام سا تھا۔ کچھ لوگ دوکانوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور تھوڑی دیر کے بعد چل دیتے۔ نعیم مقابل سے آنے والوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ ہلا ہلا کے باتیں کرتے ہوئے فرانسیسی اور فرانسیسیوں سے تعداد میں کہیں زیادہ اجنبی۔ بولوا رساں مشیل بلکہ پورے کوارتیئے لاتاں کی آبادی کا بڑا حصہ اجنبیوں پر مشتمل تھا۔ نعیم کو یاد آ گیا کہ یونیورسٹی میں ترجمہ کی کلاس میں نوجوان اُستانی نے لال بالوں والے اسکاچستانی بلند بالا طالب علم سے آنکھ لڑا کے اور مسکرا کے کہا تھا: "مگر موسیو کوارتیئے لاتاں سے آپ فرانسیسی یا پیرس کے تمدن کا اندازہ کریں گے تو غلطی کریں گے۔ کیونکہ یہاں بالعموم اجنبی بستے ہیں۔ جن کی زندگی ہم کو بھی اتنی ہی انوکھی معلوم ہوتی ہے جتنی آپ برطانویوں کو۔"

سامنے سے ایک نوجوان سوکھی سی عورت گذری جس کے بال خشک اور گھونگھریالے تھے۔ نعیم اس کو لاسورس میں بیٹھے بیٹھے تین چار بار سڑک پر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گذرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ رنڈی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک بار نعیم کو وہ "کوپول" میں ملی تھی۔ اس نے خود ہی "کہاں" کہہ کے نعیم کو مخاطب کیا تھا۔ نعیم اسے سینما لے گیا اور جب اس کے لئے بھی ٹکٹ خریدنے لگا تو اسے تعجب ہوا۔ سینما میں نعیم نے دست درازی کی تو وہ اسے ٹکٹ کی قیمت سمجھ کے خاموش رہی اور باہر نکل کے اس نے نعیم کو بتایا تھا کہ وہ پناہ گزین یہودن ہے اور ریبلاؤ کی رہنے والی ہے۔ اس نے پھر ملنے کا وعدہ کیا تھا اور نہیں ملی ......

اتنے میں مینرو کا اسٹیشن آگیا اور دونوں دوست نیچے اترے۔ مینرو کے اسٹیشن ان دنوں تو قابلِ برداشت تھے مگر جاڑوں میں ان کو دیکھ کے نعیم کو متلی ہوتی تھی انگلستان کی زیرِ زمین ریلوے کتنی تیز ہے۔ اسٹیشن کتنے صاف ہیں، ہر چیز کتنی خوبصورت، کتنی باقاعدہ ہے۔

چنانچہ زمین دوز ریل میں سوار ہوتے ہی نعیم نے دفعتاً ہروشا سے کہا: "اگر اب کے جنگ ہوئی تو مجھے فرانس کا حشر کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کسی چیز میں تیزی نہیں، پھرتی نہیں، تنظیم نہیں، باقاعدگی نہیں۔"

ہروسنا پائپ پی رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی نیلی نیلی آنکھیں، اس کی سلاف کھوپڑی پر جمے ہوئے سیاہ بال اور اس کے سرخ ہونٹ ہمیشہ مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس غیر متوقع اظہارِ خیال پر وہ چونک پڑا۔ فرانس اور چیکوسلواکیہ میں باہمی معاونت کا معاہدہ تھا۔ اس قسم کی تنقید اسے اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ اس نے فرانسیسی فوج اور فرانسیسیوں کی شجاعت کی تعریف کی: "فرانسیسیوں میں توازن ہے۔ یہ چیز بہت کم یورپی قوموں میں ہے۔ ذرا وقت آنے دو پھر دیکھنا وہ کیسے لڑتے ہیں۔"

یہ کہہ کے اس نے پائپ کا ایک کش لیا۔

اور نعیم سوچنے لگا۔ جوش ملیح آبادی کی ایک نظم اس نے کئی سال پہلے پڑھی تھی۔ فرانسیسیوں کے متعلق اس کا ایک مصرعہ اسے یاد آیا ؏

مری راتیں نگاروں میں، مرے دن کارخانوں میں

مگر یہ بھی غلط تھا۔ نگارخانوں کے سرپرست اجنبی ہی تھے۔ فرانسیسی بہت کم پیرس کی عشرت گاہوں میں جاتے ہیں۔ خاندانی زندگی میں یہاں اتنی روک ٹوک اور

اتنا ٹھہراؤ ہے کہ انگلستان میں نہیں۔ متوسط طبقے میں لڑکیوں پہ پابندیاں بہت ہیں۔ یہ
رب ہے پھر بھی۔ پھر بھی نہ شاں دے مارس کے قریب فرانسیسی فوجوں کی پریڈ دیکھ کر،
نہ آج صبح پلاس دے کونکارد میں فرانس کی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھ کے اسے
اطمینان ہوا تھا۔ "اطمینان" اس لئے کہ اسے فرانس سے محبت معلوم ہوتی تھی۔ ایک
فرانسیسی فلم میں اس نے یہ جملہ سنا تھا اور اسے سچ پایا تھا کہ ہر شخص کے دو وطن ہوتے
ہیں۔ ایک اس کا اپنا وطن اور دوسرا فرانس۔

زیر زمین ریل کا یہ ڈبہ چھوٹا سا تھا۔ تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں اور اس لئے ہروشا
اور نعیم بیچ میں کھمبے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک حبشی بہت باتکلف
کپڑے پہنے اخبار "کاندید" پڑھ رہا تھا۔ ایک نشست پر ایک مزدور ایک نوجوان
لڑکی کا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نخرے کر رہی تھی اور آس پاس کی
نشستوں پر لوگ ہنس رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے زیر زمین ریلوے کے غیر دلچسپ اسٹیشن گزرتے گئے۔ ان کے
درمیان ریل کی سرنگ کی دیوار پر نعیم "لا ییل تاروی نیر" کا اشتہار پڑھتے پڑھتے اکتا گیا
ہروشا نے کچھ کہا مگر اس نے نہ سننے کی پروا کی اور نہ سمجھنے کی۔ ہروشا نعیم کی اس عادت
سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اپنے پائپ میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ دونوں ریل سے
اترے اور پلاس دے لو فلو روانہ ہوئے۔ جہاں بارہ ہزار مزدوروں کے مجمع کو فرانس
کا اشتمالی لیڈر موسیو تھورے خطاب کرنے والا تھا۔

ہروشا اس مجمع کے تمام خصائص سے اچھی طرح واقف تھا۔ بیچ میں خالی زمین
تھی اور اس کے سرے پر اسٹیج تھا۔ اطراف میں ایک تین چوتھائی دائرے کی شکل،

گھوڑے کی نعل کی شکل کا ایمفی تھیٹر تھا جو لکڑیوں کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اسٹیج کے پاس دوسری صف میں ہروشا نے نعیم کو کسی نہ کسی طرح لا بٹھایا۔ پورا ایمفی تھیٹر کھچا کھچ بھرا تھا۔ بیچ زمین پر مٹھیاں تانے ہوئے کچھ زسیں ایک جلوس بنا کے آئیں۔ پورے مجمع سے ”سودیبے پارلو“ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ دوسرے انقلابی نعرے بلند ہوئے۔ زسیں اپنی اپنی جگہ گئیں۔ زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لتنے میں تھورے کی تقریر شروع ہوئی اور مقابلتاً خاموشی چھا گئی۔

نعیم ہمیشہ تقریر سُنتے سُنتے بیچ بیچ میں غائب ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا دماغ اور کسی طرف مصروف ہو جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی دس بارہ منٹ تک تقریر سُننے کے بعد اس کی نظریں پھر سے مجمع کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ہروشا بیٹھا تھا اور اب اس نے اچھی طرح محسوس کیا کہ اس کی دائیں ٹانگ سے چوبیس پچیس سال کی ایک گداز جسم کی عورت کی ٹانگ برابر مس کر رہی تھی۔ یہ عورت ایک موٹا بھدا فرانسیسی سانڈوچ کھا رہی تھی اور تھورے کی تقریر سن رہی تھی۔ نعیم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ ہری ٹھوڑی تھی۔ ہونٹوں پر سُرخی نہ تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بچہ تھا۔ ایک جوان آدمی تھا، پھر ایک چھوٹی لڑکی تھی اور پھر ایک بڈھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ایک خاندان کے ہیں۔ بہت جلد اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ عورت نے کاغذ کا ایک بڑا سا لفافہ آگے بڑھایا۔ جوان نے انکار سے سر ہلایا مگر بوڑھے نے ایک سانڈوچ نکال کے کھانا شروع کر دیا۔ نعیم ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے اس کی ہمسایہ عورت نے ”موسیو“ کہہ کے سانڈوچوں کا لفافہ اس کے آگے بڑھایا اور مسکرائی۔ نعیم سے کچھ اور نہ بن پڑا۔ اس نے ایک سانڈوچ نکال کے سری لڑکی کو مدام“

کیا۔ فرانسیسی سانڈوچوں سے اسے سخت نفرت تھی پیلے کی باہوں کی ننگی موٹی موٹی ہڈیاں اور ان کے بیچ میں گوشت کے ٹکڑے۔ اس قسم کے سانڈوچ مرغکوں ہی کے لئے بنائے گئے ہوں گے۔ وہ سانڈوچ لینے سے انکار کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے لے کر کھا لیا؟ اسے تعجب ہوا کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے وہ کیا جو اس کی خواہش کے بالکل برعکس تھا اور مقرر کی تقریر سے بے توجہ ہو کے اس نے اپنا نفسیاتی تجزیہ شروع کیا۔ غالباً سانڈوچ لے لینے کی نامحسوس خواہش اس لئے پیدا ہوئی کہ اس طرح اس عورت سے بات چیت کرنے کا موقع ملے گا یا کم سے کم اس سے نامحسوس ربط اور تعلق بڑھ جائے گا۔ اس کی ران تو نعیم کی ران سے مس کر رہی تھی اور اگر وہ سانڈوچ لینے سے انکار کر دیتا تو اس عورت سے ایک طرح کا نفسیاتی بُعد پیدا ہو جاتا۔

پھر اس نے مزدوروں اور اشتمالیوں کے لیڈر کی تقریر کی طرف توجہ دی جو فرانس اور سوویت روس کے باہمی جنگی پیمان تعاون کو تفصیل سے سمجھا رہا تھا اور بڑے زور و شور سے اس کی تائید کر رہا تھا۔

بالآخر اس کی تقریر ختم ہوئی۔ تالیوں کی گونج کے بعد انقلابی نعرے ایمفی تھیٹر کے ایک سرے سے بلند ہونا شروع ہوئے اور دوسرے سرے تک بلند ہوتے گئے۔ اس کے بعد صدر کی آواز پھر گونجی: "اب میں اشتمالیوں کی محبوبہ 'گل سرخ' مس میری پاول سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ انگلستان کی انقلابی تحریک پر تقریر فرمائیں۔"

بیچ بیچ میں جب نعیم کا ضمیر اسے ملامت کرتا اور وہ غور سے "گل سرخ" کی تقریر سننے لگتا تو اسے معلوم ہوتا کہ تقریر میں کوئی نئی بات نہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں،

کوئی نئی بات نہیں جو اسے معلوم نہ ہو۔ تقریر کرنے والی کے پاس سادگی اور حسن کے سوا اور کوئی حربہ بھی نہیں تھا۔ مگر سامعین کو دم بخود رکھنے کے لئے یہی دو حربے بہت کافی تھے۔ نسیم کی توجہ بار بار ہٹ جاتی۔ وہ تیز روشنی میں میری پاول کے چمکتے ہوئے سنہرے بالوں کو دیکھ رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ جب وہ تقریر کرتے کرتے اوپر سر اٹھاتی تو روشنی جادو بن کے اس کے چہرے کے بھولے پن پر دوڑ جاتی۔

اس تقریر کے بعد اور بھی تقریریں ہوئیں۔ آخر میں ایک اشتراکی انجمن کی عورتیں سنگت میں ناچیں۔ ان کی برہنہ ٹانگیں اور رانیں اشتمالیت کی تبلیغ کرنے والوں اور اسٹالن کے پیروؤں کے اس جلسے میں بھی اس طرح بلند ہو رہی تھیں جیسے ان کی بہنوں کی ٹانگیں پیرس یا نیویارک کے کسی ایسے نائٹ کلب میں جہاں وہ لکھ پتیوں کا شکار کھیلتی ہیں۔ ان کی ٹانگیں سر کے قریب بلند ہوتیں اور پھر روشنی میں جگمگاتی ہوئی فرش تک واپس آتیں۔ ہلکے سفید کپڑوں کے نیچے ان کی چھاتیاں تھرک رہی تھیں اور ران کے جسم کی اچھل کود سے ان کے بال ہوا میں بلند ہوتے اور پھر سر اور شانوں پر گرتے تھے۔

اس کے بعد جلسہ ختم ہوا۔ انقلابی نعرے لگائے گئے اور فرانس کے مزدور گھروں کو واپس جانے لگے۔ وہ چھوٹا سا تعلیم یافتہ گروہ جس نے انہیں یہاں جمع کیا تھا اور جس میں مارکس، انیگلز اور لینن پیدا ہوئے تھے، دیر تک ٹھہرا رہا۔ کیونکہ متوسط طبقے کے روشن خیال افراد، کچھ ہی کیوں نہ ہو، کچھ معاشرتی ذمہ داریاں بھی تو رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقے کے لوگ ایک دوسرے سے ملنے اور باتیں کرنے لگے کچھ تقریروں

پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کچھ تقریروں کے موضوع پر اور کچھ جلسے کی کامیابی پر۔ اور انہی لوگوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہروشا اور نعیم اسٹیج کی جانب بڑھے جہاں میری پاول اب تک کامریڈ تھورے سے باتیں کرتی نظر آ رہی تھی۔

لیکن فاصلہ کافی تھا۔ قبل اس کے کہ یہ لوگ وہاں پہنچ سکیں، وہ دونوں مجمع میں غائب ہو گئے۔ ہروشا نے کہا "خیر آج میں اس سے نہیں ملا سکا تو پھر کبھی سہی"!

(۳)

وہاں سے یہ دونوں پھر لولا رساں مشیل واپس آ گئے۔ اب ان کے سامنے تین تجویزیں تھیں۔ یا تو اپنے چھوٹے سے ہوٹل میں جا کے سو رہیں۔ یا قریب ترین نائٹ کلب میں تھوڑی دیر ناچیں۔ یا پھر لاسورس میں کوئی "اے پلے رے تیف" یا کافی پئیں۔ اوّل الذکر تجویز کی نعیم نے مخالفت کی۔ دوسری کی ہروشا نے۔ اور پھر دونوں لاسورس پہنچے۔ یہاں مجمع چھٹ چکا تھا۔ جو رنڈیاں شام کو آئی تھیں، ان میں سے ایک دو شکار کے لئے کر پھر سے آ بیٹھی تھیں۔ تین چار ہندوستانی طالب علموں کا ایک گروہ بڑی محویت سے باتیں کر رہا تھا اور ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی تھی جو بظاہر یوروپین معلوم ہوتی تھی۔

ان ہندوستانی طالب علموں نے ایک لمحے کے لئے ہروشا اور نعیم کو دیکھا۔ پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے گلاسوں میں مختلف قسم کی شرابیں رکھی تھیں۔ نعیم سوچنے لگا کاش اسے ان سب کا نام یاد ہوتا۔ اس نے ہروشا سے کہا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ اور کچھ اُبالے ہوئے انڈے منگائے اور ساتھ ہی اسکاچ وسکی اور سوڈا۔ پھر سگریٹ جلا کے ہروشا کی طرف دیکھنے اور مقابل کی میز پر اپنے ہندوستانی

ہم وطنوں کی باتیں سُننے لگا۔

ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "...... میں نے جواہر لال سے یہیں یہ کہا تھا کہ پنڈت جی یہ تو فرمایئے کہ آپ اپنے ملک میں جو لڑائی لڑ رہے ہیں وہ ہندوستانی سرمائے اور برطانوی سرمائے کی لڑائی ہے یا ہندوستانی مزدور اور برطانوی سرمایہ دار کی......؟"

ایک اور نوجوان جو ان سب میں خوش پوش تھا اور خدو خال سے راجپوت معلوم ہوتا تھا، جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور رنگ سانولا تھا، کہنے لگا "اس مرتبہ اسپین میں میں نے دیکھا، تمام کلیساؤں کی دیواروں پر ہتھوڑے اور درانتی کے نشان بنے ہوئے تھے۔ غالباً لینن نے یہ کہا بھی تھا کہ روس کے بعد سب سے پہلے اسپین میں انقلاب آئے گا۔"

وہ یوروپین لڑکی جوان لوگوں کے ساتھ تھی۔ اس اردو تقریر میں اسپین اور لینن کا ذکر سُن کر ذرا چونکی تو پہلے طالب علم نے فرانسیسی میں کہا:

"حلیمہ خانم! راجکمار اپنے اسپین کے سفر کا ذکر کر رہے ہیں" اور اس کے بعد راجکمار پکے اشتمالی کی طرح اسپین کے انقلاب پسندوں کے کارنامے سُنانے لگا۔

ان میں سے تیسرا جواب تک خاموش تھا پہلے سے کہنے لگا "شجاعت کچھ اور پیو گے؟" پھر اس نے آواز دی "گارسوں" اور خادم آگیا۔

شجاعت نے کہا "اعجاز صاحب آپ کا بیر ٹھنڈا ہو رہا ہوگا۔ اب وقت کیا ہے؟"

اعجاز نے کہا "بارہ بج کے پچیس۔ شجاعت! جواہر لال کے متعلق تم نے جو کہا......"

شجاعت نے پہلے تو ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جس کی وجہ سے حلیمہ خانم اور راجکمار کی گفتگو منقطع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اس نے کہا۔
"اعجاز صاحب آپ نے سوائے اپنی کتابوں کے دیباچوں کے اور بھی کچھ پڑھا ہے؟"
اعجاز صاحب جو سیاہ، چیچک زدہ اور بدشکل تھے، کہنے لگے "مجھے اس میں شک ہے کہ آپ نے اتنا بھی پڑھا ہو۔"
شجاعت نے کہا "آپ ضرورت سے زیادہ پی گئے ہیں۔"
راجکمار نے کہا "جانے بھی دو۔"
اتنے میں شراب آئی اور جام پھر چھلکنے لگے۔ ہرونشا نے نیند کی شکایت کی۔ نعیم نے آہستہ سے کہا "میں اپنے ان دلچسپ ہم وطنوں سے ملنا چاہتا ہوں تم جاؤ۔ شب بخیر!"
ہرونشا کے جانے کے بعد نعیم نے پھر سننا شروع کیا۔ شجاعت کہہ رہا تھا۔
"گاندھی جی کے آشرم میں جا کے مجھے تیسرا روز تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل سیوا گرام تشریف لائے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ آپ کی تحریک ڈاکوؤں کی تحریک ہے جو دوسرے ڈاکوؤں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ بتائیے کہ ہندوستانی کسان یا مزدور کا آقا گورے کے بجائے کالا ہو جائے تو کیا اس کا پیٹ بھر سکے گا؟ . . ."
شجاعت رک گیا۔ کیونکہ اس اثنا میں نعیم اٹھ کے ان لوگوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ لوگ اس کی طرف کسی قدر استعجاب اور کسی قدر تجسس سے دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نعیم نے اپنا تعارف کرایا "معاف کیجئے کہ میں نے مخل

ہونے کی جرأت کی۔ مگر آپ کی گفتگو اتنی دلچسپ ہے کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرا نام نعیم حسن ہے۔"

"آپ سے غیبی تعارف ضرور ہے" شجاعت نے کہا "آپ آئی سی۔ایس کے مقابلے کے لئے آئے ہیں...... میرا نام شجاعت علی خاں ہے۔میں بھی حیدر آباد کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد شہپر جنگ تھے۔آپ راجکمار رام سنگھ ریاست ——— کے ولیعہد ہیں اور آپ نواب اعجاز علی خاں ——— آپ کے بھائی ریاست ——— کے والی ہیں ...... حلیمہ خانم۔ آپ البانیہ کی رہنے والی ہیں"

"ہم سب کو آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یہ کہہ کے پھر سب بیٹھ گئے۔ اعجاز نے پوچھا "نعیم صاحب آپ کیا پئیں گے؟"

یہ سب کے سب اسی اشتمالی جلسے سے واپس آئے ہوئے تھے جس میں نعیم اور ہیروشا نے بھی شرکت کی تھی اور بہت جلد آپس میں فرانس کی سیاسیات پر بحث ہونے لگی۔ شجاعت کو اس کی توقع تھی کہ اشتراکی اور اشتمالی عناصر فرانس میں اتنی ترقی کر لیں گے کہ بلا کشت وخون آسانی سے انقلاب آ جائے گا۔ یہ دوسرا انقلاب فرانس ہوگا اور فرانس میں اشتمالی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد یورپ بھر میں اشتمالیت کا پھیلنا یقینی ہے۔ روس اور فرانس کے درمیان جرمنی سانڈوچ کے گوشت کی طرح دب جائے گا۔

لیکن اعجاز کو اس طرز خیال سے بنیادی اختلاف تھا۔ اشتراکیت ہی اشتمالیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جرمنی میں کیا ہوا؟ انگلستان کی مزدور جماعت کا کیا حال ہے؟ نہیں فرانس کی سیاسیات کا یہ رجحان ہی غلط ہے۔ اشتمالیت اگر اشتراکیت

کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ بنا رہی ہے تو یہ محاذ رفتہ رفتہ رجعت پسند ہوتا جائے گا۔
اشتراکیت ہمیشہ سرمایہ دارانہ زور کے سامنے سر جھکاتی ہے۔ اس کا انجام کچھ اچھا نہ ہوگا۔

راجکمار صاحب بھی بیچ بیچ میں اسپین کے حالات کا ذکر کر دیتے۔ اتنے میں شجاعت نے نعیم سے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے؟"

نعیم اس سوال پر ذرا لاجواب سا ہو گیا "سیاسیات میں میں صرف ایک ناظر کی حیثیت سے دلچسپی لیتا ہوں۔ مجھے سرکاری ملازمت کرنی ہے۔ آپ سب حضرات امراء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو مزدوروں کی تحریک سے اس قدر دلچسپی ہے اور آپ نے اتنی معلومات حاصل کی ہیں کہ مجھے آپ کے سامنے کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

اس پر تینوں مہربان خوشی اور شفقت سے مسکرائے اور راجکمار نے اعتذاراً اور انکساراً کچھ کہا۔ مگر شجاعت کی بلند آواز سے ان کا شکریہ دب گیا۔ شجاعت نے کہا "نعیم صاحب آج اعجاز نے ہندوستانی کھانا تیار کرایا ہے۔ ہم سب وہاں سپر کھانے جا رہے ہیں۔" حلیمہ کا بازو پکڑ کے اس نے کہا "مدموزیل حلیمہ بھی چل رہی ہیں۔ اگر آپ کو کوئی خاص کام نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلیئے۔"

نعیم بہت بہت شکریہ ادا کر کے ان کے ساتھ ہو لیا۔ شجاعت نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ سب کسی نہ کسی طرح اسی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ حلیمہ شجاعت کی گود میں بیٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد رو ساں ریمی میں ایک خوب صورت بلاک کے سامنے سب اترے اور اعجاز کے فلیٹ میں پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں کرومیم کا اعلیٰ درجے کا فرنیچر تھا۔ کونے پر ایک میز پر کارل مارکس کی بڑی سی تصویر چاندی کے

چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔

اعجاز نے وہ تصویر دکھا کر کہا " یہ وہ مورتی ہے جس کی ہم صبح و شام پوجا کرتے ہیں "

پھر کھانا ہوا۔ حلیمہ راجکمار سے باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں راجکمار نے بڑے ادب سے جھک کے معافی چاہی اور دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شجاعت نے تھوڑی دیر کے بعد آ کے حلیمہ سے کہا " رام سنگھ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ بستر پر قریب قریب بیہوش پڑا ہے " تھوڑی دیر کے بعد دوسرے باتھ روم سے اعجاز کے قے کرنے کی آواز آئی۔ شجاعت نے جلدی سے یونانی اور ہندو علم الاصنام کا مقابلہ شروع کیا " زیس اور دیو۔ یہ دونوں لفظ ایک ہی اصل سے نکلے ہیں۔۔۔۔۔۔"

نعیم نے دیکھا کہ حلیمہ شجاعت کی طرف دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں گویا شجاعت کی آنکھوں سے بغل گیر ہونا چاہتی ہیں۔ جس کی غالباً ان کو عادت ہے۔ یہ دیکھ کے اس نے بھی معافی چاہی۔

" آپ کو ٹیکسی کہیں قریب ہی مل جائے گی۔ یا آپ کہئے تو میں آپ کو ٹیکسی تک چھوڑ آؤں " شجاعت نے کہا۔

نعیم نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا اس کی ضرورت نہیں۔

اس نے دیکھا کہ حلیمہ کا ہاتھ شجاعت کے ہاتھ میں تھا۔

شجاعت نے مسکرا کے اس سے کہا " یہ تو بتائیے پھر کب ملئے گا۔ آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ لوگ زیادہ تر ٹور بسن جاتے ہیں ؟ مجھے سوہو زیادہ پسند نہیں۔ ہم لوگ ڈوپاں میں بیٹھا کرتے ہیں ——— قریب قریب روزانہ پانچ بجے

کے بعد۔ وہاں کسی روز آیئے یا پھر ہیں؟"

نعیم نے پھر شکریہ ادا کیا۔ حلیمہ نے مسکرا کے شب بخیر کہا اور نعیم لفٹ ہی میں
ن انتہا پسند ہندوستانی امیرزادوں پر تبصرہ کر رہا تھا اور طنز سے مسکرانے لگا
تھا۔ بجز ٹیکسی کے اور کسی سواری کی امید نہ تھی۔

جب وہ سونے کو لیٹا تو پاس کے کمرے سے ہر دشا کے خراٹوں کی آواز آ رہی
تھی۔ کپڑے اتارتے ہوئے اس نے شام کے واقعات پر تبصرہ کیا۔ گلِ سرخ، گل سرخ
پری یا دل کتنا معمولی نام ہے۔ انگریز عورتوں کے نام کی مثال دینی ہو تو یہ نام بتاؤ۔
پری یا دل۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔ فرانسیسیوں کے مذاقِ سلیم نے البتہ اسے "گل سرخ"
لقب دیا جو اسے زیب دیتا ہے۔

اور حلیمہ؟ ہم سمجھتے تھے کہ البانوی حسن میں کوئی خاص بات ہوگی۔ صحت، شاید
ں ہوگی۔ پیرس نے تو اس کے لب و رخسار پر اتنی سرخی، اتنا غازہ مل دیا تھا کہ
ں میں اور کسی فرانسیسی لڑکی میں فرق ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اور یہ پرجوش انقلاب پسند ہندوستانی نوجوان۔ ان کی باتیں، ان کے تبصرے
روم میم کا فرنیچر اور چاندی کے چوکھٹے میں کارل مارکس کی تصویر۔ اور نفے کرنے کی آواز
... نفے کرنے کی آواز طلائی ہے یا نقرئی . . .

تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آ گئی۔

(۴)

اگلے دن "سرکل آنگلو فرانسیز" نے ناچ اور رات کے کھانے کا انتظام کیا
ا۔ ہردشا جو نہ برطانوی تھا نہ برطانوی رعایا اور نہ فرانسیسی، اس ناچ میں مدعو نہ تھا۔

نعیم شاید نہ جاتا۔ لیکن ایک امریکن لڑکی ایلس جو اس کے ساتھ فرانسیسی سیکھ رہی
تھی کہہ چکی تھی کہ وہ شریک ہوگی۔ نعیم اس زمانے میں اس کا باقاعدہ "تعاقب" کر
رہا تھا اور کامیابی کی اچھی خاصی امید بندھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ "گلِ سُرخ" کے
وہاں آنے کی بھی امید تھی۔

ناچ میں فرانسیسی بہت کم تھے۔ تین فرانسیسی لڑکیاں بڑی خوب صورت تھیں۔
مگر وہ اپنے ساتھی فرانسیسی لڑکوں کے ساتھ ناچ سے زیادہ کوُد پھاند اور کُشتی
میں مصروف رہیں۔ انگریزوں ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ کچھ امریکن تھے۔ نعیم نے
تقریباً ہر ناچ اپنی امریکن دوست کے ساتھ ناچا۔ اسی کے ساتھ ناچ کے وقفے
میں پھل اور کیک کھائے اور کافی پی۔

لیکن ایک ناچ ایسا بھی تھا جس میں جو چاہتا دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ
کے اس کے ساتھ کی ناچنے والی کو چھین لیتا۔ لال بالوں والا اسکاچستانی لڑکا جس سے
نظر ملا کے اُستانی نے یہ سمجھایا تھا کہ کوارتیے لاتاں میں زیادہ تر اجنبی بستے ہیں، برابر
"گلِ سُرخ" میری پاول کا پیچھا کر رہا تھا۔ مگر اور بھی کئی لڑکے بار بار اس سے میری کو
چھین رہے تھے۔ اس نے ایک بار نعیم سے اس کی امریکن دوست ایلس کو چھینا
اس کا بدلہ لینے کے لئے نعیم نے "گلِ سُرخ" کو اس سے چھینا۔ نہ صرف چھینا بلکہ
"گلِ سُرخ" سے کہا بھی کہ میں آپ سے ایک زمانے سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنا تعارف
کرایا۔ اتنے میں وہ چھن گئی۔ نعیم کو پھر اپنی ایلس مل گئی۔ جب وہ دوبارہ چھنی تو اس نے
سُرخ بالوں والے اسکاچستانی سے گلِ سُرخ کو پھر چھینا اور محض اسکاچستانی کو جلانے
کے لئے جو پیچھے کسی اور کے ساتھ ناچتا آرہا تھا کہا "آپ سے پھر ملنے کی کوئی

صورت ہو سکتی ہے؟"

میری نے کہا "ضرور!"

اس نے کہا "یہیں آنسٹی ٹیوٹ میں چائے پیا کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں وہاں سے بہتر چائے پیرس بھر میں اور کہیں نہیں ملتی، اگر آپ کو کل فرصت ہو تو پانچ بجے یہیں ساتھ چائے پئیں؟" اتنے میں سُرخ بالوں والے وحشی اسکاچستانی نے اس کے شانے کو ٹھوکا دے کے پھر گویا بُرٹ کو چھین لیا۔

لیکن جھنجھتے ہوئے میری نے کہا "ضرور!"

اس کے بعد نعیم ایلس ہی کے ساتھ ناچتا رہا۔ ناچ کے خاتمہ پر اس کو ساتھ لے کے مولاں روژ گیا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے ٹیکسی میں خوب بوس و کنار ہوا۔ مگر جب ایلس نے ضد کی کہ وہ سیدھی اپنے بورڈنگ ہاؤس جائے گی تو نعیم اس کو وہاں پہنچا کے پیچ و تاب کھاتا ہوا اکیلا اپنے کمرے کو واپس لوٹا۔

اس رات اس نے اپنی زندگی میں خلا محسوس کیا۔ خلا اور بڑی ہی سخت تنہائی۔ ایسی تنہائی جو کبھی کبھی برسات کی راتوں میں حیدرآباد میں محسوس کیا کرتا تھا۔ یہاں تنہائی کی شدت زیادہ تھی۔ پیرس کے جگمگاتے ہوئے انسانی جنگل میں وہ اکیلا تھا۔ اکیلا اور بالکل اکیلا۔ اگر ایلس آ جاتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ بجز آخری بات کے وہ اس کے ساتھ اور سب کچھ تو کر ہی چکا تھا۔ مگر یہ متوسط طبقے کی تربیت، خدا اس سے بچائے۔ اور طرہ یہ ہے کہ امریکن لڑکیاں بڑی روشن خیال سمجھی جاتی ہیں۔

تنہائی، تنہائی، تنہائی۔ دو گھنٹے تک نیند نہ آئی۔ بالآخر وہ اٹھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس نے کپڑے

پہنے۔ وہی کپڑے جو تھوڑی دیر پہلے اتارے تھے۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ نیچے اُترا۔ ہوا بہت سرد ہو گئی تھی اور آسمان پر بارش کے آثار تھے۔ ٹیکسی کے اڈے پر پہنچ کے اس نے آہستہ سے کہا: "اسقالکس" کیونکہ پیرس کے قحبہ خانوں میں صرف اسی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہاں بیماریوں کا زیادہ اندیشہ نہیں اور یہاں کی چند لڑکیاں اسے پسند تھیں۔ شوفر نے کہا: "وی مسیو" اور انجن اسٹارٹ کیا۔

جب وہ قحبہ خانے سے واپس ہوا تو اسے نیند آ رہی تھی اور بلقیس یاد آ رہی تھی۔

چھٹا باب

انتظار

پانچ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس کے زیادہ تر ساتھی اور ہم جماعت چائے پی کے رخصت ہو چکے تھے۔ بہت سے ابھی تک اپنی میزوں کے پاس بیٹھے یا تو ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے، یا اخبارات اور رسائل پڑھ رہے تھے نعیم نے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک میز کے قریب دو فرانسیسی لڑکیاں جو مریل اور دق زدہ معلوم ہوتی تھیں ایک مخبوط الحواس قسم کے انگریز طالب علم سے باتیں کر رہی تھیں ایک میز پر جنوبی افریقہ کی وہ حسینہ تھی جس کو نعیم کی صورت سے محض اس لئے نفرت تھی کہ جنوبی افریقہ کے سفید باشندے تمام رنگ والی نسلوں کے باشندوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور اس حسینہ کو یہ بہت ناگوار گذرتا تھا کہ پیرس میں یہ بات نہیں۔ وہی یہودی انگریز اس حسینہ کے دائیں آج بھی بیٹھا ہوا تھا جو پہلے ہی دن سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک میز

کے گرد چار انگریز نوجوان زور زور سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے۔ یہ چاروں کیمبرج کے طالب علم تھے۔ ان میں سے ایک بہت بلند و بالا اور خوبصورت تھا۔

ان چاروں کو سر کے اشارے سے سلام کر کے اور مسکرا کے ان کی "ہلو" کا جواب دیتا ہوا نعیم پاس ہی ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گیا اور اخبارات کے اس ڈھیر کو اُلٹنے پلٹنے لگا جو میز پر تھا۔ ٹائمز کا اڈیٹوریل پڑھا۔ کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج کے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ "گلِ سُرخ" ابھی تک نہیں آئی تھی۔

کہیں وہ بھول تو نہیں گئی؟ مگر ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ پھر فرانس میں وقت کی پابندی کا اتنا لحاظ رکھنا جتنا انگلستان میں رکھا جاتا ہے ستم ہے۔ آتی ہو گی۔ نعیم نے "ٹائمز" کے ایک گوشے میں ہندوستان کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔ پھر سوچنے لگا کہ برطانوی پبلک ہندوستانی معاملات کے متعلق کس قدر تاریکی میں رکھی جاتی ہے۔

یکایک ہندوستان کے متعلق خبریں پڑھنے کو اس کا جی چاہنے لگا اور پھر یہ خیال آیا کہ ہندوستان میں اسے ہندوستان کی سیاسیات اور ہندوستانی خبریں پڑھنے سے کیسی اُلجھن معلوم ہوتی تھی۔ جہاں صبح کی امید ہی نہ ہو، وہاں رات کو بار بار گھڑی دیکھنے سے کیا حاصل۔ اس نے کلائی پر پھر نظر ڈالی۔ پانچ بج کے دس منٹ ہو چکے تھے۔ میری پاول ابھی تک نہیں آئی۔ بھول گئی؟ یا اسے وقت کا خیال نہیں رہا؟ یا ٹال گئی؟ پھر آنے کا وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دونوں مریل فرانسیسی لڑکیاں اٹھیں اور مخبوط الحواس انگریز طالب علم سے رخصت ہو گئیں۔ انگریز طالب علم اُٹھ کے اخبارات دیکھنے لگا اور پھر خود بھی چل دیا۔

نعیم کو چائے پینے کی بڑی خواہش معلوم ہوئی۔ ساڑھے پانچ بجے چائے بند ہو جائے گی۔ میری پاول کو اچھی طرح معلوم ہے۔ پھر وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ نہیں آنا تھا تو

وعدہ کیوں کیا؟ نعیم کو یاد آیا کہ کتنی بار ایسا ہوا ہے، لندن میں تین دو نمبرل کے اسٹیشنوں پر اس نے ان دو کانوں میں کام کرنے والی لڑکیوں کا انتظار کیا جن سے وہ ہیرا سمتھ پیلیس یا کسی اور ناچ گھر میں ملا تھا اور ان میں سے کئی ایک نے دھوکا دیا۔ یا پیرس ہی میں ایک نائٹ کلب والی لڑکی سے نو بجے لا شوورس میں ملنے کا وعدہ کیا اور نہیں آئی۔ سلا شوورس کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ اس نے ہرورش سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ کل کس طرح سے اس کی ملاقات ہوئی اور اسے آج چائے پر بلایا ہے۔ ہرشتا کو عورتوں سے اس قدر کم دلچسپی کیوں ہے؟

اسی طرح ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا گیا۔ بیچ بیچ میں انتظار کا احساس یوں دخل دیتا جیسے گھڑی کا گھنٹہ مقررہ وقت پر ٹن ٹن بجتا ہے۔ یہاں تک کہ ساڑھے پانچ بجنے لگے۔ چائے کا وقت ختم ہونے کو آیا۔ نعیم نے دو آدمیوں کے لئے چائے کا ٹکٹ دے کے کستی ابنز ہیر رنگرائی اب بھی مبری پاول کے آنے کی محض موہوم سی امید باقی تھی۔

کیمبرج کے چاروں نوجوان بھی اٹھ کے چل دیئے۔ اب نعیم کمرے میں اکیلا تھا۔ وہ انڈیل کے چائے بنانے لگا کہ خود ہی پی لے تاکہ چائے بالکل ٹھنڈی نہ ہو جائے۔ اتنے میں زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ سنائی دینے لگی۔ نعیم بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر کسی وجہ کے اس کا قلب دھڑکنے لگا۔ لیکن بہت جلد اس آواز ہی نے اپنی ولائی ہوئی امید کی تردید کی۔ یہ کسی زنانہ جوتے کی کھٹ کھٹ نہ تھی۔ نعیم پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا

چند ہی ثانیے کے بعد ایک نوجوان بڑی عمدہ پوشاک پہنے، کمرے میں داخل ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نعیم نے اسے پہلی مرتبہ آج دیکھا تھا۔ اس کے قد اور اس کی

چال سے، بلکہ اس کے لباس سے صاف عیاں تھا کہ وہ فرانسیسی نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے بال بالکل سیاہ تھے۔

وہ اِدھر اُدھر میزوں پر اخبارات اُلٹتا پلٹتا رہا۔ پھر "ٹائمز" کو نعیم کی میز پر دیکھ کے ذرا ٹھٹکا۔ بالآخر اس کے پاس آکے معذرت کے لہجے میں پوچھنے لگا "اگر آپ ٹائمز پڑھ چکے ہیں تو میں لے سکتا ہوں؟"

نعیم نے کہا "ہاں۔ ضرور!"

اس نے نعیم کی طرف ایک بار ذرا دیکھا اور پھر اخبار میں مشغول ہو گیا۔

اور دو ایک منٹ کے بعد اخبار کو تہ کرکے اس نے میز پر رکھا اور کہا "کوئی خاص بات نہیں . اگر آپ اسے تجسس نہ سمجھیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہندوستانی ہیں؟"

"ہاں!"

"میرا نام کراکسلے ہے جیمز کراکسلے۔ میرے والد ہندوستان میں صوبہ ——— میں چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ میں بھی وہیں پیدا ہوا تھا"

"بڑی خوشی ہوئی" نعیم نے اٹھ کے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میرا نام نعیم حسن ہے۔ آپ چائے پیجئے گا .. یہاں کی چائے میرے خیال میں پیرس بھر میں اچھی ہوتی ہے"

کراکسلے نے کہا "جی ہاں! میں فرانس میں کافی پیتے پیتے اکتا گیا ہوں" یہ کہہ کے وہ ہنسا اور نعیم نے چائے بناتے ہوئے اس کا ساتھ دیا۔ شکر کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا "کتنے؟"

کراکسلے نے کہا "دو! شکریہ!"

کرا کسلے جواب ایک کرسی پر نعیم کے پاس بیٹھ گیا تھا کہنے لگا یہ یہ مقام تو اچھا خاصا معلوم ہوتا ہے پہلے میں نے ارادہ کیا کہ شہر جامعہ (سٹی یونیورسٹی) میں جا کے رہوں۔ پھر میں نے طے کیا کہ تمام تعلیمی روایات پیرس میں حلقۂ لاطینی ہی سے وابستہ ہیں یونیورسٹی یہیں ہے۔ اس لئے یہیں آ گیا۔

نعیم نے کہا "میں نے آپ کو اس سے پہلے یہاں نہیں دیکھا"

کرا کسلے نے کہا "میں کل پیرس پہنچا۔ میں گرے نوبل سے آ رہا ہوں۔ وہاں میں نے تعطیلات میں فرانسیسی کا کورس شروع کیا تھا۔ مگر اب یہاں اس ارادے سے آیا ہوں کہ تکمیل یہاں کروں۔ اس آسٹنی ہوسٹ میں شریک ہو گیا ہوں"

نعیم نے اس آسٹنی ہوسٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کلب کی سی زندگی ہے۔ چند ہی منٹ کے اندر دونوں نوجوانوں کے درمیان سے اجنبیت کا حجاب اٹھ گیا وہ اس طرح باتیں کرنے لگے گویا ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔

کرا کسلے کا لہجہ پبلک اسکول کا خالص ترین اور بہترین انگریزی لہجہ تھا۔ اس کی وضع قطع اور چال ڈھال سے خاندان اور تعلیم کی بلندی کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ قومی اور نسلی جھجک جو انگریزوں کو غیر ملکیوں اور غیر یورپینوں سے اس عمر میں ہوتی ہے اسے بالکل نہ تھی۔ اظہار خیال سے نہیں بلکہ بات چیت کے انداز ہی سے یہ ظاہر تھا کہ اسے دوسرے ملکوں سے نہ صرف یہ کہ تعصب نہیں ہے بلکہ اس طرح کی دلچسپی ہے جیسے اپنے ہم وطنوں سے۔

چھ بجے نعیم نے اجازت چاہی۔ ساڑھے آٹھ بجے اسے پولا روزا ماریاں سے ایلیس کو ساتھ لے کے تھیٹر جانا تھا۔ اس نے کرا کسلے سے کہا کہ کل ملاقات ہوگی۔

کرا کسلے نے کہا۔ میں کھانے کے بعد ایک لڑکی کو ساتھ لے کے "دوم" (قہوہ خانے)

جاؤں گا ۔ اگر نعیم کو فرصت ہو تو وہ بھی وہاں آجائے ۔ اس پر نعیم نے کہا ۔ میں ایک امریکن نوجوان خاتون کے ساتھ کامیڈی فرانسیز جارہا ہوں ۔ وہاں سے واپسی پر اگر اس کا بھی جی چاہا تو دوم آجاؤں گا ۔ مگر وعدہ نہیں کر سکتا ۔"

نعیم کو توقع نہ تھی کہ ہروشا ابھی تک اپنے کمرے میں ہوگا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ سات بجے تک وہ واپس آجائے گا ۔ کیونکہ دونوں نے سات بجے ایک یونانی ریستوران میں کھانا ساتھ کھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب نعیم میری پاول کے نہ آنے سے آزردہ اور لراکسلے کی ملاقات سے خوش گھر پہنچا تو سڑک ہی پر سے اس نے ہروشا کو اپنی کھڑکی کے اس آرام کرسی پر لیٹے ہوئے پڑھتے دیکھا ۔

نعیم سیدھا ہروشا کے کمرے میں پہنچا ۔ اپنی ٹوپی اس کے بستر پر پھینکی "تمہاری لِ سُرخ نے دھوکا دیا ۔ مجھ سے آنے کا وعدہ کیا اور گھنٹہ بھر انتظار کرایا ۔" یونیورسٹی کے ماحول کی اشتراکیت اور اشتمالیت کی اس نے خبر لینی شروع کی ۔ یہ بھی ایک ذہنی فیشن ہے ۔ ایک طرح کا ذہنی نذ تنغ ہے ۔ ظاہر ہے کہ اگر اسے نعیم سے اور ہندوستانیوں سے تعصب نہ ہوتا تو وہ اس طرح دھوکا نہ دیتی ۔

ہروشا نے اس کے تمام اعتراضات کو احساسِ کمتری پر محمول کیا ۔

پھر نعیم نے اپنی مصیبت کی دوسری کہانی سُنائی ۔ کل رات ایلیس نے . . . . .

. زیادہ . . . . . اجازت نہیں دی ۔ ابتدائی کارروائیوں کو شروع ہوئے ہفتے گئے مگر قلعہ کسی طرح سر ہی نہیں ہونے پاتا ۔ کل پھر وہ ضد کر کے ' اپنے . ڈنگ ہاؤس چلی گئی تھی ۔ آج کامیڈی فرانسیز چل رہی تھی ۔ مگر آج بھی کامیابی کی امید ہی تھی ۔

ہروشا نے کہا : "متوسط طبقے کی لڑکیوں کی ماب مقاومت توڑنے کو صبر چاہئے۔ غریب اور مزدور طبقوں کی لڑکیوں میں عصمت کی استطاعت ہی نہیں ہوتی۔ متوسط طبقے کی لڑکیوں میں عصمت کی استطاعت ہوتی ہے اور امیر طبقے کی لڑکیوں میں سب سے کم عصمت کی استطاعت ہوتی ہے۔"

(ہروشا کی زبان سے ایسے مرصع جملے بہت کم نکلا کرتے تھے)

"اب رہی نفسیاتی فتح۔ سو میرے خیال میں ہر عورت فتح کی جا سکتی ہے۔ چاہے اسے کسی اور ہی سے محبت کیوں نہ ہو۔ عورت فطرتاً مجہول اور منفعل ہے مگر فتح کے لئے ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔"

عورت کے متعلق اس طرح کی حقارت آمیز رائیں ہروشا اس سے پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا۔ نعیم نے طنز سے دلچسپی کے ساتھ کہا "یہ برٹرنی لسند انستالی کی رائے ہے؟"

"یہ ریونک ہروشا کی رائے ہے!"

عورت کے مساوی حقوق کے متعلق بھی ہروشا کو انستالی نظریوں سے بنیادی اختلاف تھا۔

لیکن اسی درمیان میں نعیم دل ہی دل میں غالب کے اس شعر کا مزا لے رہا تھا ؎

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں! شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہئے

افسوس تو یہ تھا کہ غالب کا ترجمہ ناممکن تھا ورنہ وہ ہروشا کو سناتا۔ پھر نعیم نے کرسلے کا ذکر کیا اور رات کو دومم میں اس کے بلاوے کا بھی ذکر کیا۔ ہروشا نے کہا "فرصت ہوئی تو میں بھی دومم جاؤں گا۔ میرے خیال میں اچھا تو یہ ہے کہ تم بھی اپنی امریکن دوست کو جلدی سے دوست کر کے آجاؤ۔ ہاں اگر تم خود بھی اس کے ساتھ دفن ہو جانے میں کامیاب ہو جاؤ تو دوسری بات ہے لیکن فی الحال اس کی امید کم ہے۔"

نعیم نے کہا "تم آؤ گے تو میں ضرور آؤں گا۔ اگر ایلس آئی تو اسے بھی ساتھ لیتا آؤں گا ورنہ اسے بورڈنگ ہاؤس پہنچا کے آجاؤں گا۔ چلو اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

(۲)

ٹولڈا روزا مالیاں میں جس امریکن گھرانے میں ایلس چائے کے لئے مدعو تھی وہاں نعیم اس سے پہلے بھی جا چکا تھا۔ ایلس کو جب وہ اس گھر سے اپنے ساتھ سڑک پر لایا تو پوچھا "اگر بھوک لگی ہو تو کچھ کھا لو، ابھی وقت ہے۔"

ایلس نے انکار سے سر ہلایا۔ ایک گہری سانس لی۔ تھکاوٹ کا اظہار کیا اور کہا کہ چائے کے ساتھ بہت کھا گئی۔ تم نے کچھ کھایا؟"

"ہاں میں ہروشا کے ساتھ کھانا کھا چکا۔"

زمین دوز ریل میں نعیم نے ایلس کا ہاتھ پکڑا۔ پہلے درجے میں بہت تھوڑے لوگ تھے اور بہت دور دور بیٹھے تھے۔ چند ثانیوں کے بعد نعیم نے ایلس کی انگلیوں کی جراتی گرفت محسوس کی۔

(۳)

کامبڈی فرانسیز سے واپس ہوتے ہوئے نعیم نے کرا کسلے کا ذکر کیا "تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ طبیعت چاہے تو تم بھی دو دم چلی چلو۔ وہیں کچھ کھا لیں گے۔ نہیں تو میں تمہیں بورڈنگ ہاؤس تک چھوڑ آؤں۔ جو تم کہو۔"

ایلس نے مسکرا کے کہا کہ میں بھی چلوں گی۔ زمین دوز ریلوے کے سٹیشن کی سرنگ میں نعیم نے ایلس کا ایک طویل بوسہ لیا۔ اس کے ہونٹ خشک اور گرم تھے۔ نعیم نے خیال کیا کہ اسے بھوک لگ رہی ہو گی۔ ایلس نے اس کے بازو میں اپنا ہاتھ حمائل کیا اور

اس کے سہارے چلنے لگی۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے دونوں پھر رُک کے پھر ایک طویل بوسہ لیا۔ ایک حلد باز فرانسیسی ان کے قریب سے گذر گیا اور نعیم کو ذرا سا دھکا لگا۔ فرانسیسی نے جاتے ہوئے مڑ کے کہا " معاف کیجئے۔ موسیو!"

اور زمین دوز ریل میں موں پرناس جاتے ہوئے نعیم نے ایلس کی طرف دیکھا جو اس کے کاندھے کا سہارا لگائے آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔ اس کے بال پیلے پیلے اور ریشم کی طرح نرم سے تھے مگر ان میں سنہری چمک نہ تھی۔ اس کا چہرہ گول گول تھا۔ نعیم کو ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ امریکن لڑکیوں کی صورتیں ایک دوسرے سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ ان کا بناؤ سنگار یکساں ہے۔ گول چہروں والی تمام لڑکیاں گول چہروں والی سنیما ایکٹرسوں سے اس قدر مشابہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مصنوعی رنگ اور روغن کی اتنی موٹی تہہ۔ مگر نعیم کو یہ مصنوعی رنگ اور روغن پسند تھا۔ یہ لڑکیاں اس اعلیٰ ترین امریکی رنگ و روغن میں گڑیوں کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔

کوئی مہینہ بھر پہلے اس نے ایلس کو پہلی بار دیکھا تھا۔ جس دن فرانسیسی کلاس شروع ہونے والی تھی، پرنسپل کے کمرے کے باہر وہ بھی کھڑی تھی اور نعیم بھی۔ نعیم نے اسے امریکن لہجہ میں فرانسیسی میں پرنسپل کے سکرٹری سے یہ پوچھتے ہوئے سنا " کیا وہ بہت مصروف ہیں؟" اور پھر نعیم نے جرأت کرکے اس سے بات کی۔ ہر نئے مکتب میں پہلا دن بڑا اجنبی ہوتا ہے۔ اس دن اگر کسی ہم جماعت لڑکی کو گانٹھ لیا جائے تو کام مقابلتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اس دن سے نعیم اور ایلس میں صاحب سلامت اور بہت جلد اچھی خاصی دوستی شروع ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ دوستی انتہائی سطحی قسم کی تھی۔ اس دوستی کی بنیاد محض یہ امر تھا کہ دونوں کا تعلق متضاد جنسوں سے تھا۔ دونوں ایسے ملکوں

ستے ہیں ۔ یہ ایک دوسرے کے لئے ضدین کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ دونوں کے مذاق ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن پیرس کی تنہائی نے دونوں کو دوست بنا دیا تھا۔

تیسرے چوتھے روز ہی بوس و کنار شروع ہو گیا تھا۔ بہت سے ہم جماعت لڑکوں نے نعیم کی رقابت کی کوشش کی۔ مگر سب کو شکست ہوئی۔ ایلیس وقتِ واحد میں ایک سے زیادہ نوجوان دوست کی نہ ضرورت سمجھتی تھی، نہ خواہاں تھی اور نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا۔ نعیم کی طبیعت میں اسے جو چیز پسند تھی اسے وہ فرانسیسی لفظ "سمپتاب" کہہ کے ادا کرتی تھی جس میں ہم درد، ہم مشرب اور ہم خیال تینوں کے معنی پوشیدہ ہیں۔ پیرس کی تنہائی میں اس سے زیادہ کی نہ اسے خواہش تھی نہ ضرورت۔

اس کے والد سنشائی میں ایک بڑی جوہری فرم کے ڈائریکٹر تھے، اور اسے کافی جیب خرچ ملا کرتا تھا۔ اس کا اصول شروع شروع میں یہی تھا کہ نعیم کے ساتھ وہ جہاں کہیں بھی جائے دونوں نصف نصف خرچ کریں۔ جب بوس و کنار کے سلسلے کی وجہ سے اجنبیت مٹنے لگی تو وہ نعیم ہی کو خرچ کرنے دیتی۔ لیکن یہ بوس و کنار کی قیمت نہ تھی اور ایک عجیب نا محسوس طریقے سے یہ امر اس نے نعیم کو محسوس بھی کرا دیا تھا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ نعیم کے پاس نقد کچھ نہ ہوتا تو وہ بے تکلف ایلیس کا بٹوا کھول کے جتنا لینا ہوتا نکال لیتا اور ایلیس گھر پہنچ کے نعیم کے انتہائی اصرار کے باوجود کبھی پیسے واپس نہ لیتی۔ بالآخر نعیم نے اس قسم کا اصرار بھی چھوڑ دیا۔

دوستوں کی طرح ان کا شعور اور ان کی محسوس اور غیر محسوس نفسیاتی کیفیتیں ایک دوسرے کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اور دونوں کی دوستی میں خلوص تھا۔ لیکن اس دوستی کا جنسی پہلو ابھی بہت تشنہ تھا۔ ایلیس سینکڑوں بار کہہ چکی تھی "میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر

مجھے تم سے محبت ہے لیکن اسے کسی طرح بھی اس سے عشق نہ ہوا۔ اس کی رفتار گفتار، وضع و باش اس کی نہیں۔ اس کے بات بات نعیم کو اچھے معلوم ہوتے مگر دل و لبھا کا دلبا سر ورتا جیسی تعلقات بھی تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ بوس و کنار سے شروعات تھا۔ لیکن نعیم کی دست درازی دیکھ بھال سے آگے بڑھنے نہ پاتی۔ وہ ایک بار جب نعیم نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تو وہ اس قدر بگڑ گئی کہ نعیم کو ہٹ جانا پڑا۔

اس بے تکلفی کی وجہ سے نعیم بہت بے چین ہو جاتا۔ بعض وقت وہ یہ سوچنے لگتا کہ ایلس کا پیچھا چھوڑ دے اور کوئی اور ایسی لڑکی تلاش کرے جس سے اس کی ملاقات سیاہ و آسان ہو۔ لیکن ایلس سے اس کی دوستی میں کچھ ایسی انسانی خصوصیت تھی، کچھ ایسا خلوص اور کچھ ایسی ہمدردی تھی کہ وہ اسے چھوڑ نہ سکا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک وہ پیرس سے آکسفورڈ واپس نہ چلا جائے اور وہاں وہ ان اس دوستی اور ہمدردی کا رشتہ آہستہ آہستہ منقطع نہ کر دیں۔

اس وقت جب ایلس اس کے کندھے کا سہارا لگائے اونگھ رہی تھی، اسے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی اور اس کے دل سے ہمدردی کی ایک لہر اٹھی اور ایلس کے پیلے پیلے بالوں تک پہنچ گئی۔

اتنے میں مونپرناس آگیا۔

(۴)

دوم میں کراکسے اپنی میز سے اُٹھ کے نعیم کو بلانے دروازے کی طرف آیا۔ نعیم اسے اِدھر اُدھر ڈھونڈھ رہا تھا۔ نعیم نے ایلس کا تعارف کرایا اور دیر ہو جانے کی معافی چاہی۔ اپنی میز پر واپس پہنچ کے کراکسے نے اپنی ساتھی کا تعارف کرایا "یہ مارگریٹ ہے۔ میری بہن۔" پھر نعیم کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کے اس نے کہا "مارگریٹ کا اصرار تھا کہ پیرس کی اندرونی زندگی دیکھے۔ ایک نوجوان شریف لڑکی کو ساتھ لے کے، جو میری بہن ہے، میں پیرس کی اندرونی دنیا میں دوم یا کسی اور کیفے سے زیادہ نیچے نہیں اُتر سکتا تھا۔ مارگریٹ کی عمر ابھی سولہ سال کی ہے اور اس کی دو خواہشیں ہیں۔ ایک تو امریکہ جانے کی اور دوسری دربار میں پیش ہونے کی۔ ابھی دونوں کے لئے وہ بہت کم عمر ہے۔"

مارگریٹ نے مسکرا کے دونوں کا خیر مقدم کیا۔ ساتھ ہی اس کے گالوں پر شرم و حجاب کی وہ سُرخی دوڑ گئی جو بچپن کے ختم اور جوانی کے آغاز کی نشانی تھی۔

ایلس کے لئے اُبالے ہوئے انڈے، سینڈوچ، کچھ کیک، سیاہ کافی اور اسی قسم کی چیزیں منگوائی گئیں۔ مارگریٹ کے لئے صرف کافی۔

مارگریٹ نے ایلس سے پوچھا "آپ امریکہ کے کس حصّے کی رہنے والی ہیں؟"

ایلس نے مسکرا کے جواب دیا "سنسناٹی۔"

"کیا اچھا نام ہے..... مجھے امریکہ دیکھنے کی اتنی تمنا ہے..... اتنی تمنا ہے......"

دونوں کو اس طرح آپس میں شیر و شکر ہوتے دیکھ کے نعیم اطمینان سے مسکرایا

اور کراکسلے سے باتیں کرنے لگا۔ اس سے سروشا کا ذکر کیا اور کہا کہ اس نے اسے بھی وہاں بلایا ہے۔ کراکسلے نے کہا "یہ بہت اچھا ہوگا۔" دونوں نے آہستہ آہستہ اپنے گلاس خالی کرنے شروع کیے۔ کراکسلے نے گرینویل میں طلبا کی زندگی کے قصے سنائے۔ وہاں انہیں ایک جرمن جلا وطن خاندان سے ملاقات کا ذکر کیا۔ پھر جرمنی پر بحث شروع ہوئی۔ کراکسلے کے لہجے میں ایک طرح کا شریفانہ غصہ تھا۔ محض سیاست کے طول پکڑ جانے کے لیے نعیم نے بھی بحث شروع کی۔ "یہ آپ کے جیب کی جماعتیں، یہ آپ کے سوشل ڈیموکریٹ، یہ سوشلسٹ، کمیونسٹ، باتیں کرتے، جلوس نکالتے، بحثیں کرنے میں اتنا جواب نہیں رکھتے کہ جب کام کا وقت آتا ہے تو فاشسٹ یا نازی ہی پہلے ہاتھ مارتا ہے۔ اٹلی میں یہی ہوا، انگلستان میں یہی ہوا، جرمنی میں یہی ہوا۔"

دونوں اس بحث میں مصروف تھے۔ ادھر ایلس اور مارگرٹ تھوڑا تھوڑا سے وقفے کے بعد ہندوستانی چیزوں کے متعلق گفتگو میں مصروف ہو جاتیں۔ اتنے میں مارگرٹ نے اپنے بھائی کو کاندھے سے ہلا کے اشارے سے کچھ بتایا۔

یہ ایک مصور تھا۔ خاکہ ہنگری یا شاید پولینڈ کا۔ بہرحال خدوخال وسط یورپ کے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے مارگرٹ کی تصویر پنسل سے کھینچ رہا تھا۔ وہ بار بار اس کی طرف دیکھتا۔ پھر پنسل تیزی سے کاغذ پر چلنے لگتی۔ مارگرٹ اور اس کے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کے وہ سر کا اشارہ کر کے مسکرا دیا۔ کراکسلے اور نعیم جواب میں مسکرائے۔

"یہ کون ہوگا؟"

"سفید عورتوں اور غلاموں کی تجارت کرنے والا۔" ایلس نے ہنس کے کہا۔

(

"مجھے یقین ہے تمہاری تصویر وہ اس لئے بنا رہا ہے کہ اپنے سردار کو دکھا کے پسند کرائے۔ اس لئے اس نے اس پُراسرار مشرقی رنیم کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے یہاں مقرر کیا ہے کہ وہ ہمارے سائے بعید کا دم کرلے....... میری پیاری بچی مجھے تو بڑا ڈر معلوم ہو رہا ہے کہ تم چھ ماہ بعد بیونس ایریس پہنچ جاؤ گی"

سب ہنس رہے تھے۔ نعیم نے کہا بھی" ایلس۔ چپ رہو"

مگر مارگرٹ نے ایلس کی کہانی میں اضافہ شروع کیا" تب تم مجھ سے ملنے اور مجھے چھڑانے اس ہوائی جہاز میں اڑ کے آنا جس کا بڑا اچھا سا نام ہے......"

"کلپر" ایلس نے مدد دینے کے لئے کہا۔

مارگرٹ نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا" ہاں کلپر۔ اور تم بھیس بدل کے آنا۔ سُرخ ہندوستانی لباس میں سر پہ پروں کا تاج پہن کے اور اپنے لے۔ ڈی سی رنعیم کی طرف اشارہ کر کے) کو لے آنا۔ اگر بدقسمتی سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مجرموں اور اور غلام فروشوں کے دلال ہیں تو میری قیمت ان کے ذریعے طے کرا کے چھڑا لینا۔"

جیمز کرا کسلے نے اپنی بہن سے کہا" بس کرو مارگرٹ۔ مجھے یقین ہے یہ پکاسو ہوگا۔"

نعیم نے کہا" چالیس سال پہلے شاید پکاسو کی یہ عمر ہوتی"۔

کرا کسلے نے کہا" ہاں مگر پکاسو کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ایک کیفے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا تو پیچھے ایک میز پر ایک ریاضی دان کچھ اشکال بنا رہا تھا۔ پکاسو نے کہا" خوب!" اور یہ تعریف ریاضی کے نقطۂ نظر سے نہیں کی گئی تھی۔ یہ ہندسانہ مصوری کی ابتدا تھی۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ نوجوان مصور

—— جو یقیناً بڑا ہنر مند ہے —— کس اسلوب مصوری سے میری ننھی سی بہن کو زندۂ جاوید کر دینا چاہتا ہے —— مہندسانہ مصوری یا کلاسکی یا رومانی یا اثر پرستانہ یا ورائے حقیقی یا باطنی —— یا یہ تو خیر صناع کسی نئے مکتب مصوری کا بانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہر حال مسٹر حسن آپ بھی سے اتفاق فرمائیں کہ ان حالات میں تحقیق کرنا میرا فرض ہے"۔

"یقیناً" ۔ یقیناً"۔

کرا کسلے نے باآواز بلند مقابل کی میز پر اس مصور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔ جو بڑی تن دہی سے پنسل کو کاغذ پر گھس رہا تھا "مسیو"۔

مصور نے انگریزی میں جواب دیا "جی مسیو"۔

کرا کسلے نے کہا "ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں ۔ حالانکہ اس دعوی پر ہمیں اصرار نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

مصور نے وسطی یورپ کے لہجے میں جو غالباً اہل ہنگری کا انگریزی لہجہ تھا کہا "دیکھتے ہوئے کہ مسیو انگریز ہیں آپ کے اس قدر انکسار پر مجھے بڑی حیرت اور تعجب ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ فرمائیے"۔

کرا کسلے نے جو اپنی تقریر کے منقطع ہو جانے پر بے صبر ہو رہا تھا ۔ پھر سے کہا ۔ "درست ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درست ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں اور یہ نوجوان خاتون جس کو آپ بقائے دوام عطا کر رہے ہیں بے وفا البین رانگلستان) کے رہنے والے ہیں ۔ یہ خاتون اس ملک کی رہنے والی ہیں جس نے نیویارک کے سامنے آزادی کا مجسمہ بنا کے میرے بے وفا وطن سے بے وفائی کی ۔ اور یہ صاحب اس ملک کے رہنے والے ہیں

جو لمبئی کے سامنے آزادی کا مجسمہ بنا کے مہرے بے وفا وطن سے بے وفائی کرنا چاہتا ہے، اور اب تک کر بھی چکا ہوتا۔ مگر ہم لوگوں کو دوسروں کی بے وفائی پسند نہیں.... . یہ تو سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ہنر سے ہم کو شاید ہمیشہ دلچسپی رہے گی، اور آپ جو تصویر بنا رہے ہیں اس سے فی الوقت ہمیں اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں.... کیا آپ ہماری میز پر ساتھ شریک ہو سکتے ہیں؟"

"ضرور مسیو۔ ضرور۔ شکریہ شکریہ!"

اور مارگرٹ دل میں سوچ رہی تھی کہ والدہ کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں رات کے ایک بجے ایک سانولے رنگ کے ہندوستانی، ایک بھٹکی ہوئی امریکن لڑکی اور ایک اوباش مصوّر کے ساتھ یہاں بیٹھی ہوں تو وہ مجھ پر اور جیمز پر کتنا بگڑیں۔ اور ان کی خفگی کا خیال کر کے وہ دل میں ذرا خوش ہوئی، کیونکہ اس کی اطلاع والدہ کو کبھی نہ ہونے پائے گی۔

مصوّر کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور گال پچکے ہوئے۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس کے کپڑے مَیلے اور پُرانے تھے جس سے اس کی فلاکت کا پتہ چلتا تھا۔

نعیم نے کہا "آپ انگریزی تو بہت اچھی بولتے ہیں۔"

"بے وفا البین میں مَیں نے دو سال گزارے ہیں۔" یہ کہہ کے مصوّر نے بنائی ہوئی تصویر میز پر ڈال دی۔

یہ ایک معمولی سا پنسل اسکیچ تھا۔

کرامسلے کو یہ اسکیچ دیکھ کے ذرا مایوسی ہوئی، جو اس کے چہرے پر ظاہر تھی اور مصوّر جو ایک اعصابی کشمکش کے عالم میں اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا یہ دیکھ کے زور زور سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔

"فیتر.. یہ آپ کا نام ہے؟" کرامسلے نے اس کے دستخط دیکھ کے کہا۔

"ہاں معاف کیجئے۔ میں اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ اس قابلِ عزت بورژوا رسم کو ہم فاقہ مست پرولتاری اکثر بھول جاتے ہیں۔ میرا نام فیتر ہے۔ میں ٹرانسلوےنیا کا رہنے والا ہوں جو پہلے ہنگری میں تھا، اب رومانیا میں ہے۔ میں اس لئے نکلا کہ وہاں فوجی افسر گالوں پر سرخی لگاتے ہیں اور میرے خیال میں سُرخ رنگ کاغذ کے سوا اور کسی چیز پر اچھا نہیں لگتا؟"

"خصوصیت سے روس کے نقشے پر" نعیم نے کہا۔

"جی ہاں"

سب اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے جس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ یہاں تک کہ مارگرٹ جو اپنی تصویر دیکھنے کی سب سے زیادہ مشتاق تھی، اس کے چہرے پر بھی ناپسندی کی جھلک تھی۔

مایوس مصوّر نے کہا "میں جانتا ہوں کہ میں اپنے فن میں ناکام ہوں۔ اگر آپ کو کامیاب مصوّر دیکھنا ہو تو ادھر دیکھئے۔" یہ کہہ کے اس نے شیشے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک جاپانی لڑکا جس کی عمر مشکل سے بیس سال ہو گی کھڑکی کے اس طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی پیشانی شیشے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور اس کے کالے بال شیشے کے اس پار سے چمک رہے تھے

ایک لڑکی جو کسی اور کے ساتھ ایک میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہ شیشے کے اس پار سے اسے اپنی حرکات سے مخاطب کر رہا تھا اور لڑکی ہنس ہنس کے اشاروں سے اس کا جواب دے رہی تھی۔ پھر وہ لڑکی اٹھ کے باہر گئی اور اس جاپانی لڑکے کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اس کا ساتھی اس ... کا بڑا دوست معلوم ہوتا تھا۔

فیئر نے ان لوگوں سے کہا جو اتنی محویت سے اس جاپانی کو دیکھ رہے تھے "آپ کہیے تو میں "کوکو" کو یہاں لا کے آپ لوگوں سے ملا دوں؟"

کراکسلے نے کہا "یقیناً۔ شکریہ!"

فیئر جا کے نوجوان جاپانی مصور کو بلا لایا۔ وہ بڑے اطمینان اور خود اعتمادی سے مسکراتا ہوا آیا اور سب سے ہاتھ ملا کے ایک کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ اسے انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا اور فرانسیسی بھی ٹوٹی پھوٹی جانتا تھا۔

فیئر نہیں بیٹھا۔ کراکسلے نے بہت اصرار کیا کہ کچھ پی لے۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر کراکسلے نے یہ کہہ کر کہ "کم از کم اس تصویر کے شکریے میں جو آپ نے کھینچی ہے، یہ ناچیز ہدیہ تو لیجیے۔" سو سو فرانک کے دو نوٹ دیے۔ ہنگرین مصور نے شکریہ ادا کیا اور سب کو شب بخیر کہہ کے کیبے سے باہر چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ صورت سے بھوکا معلوم ہوتا تھا۔

جاپانی لڑکے کی خود اعتمادی پر نعیم کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ایلیس کو دیکھ کر کہا "ڈولی" (خوبصورت)، اشاروں میں کچھ باتیں کیں۔ مارگرٹ نے دل میں کہا "ایک اور ملاقاتی جو والدہ کے لئے بالکل ناقابلِ قبول ہوگا۔" ایلیس نے نعیم سے کہا "کیوٹ cute" یہ وہ امریکی لفظ ہے جس کا ترجمہ ناممکن ہے۔

جاپانی نوجوان فرانسیسی کے ٹوٹے پھوٹے جملوں اور اشاروں میں ان لڑکیوں سے باتیں
کرتا رہا۔ اس کرائسلے نے برف میں لگی ہوئی شاپمین منگوائی اور مارگرٹ نے بھی ہمت کر کے
آدھا گلاس بھر لیا کرائسلے نے نعیم سے کہا "اب تک تمہارے دوست نہیں آئے؟"

نعیم نے کہا "تعجب ہے!"

کرائسلے نے اپنی بہن سے کہا "میگ انہیں نیند تو نہیں آ رہی۔ یہ کافر جاپانی، انگریزی
نہیں جانتا خدا کا شکر ہے۔ تم جو بات چاہو کر سکتی ہو اور مسٹر حسن سلطنت برطانیہ کے باشندے
ہونے کی وجہ سے نیم مہذب ہیں۔ ان کے سامنے باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

مارگرٹ نے بھائی کو آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا "جم! یہ کیا بد اخلاقی ہے" اور
نعیم سے کہا "آپ جم کی باتوں کا خیال نہ کیجئے۔"

کرائسلے نے کہا "نعیمی جی! مسٹر حسن سے میں اتنا بے تکلف ہو گیا ہوں گویا ہم بچپن
کے دوست ہیں۔ وہ برا نہیں مانیں گے۔"

نعیم نے کہا "عجیب بات ہے۔ یہی میں نے بھی محسوس کیا گویا ہم بچپن کے دوست ہیں۔"

جاپانی مصور اشاروں سے اور ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں ایلس کو کچھ سمجھا رہا تھا اور وہ سرپرستی
کے انداز میں مسکرا رہی تھی اور "وی" "وی" (ہاں۔ ہاں) کہہ رہی تھی۔

اتنے میں ہیرو شادروازے کے قریب نمودار ہوا۔ اور اس کے ساتھ — جیسے مداری اپنے
ٹوکرے سے کوئی انتہائی غیر متوقع چیز نکالے — گل رخ، میری پارول تھی۔

۵

وہ اس طرح نہیں آئی جیسے کوئی شہزادی آتی ہے۔ حالانکہ اس کا حسن شہزادیوں کا
سا تھا۔ اس کی رفتار، اس کے لباس، اس کے بالوں کی تراش، ہر بات سے سادگی اور

بے پروائی ظاہر ہوتی تھی۔ سُرخی یا غازے کا نشان تک اس کے چہرے پر نہ تھا۔ اشتمالیت اور روئے زیبا دونوں غازے کی مدد سے بے نیاز ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس کی طرف دیکھا۔ دو تین نے نہایت اپنے ساتھیوں سے آہستہ سے کہا بھی "یہ خوبصورت؟"

سب سے پہلے نعیم اُٹھ کے کھڑا ہو گیا، اور پھر کرا کسلے۔ کرا کسلے نے بے تکلفی سے "ہلو۔ میری!" کہا۔ غالباً وہ بہت عرصے سے میری کو جانتا تھا۔ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کئی سال سے دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے میری باؤن نے نعیم اور ایلیس کو سلام کیا اور بے تکلفی سے مارگرٹ سے پوچھا کہ کیسی ہو۔ اور پھر اسی سادگی سے اس کرسی پر بیٹھ گئی جو اس کے لئے کرا کسلے نے بڑھائی تھی۔ اس کے بعد نعیم نے ہرد شا کا کرا کسلے، اس کی بہن اور جاپانی مصوّر سے تعارف کرایا۔

میری نے نعیم سے چائے پر نہ آنے کی معافی چاہی۔ "میں بالکل بھول گئی۔" ایلس کے چہرے پر ناراضی اور طنز کی خفیف سی جھلک نمودار ہو کے پھر غائب ہو گئی۔ اس نے سگرٹ نکالا نعیم نے جلایا۔ اس اثنا میں میری، کرا کسلے سے باتیں کر رہی تھی۔

ہرد شا: (نعیم سے) "کھیل کیسا تھا؟"

نعیم: "یونہی سا تھا۔ تم کیا کرتے رہے؟"

"میں طلبا کے اشتراکی کلب گیا ——— تمہارے ساتھ کھانا کھانے کے بعد ——— وہاں میری ملی۔ میں نے مسٹر کرا کسلے کا، اور تمہارا ذکر کیا۔ اور وہ یہاں ساتھ چلی آئی۔"

کرا کسلے: "چیکوسلواکیہ کے گلچیں بڑے غضب کے ہوتے ہیں۔ آدھی رات کو گل سُرخ کو ساتھ لانا انہی کا کام ہے۔"

ایلیس بھی اور سب کے ساتھ جھوٹ موٹ مسکرائی ۔

پھر اس نے نعیمہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ اس اثنا میں جاپانی آرٹسٹ یہ دیکھ کر کہ میری پاول کی ضو سے ایلیس کی روشنی ماند پڑ چکی ہے اس کو مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چونکہ وہ برابر کرانسٹلے سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ اس لئے اس نے ہر فضا ہی کو مخاطب کرنا غنیمت سمجھی ۔

رات گذرتی گئی۔ سب بہت خوش تھے۔ آہستہ آہستہ شراب چلتی رہی تو رتیں بیچ بیچ میں کوئی ہلکی چیز پیش اور سب ہی مباحث پر گفتگو ہوتی رہیں، "اوپن ہائمر، "بسمارک" اور مسارک، نروان اور ستیاگرہ۔ آئندہ جنگ اور ہسپانیہ میں خانہ جنگی کا آغاز۔

یہاں تک کہ "وومی" کی گنبد نما چھت کے شیشوں پر صبح سحر کی بھوری روشنی نمودار ہوئی۔ دوسرا دن شروع ہو رہا تھا۔ دوسرے دن ہروشا کے سوا ان سب میں سے اور کوئی یونیورسٹی نہ گیا۔

ساتواں باب

عشق کی تقسیم

۱

خدائے عشق اس زمانے میں نعیم کے دل میں تین مورتیں بنا رہا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سماتیں، ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں سماتے مگر ایک بتکدے میں کئی کئی صنم سما جاتے ہیں۔ کفر ہمیشہ جمہوریت پسند رہا ہے۔ تین مورتیں نعیم کے دل میں بھی ابھر رہی تھیں۔

اکثر وہ تصویر خانہ لوور جایا کرتا تھا۔ وہاں مونا لیزا کی تصویر تھی۔ اسے یاد تھا کہ پہلی مرتبہ یہ تصویر دیکھ کے اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس اصل تصویر سے تو نقلیں ہی اچھی معلوم ہوتی تھیں لیکن مونا لیزا اسے بلقیس کی یاد دلاتی تھی۔ یہ انداز اور مونا لیزا دونوں گویا رمز تھے جو بلقیس کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

لیکن جب وہ لوور جاتا تو اکثر گھنٹہ گھنٹہ بھر شکستہ دست زہرہ (زہرۂ میلو) کا مجسمہ

دیکھتا رہتا۔ قدرت کو چاہیے کہ جب وہ مکمل عورت بنانا چاہے تو اس مجسمہ کی نقل کرے۔ رفتہ رفتہ نعیم پر منکشف ہونے لگا کہ اسے شکستہ دست زہرہ سے کیوں اس قدر انس ہے۔ ایک دن وہ مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ اس مجسمہ کو دور ہی سے مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ نزدیک سے تو مجسمہ ذہن پر حاوی ہونے لگتا تھا۔ اس دن اس پر منکشف ہوا کہ یہ مجسمہ میری پامل "گل سرخ" کا مد مقابل ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس مجسمہ میں اور گل سرخ میں کوئی مشابہت تھی۔ ہر ور مشابہت میں بڑا فرق ہے۔ مگر اگر تصویریں بنائی جائیں تو اس کی شان رعنائیت جاتی رہتی ہے۔ کوئی مجسمہ یا کوئی تصویر اس کا رمز نہ سکتی تھی۔ الیس کلاڈل کی حیثیت ابتدا میں بالکل نقرئی تھی جیسے سینما کی ایکٹریسوں کی تصویریں۔ وہ امریکہ سے آئی تھی اور امریکہ چلی جائے گی۔ امریکہ سے آنے والی ایکٹریسوں کے چہرے اکثر ایک دوسرے سے ایسے مشابہ معلوم ہوتے کہ نعیم کو حیرت ہوتی۔ یہ غازہ و سرخی کا تصرف و اعجاز تھا۔

میری پامل کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ کسی طرح بیس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی صورت سے بڑا بھولا پن ٹپکتا تھا اور ہر طرح کی سادگی کے ساتھ جب وہ اپنی ذہنی قوت سے بڑے مجمعوں کو دم بخود کر دیتی، تب اس کی متضاد طاقت کا پتہ چلتا۔ حسن کی طاقت اور شخصیت کی طاقت کا یہ تضاد ہی اس کشش کا باعث تھا جو ہر اسے نوجوان محسوس کرتے۔ نعیم کی حسن پرست طبیعت پر زیادہ تر اثر اس کے حسن کا تھا یا اس کی شخصیت کا —— یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ غالباً دونوں کششیں ایسی تھیں کہ ان میں امتیاز مشکل تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کشش کا رجحان عشق کے مقابل دوستی کی طرف زیادہ تھا۔ ذہنی دوستی جس میں بوس و کنار کی چاشنی شامل ہو۔ لیکن یہ رجحان ابھی نعیم کے دماغ میں بہت غیر ارتقا یافتہ اور خلط ملط سا تھا۔

یہی زمانہ ہسپانوی خانہ جنگی کی ابتدا کا تھا۔ ہسپانوی سلطنت ابھی کلیساؤں پر چھوڑے
ہوئے ویرانی کی شکل میں ہی آثار رہے تھے کہ فاشسٹوں نے ہاتھ مارا۔ ہٹلر اور مسرڈی فوروف
نے سالہا سال پہلے اس قسم کی کوشش کی تھی اور ہار گئے تھے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۳۲ء اور
سنہ ۱۹۳۳ء میں خود وائمار جمہوریت کے نظام سے جس کی چول چول ڈھیلی ہو چکی تھی ہٹلر کو
مسندِ حکومت پر لا بٹھایا۔ مگر ہسپانیہ میں ایسے کسی ارتقا کی امید نہ تھی۔ ملک کا رجحان
دن بدن اشتمالیت اور اشتراکیت کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ فرانس میں "محاذ عوام"
کی حکومت تھی اگرچہ اسے ابھی بہت کچھ رنگ بدلنے تھے۔ جنرل فرانکو کو ابتدا میں بڑی
ناکامیاں ہوئیں۔ پھر حکومت نے بہت سے شہر چھین لئے اور اس کے بعد طویل خانہ جنگی
شروع ہو گئی۔ مراکو کے بربری مسلمان جو کبھی فاتح بن کے آئے تھے، اب فرانکو کے
سپاہی بن کے آئے۔ جمہوریہ ہسپانیہ سے جو عدل و مساوات کے لئے لڑ رہی تھی، اس
کے تحفظ میں "القصر" کا تاریخی قلعہ اُڑا دیا۔ اسی خانہ جنگی کے زمانے میں اشتمالی دنیا میں
ایک ہسپانوی عورت مشہور ہونے لگی جسے ہسپانوی فروسیت (شولری) نے "لاپاسیونارہ
یا صلیبی" کا لقب دے رکھا تھا۔

پیرس میں اشتراکی ہمدردی رکھنے والے طلبا کے طبقے میں شروع ہی سے ہسپانوی
"صلیبی" کے کارناموں کا یہ اثر ہوا کہ "گلِ سُرخ" میری پاول کی قدر بہت بڑھ گئی ——
جیسی وہ ادھیڑ تھی اور "گلِ سُرخ" نوجوان۔ وہ دور تھی اور یہ نزدیک، اور دونوں ایک
مقصد کے لئے لڑ رہی تھیں۔ میری پاول نے اس زمانے میں ہسپانیہ کے "بین الاقوامی"
بریگیڈ کے لئے اپنے نوجوان دوستوں کو بھرتی کرانا شروع کیا۔ اس کے بالوں کی چمک
کی، ان کے نور، اس کی شخصیت کے اثر سے بہت سے انگریز اور فرانسیسی، یہودی

درسلاف اسپین جانے لگے کہ ظلم و جبر کی فاشسٹی قوت کے خلاف جہاد کریں۔ بہت سی لڑکیاں نرسیں بن کے گئیں۔ ایک ہونہار شاعر نے پیرس میں میری پاول کے لبوں کا بوسہ لیا اور ہسپانیہ میں محاذِ جنگ پر جان دی اور اپنی نظموں کا چھوٹا سا مجموعہ میری پاول کے نام معنون کر گیا۔

ہروشا اور کرا کسلے کے ساتھ نعیم کو کئی بار میری پاول سے ملنے کا موقع ملا لیکن وہ اپنی سیاسی اور تبلیغی جدوجہد میں اس قدر مصروف تھی کہ نعیم اسے کہیں تنہا مدعو کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ بار بار وعدہ کرتی اور اکثر نعیم کو ایک لفافے میں ایک چھوٹا سا کارڈ ملتا جس پر ایک طرف "میری پاول - جامعہ پیرس" چھپا ہوتا اور دوسری طرف جلدی میں پنسل سے لکھی ہوئی ایک آدھ سطر جس کا مضمون عموماً یہ ہوتا "معاف کرنا میں نہ آسکوں گی۔ کل ملاقات ہوتی تو پھر کبھی وقت مقرر کریں گے۔ آج تو میرا آنا ممکن نہیں" وہ اس بے تکلفی سے ساتھ کھانا کھانے، یا کسی میوزیم کو دیکھنے یا کسی جلسے میں جانے یا کسی قہوہ خانے میں ملنے کا وعدہ کرتی کہ اس آسانی اقرار پر ہی نعیم کو بے اطمینانی ہونے لگتی کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوگا۔

اور چونکہ میری پاول سے تنہا ملنے کا ہر موقع اسی طرح نکل جاتا۔ اس لیے نعیم کے ملنے کی کوشش بڑھتی ہی گئی۔ شانِ نارسائی ہی سے عشق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن نعیم کو اپنے جذبات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ یہ محض خواہش ہے یا شوق ہے یا شوقِ فضول ہے یا اُنس ہے، یا محبت ہے۔ عشق تو یہ ہرگز نہ تھا۔

ایک دن ہروشا نے میری پاول کا ذکر کرتے ہوئے کہا "پچیس سال کی عمر میں بھی اس کے چہرے پر وہی بچپن کا بھولا پن ہے۔ وہ ان چند عورتوں میں سے ہے جن کے حسن پر سالہا سال تک زمانے کی دست برد کا اثر نہیں ہوتا۔ ان کا جوشش ان کو جوان

رکھتا ہے لیکن جب وہ رک جاتی ہیں تو ایک ہی دن میں بوڑھی ہو جاتی ہیں "
ہروشا کو نوروں سے کچھ ایسا بغض تھا کہ اس کے اکثر جملے نعیم کو متبسم کر دیتے۔ لیکن اس کی یہ رائے بڑی سچ معلوم ہوئی۔ میری پاول کی کشش کا سارا راز اس کے شباب کی ابتدائی تازگی تھی اور یہ تازگی ہر چیز میں موجود تھی۔ صورت میں، سیرت میں، شخصیت میں اور عمل میں۔

جس ضعیف کے ہاتھ میں عصا نہیں ہوتا وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہے۔ ایلس کلاڈل کی جسمانی قربت ایسا ہی سہارا تھی۔ نعیم منزلِ وصل سے اب بھی بہت دور تھا۔ صورت محض دوستی کی تھی۔ ایک اجنبی اور مسافر مرد اور ایک غریب الوطن تنہا اور تنہائی پسند لڑکی کی دوستی۔ مگر اس دوستی میں خودداری اور راستی تھی۔ وہ اس قدر جلد نعیم سے مانوس ہو گئی تھی کہ یاد کر کر کے خود نعیم کو حیرت معلوم ہوتی تھی۔ نعیم کی آرزوئے وصل میں بہت بے تابی سہی مگر سطحی ہم آغوشی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہونے لگا تھا۔ ایلس کے طرزِ عمل میں ایک "انسانیت" تھی جس نے بہت جلد نعیم کے دل میں گھر کر لیا۔ مرد اور عورت کا بے غرض انس، بے غرض رفاقت اور ہمدردی۔ یہ وہ خصوصیت تھی جس کی ایلس کے سوا بہت کم جوانوں سے توقع ہو سکتی تھی۔

بلقیس دور تھی، اور میری کمیاب۔ لیکن ایلس سے ملنے کا اسے روز موقع ملتا تھا۔ بلقیس کی یاد بھی آتی۔ کبھی بالکل سطحی سی، غیر اہم سی یاد، کبھی دل کو تڑپا دینے والی یاد مثلاً کبھی رات کے تین بجے جب آنکھ کھل جاتی تو بلقیس پہروں یاد آتی اور تصورات اور تخیلات کے محل کے محل کھڑے ہو جاتے۔ اکثر وہ حسرت کا یہ شعر پڑھتا ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی تو برسوں تک نہیں آتی!
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں!!

اکثر وہ نیم بیداری یا بیداری میں بلقیس کے خواب دیکھتا۔ خطۂ جنت نشان و جہنم نشان یعنی سرزمین ہندوستان کو واپسی اور شادی۔ شادی کی رات، بند کمرے میں تین صوفے اور ایک پلنگ۔ معلوم نہیں کیوں مگر تین صوفے اور ایک پلنگ، اور بلقیس کے ہنستے ہوئے ہونٹ اور بکھرتے ہوئے بال۔

لیکن پھر صبح کو۔ اس کا تخیل دوسری صبح کا اندازہ کبھی نہ لگا سکتا جیسے مادموزیل دوپاں کی ہم آغوشی کے بعد گا تیر کا امیر شاعرانہ تخیل ٹھٹک کر ٹھہر گیا۔ اور اس نے تمت کا پردہ ڈال دیا۔ لیکن دوسری صبح اس تمت سے زیادہ اہم ہوگی۔ وہ زندگی کے دوسرے دور کے آغاز کی صبح ہوگی۔ زندگی کے اسی دوسرے دور سے نعیم کا تخیل گریز کرتا۔ شعریت کی ایک رات کے بعد پھر کیا ہوگا؟ متاہل زندگی کا دن تو بڑا طویل ہوتا ہے اور اس کی دوپہر بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے اس کا ذہن گریز کرتا۔

خانم کے خط کم آنے لگے تھے۔ ایک دن نعیم نہا کے صبح سویرے چلتے نیچے اُترا تو اسے خانم کا ایک خط ملا۔ ساتھ ہی ایک خط داور کا بھی تھا۔

خانم کے خط کا مضمون یہ تھا

عزیزی نعیم سلمہٗ!

تم تو ہم کو ایسا بھولے کہ کبھی کبھی جو خط لکھتے تھے وہ بھی چھوڑ دیا۔ خیر لاپروائی تو جناب کی پرانی عادت ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں خوب دل لگ گیا۔

کس کس سے دوستی ہوئی۔ ذرا ہمیں بھی تو وہاں کے حالات لکھئے۔ اب آپ تشریف کب لائیں گے، یہ تو لکھتے ہی نہیں۔ تمہارے چچا بھی پوچھ رہے تھے۔ ابھی شاید ایک آدھ سال باقی ہے۔ مگر بیچ ہی میں کیوں نہیں آجاتے۔ تعطیلات یہاں گذار کے پھر چلے جاؤ۔ بہت سے لوگ یہی کرتے ہیں۔ بلقیس اب ماشاءاللہ سینیر میں ہے۔ اس سال پاس ہو جائے تو میں تو اسے بی۔ اے تک پڑھاؤں گی۔ اس کے پیام بہت آرہے ہیں۔ ابھی سورت سے ایک بڑے زمیندار کا پیام آیا ہے۔ ان کے بہت سے کارخانے بھی ہیں۔ لاکھوں روپے بنک میں جمع ہیں مگر بوہرے ہیں۔ اس لئے تمہارے چچا نے منظور نہیں کیا۔ اب نصیرالدین صاحب کے لڑکے کا پیام آیا ہے۔ کانپور کے قریب ان کے کئی گاؤں ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں ہزار روپیہ کے قریب تنخواہ ہے۔ یہاں دو تین دن سے بارش ہو رہی ہے اور ذرا سردی ہے۔ بلقیس نے شکایت کی ہے کہ تم نے اس کے لئے جو کپڑے بھیجنے کو کہے تھے وہ ابھی تک نہیں بھیجے۔ اور سب خیریت ہے۔

تمہاری چچی

دادا کے خط کا مضمون یہ تھا۔

میاں نعیم سلمہٗ

تمہارا خط ملا۔ اگر صبح کا بھولا شام تک واپس آجائے تو اسے بھولا نہ کہنا چاہئے۔ میں حیدرآباد بھی گیا تھا۔ کل پھر بنگلور واپس آگیا ہوں۔

سب جگہ ہر طرح خیریت ہے ۔ مجھے اندیشہ ہے ۔ جب تم حیدرآباد واپس آؤ تو شاید خانم کے یہاں تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے ۔ یہاں عادل نے اتنا بھڑکایا ہے کہ اب بلقیس کی مرضی نہیں رہی ۔ باقی خود سمجھ جاؤ ۔

نہ نے لکھا تھا تعطیلات میں تم پیرس جا رہے ہو ۔ شاید آج کل وہیں ہو ۔ اچھا ہے وہاں مزے کرو ۔ ہم اس سڑے گلے تعلقہ میں تمہاری بھابھی کے ساتھ دفن ہیں ۔ ....

"

خط کے بقیہ حصہ میں کوئی اور خاص بات نہ تھی ۔

ان دو خطوں کے بعد نعیم پر ایک نفسیاتی جمود سا طاری ہونے لگا ۔ ایلیس کے غازہ و سرخی و لباس سے مزین حسن اور میری کے جمال ذہنی و جسمانی کے اثر سے بلقیس کی مقناطیسیت یوں بھی مدھم پڑنے لگی تھی ۔ اب گویا کسی نے اس کے دل کے اندر ہاتھ بڑھا کے قطب نما کو توڑ دیا ۔ قوت احساس اور قوت مدرکہ نے معلوم نہیں کیوں اسے بلا کسی سبب اور وجہ کے سمجھانا شروع کیا کہ اب بلقیس اسے پسند نہیں کرتی ۔ خانم بھی اس معاملے میں ڈھل مل ہو رہی ہیں ۔ وہ اپنے خط میں اوروں کے مقابلے میں اسے ترجیح دے رہی ہیں ۔ لیکن جب اس سے نسبت ہو چکی ہے تو دوسرے پیاموں کے ذکر کے کیا معنی ۔ خانم کی عادت شیخی خوری کی سہی لیکن پھر بھی ۔

اگر میری کا تصور اور ایلیس کی قربت اسے بے پروا نہ بنا دیتی تو شاید اسے

شدید ترین رنج ہوتا۔ لیکن اسے خود تعجب ہوتا تھا کہ دل کی گہرائی میں رنج کا پتہ نہ تھا۔ رنج نہ تھا۔ ٹھیس البتہ لگی تھی۔ مگر دل کو نہیں، اس کے غرورِ خودداری اور جذبۂ خود پرستی کو۔

پھر اس کے دل پر انتقام کی ایک خواہش غلبہ پانے لگی۔ بلقیس یا خانم یا جو کوئی بھی اس نسبت کے کمزور کرنے کا ذمہ دار ہے اس کو بھی کچھ ذہنی سزا ملنی چاہیئے۔ سزا کے لئے اس نے انتہائی عامیانہ طریقہ اختیار کیا اور یہ نہ سوچا کہ رشک اسی عورت کو ہوتا ہے جسے لگاؤ بھی ہوتا ہے۔ محبت کے بغیر رقابت کوئی معنی نہیں رکھتی اور اگر محبت نہ ہو اور کسی کو کوئی پسند نہ ہو تو اس کو کسی اور کے ہاتھوں میں جاتے دیکھ کے اُلٹا اطمینان ہوتا ہے۔ غلط ترین نفسیاتی اندازے قائم کر کے اس نے ایلس کی تصویریں، ایسی تصویریں جس میں ایلس سے اس کے اخلاص اور اختلاط کا اظہار ہوتا تھا خانم کے خط کے جواب کے ساتھ خانم کو بھیجیں۔

یہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ خانم اور عاقل خاں پر ان کا کچھ اثر ہوا یا نہ ہوا ہو بلقیس پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔

(۲)

میری اب نایاب تو نہ تھی مگر کمیاب ضرور تھی۔ اس لئے جب وہ سات سمندر جو ہندوستان ور یورپ کے درمیان ہیں بلند ہو کے سات پہاڑ بن گئے اور انہوں نے بلقیس کو اپنی اوٹ میں چھپا لیا تو نعیم کا دل ایلس کی طرف پلٹا۔

نادانستہ طور پر دوستی کی سرحد اس وقت ختم ہوئی تھی اور محبت کی سرحد اس وقت شروع ہو گئی تھی جب اب سے ڈیڑھ ہفتہ پہلے نعیم دوزہ ریل میں "روم" جاتے ہوئے

ایلیس اس کے کندھے کا سہارا لگائے اُونگھ رہی تھی اور اسے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی اور اس کے دل سے ہمدردی کی ایک لہر اُٹھی تھی اور ایلیس کے پیلے پیلے بالوں پر چھا گئی تھی۔

اب تک نعیم کو خود اس کا پتہ نہ چلا تھا کہ وہ کس خطرناک طریقے پر ایلیس کے قریب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ ایلس کو "محفوظ" سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کوئی مجسمہ یا کوئی تصویر اس کا "رم" نہ بننے پایا تھا۔ اس میں گہرائی نہ تھی۔ اس میں وہ خون کی نزدیکی نہ تھی جو بلقیس میں تھی۔ بلقیس کی طرح وہ اپنے ماحول میں ممتاز نہ تھی۔ مبری کی طرح سینکڑوں نوجوان اس کی پرستش نہ کرتے تھے۔ اس میں کوئی خطرناک دلکشی نہ تھی وہ دلکش ضرور تھی اور ہر لحاظ سے خوبصورت کہلانے کی مستحق۔ مگر پیرس میں لاکھوں لڑکیاں اس جیسی ہوں گی۔

متوازی خطوط لامتناہی حد پر جا کے ملتے ہیں لیکن متوازی خطوط کا ایک دوسرے کے پاس پاس ہونا ہی ملنے سے کیا کم ہے۔ متوازی خطوط میں ایک طرح کی رفاقت ہوتی ہے۔ اسی طرح کی رفاقت نعیم اور ایلیس میں تھی۔ ایلیس محض ایک سیدھی سادی، اچھی خاصی صورت شکل کی لڑکی تھی۔ خوش لباس، خوش مذاق لیکن متوسط طبقے اور متوسط ذہن کی۔ عام اوسط معیار کی لڑکی۔ اوسط عورت۔ نعیم میں بھی نوجوانی کی انانیت اور خود پسندی بہت تھی۔ وہ اپنے آپ کو جو کچھ سمجھتا ہو لیکن ایلیس کی طرح اس میں بھی "کوئی خاص بات" نہ تھی۔ وہ بھی متوسط طبقے کا، اوسط مذاق اور اوسط ذہن کا نوجوان تھا۔ اوسط مرد۔

حیاتی اُصولِ انتخاب نے ان دونوں کو مساوی قرار دیا تھا۔

(۳)

ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت کا اگر زیادہ ساتھ رہے تو رومانس ہو ہی جاتا ہے
قریب قریب روز شام کو نعیم، ایلس کو لے کے کسی تھیئٹر یا تماشے جاتا۔ اگرچہ دونوں کو ملے
اور یوں ساتھ ساتھ جاتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا ——— یہ سب پندرہ دن کے
اندر کے واقعات ہیں ——— لیکن وقت کی قیمت اور اہمیت کا وقت کی مقدار سے بہت
کم تعلق ہوتا ہے۔ ہر دن جو گذرتا اس میں نعیم اور ایلس ایک دوسرے سے قریب ہوتے
جاتے اور ہر وقت کبھی کبھی نعیم کی بدمذاقی پر احتجاج کرتا۔ ایک عورت کے ساتھ دن کے
چار پانچ گھنٹے ضائع کرنا کیا معنی؟

بہت جلد نعیم کو محسوس ہونے لگا کہ وہ صبح ہی سے سہ پہر کا منتظر رہتا ہے، جب
ایلس کے ساتھ کا وقت آئے گا، اس کو کہیں ساتھ لے جانے کا وقت آئے گا اور
پھر اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ ایلس اس کے لئے کتنی ضروری ہوتی جا رہی ہے۔
جب وہ ہنستی ہے تو اس کے سُرخ سُرخ ہونٹوں میں اس کے دانت کتنے بھلے معلوم ہوتے
ہیں۔ چمکتے ہوئے ہموار سفید دانت، اور اس کے ہونٹ کتنے پیارے ہیں اور اس کا گول
گول چہرہ اور اس کے پیلے پیلے بال اور اس کی سخت چھاتیاں۔

اس کا دل نرم ہونے لگا۔ ایک ایسی نرمی جو اس نے اب تک کسی عورت کے لئے
محسوس نہیں کی تھی، وہ ایلس کے لئے محسوس کرنے لگا۔ اسے بات بات کا خیال ہونے لگا۔
اگر رات زیادہ آگئی ہے اور دونوں کھلی سڑکوں پر ہیں تو اس کا خیال کہ کہیں ایلس کو سردی
نہ لگ جائے۔ اگر وہ زیادہ پیدل چلی ہے تو یہ خیال کہ کہیں تھک نہ جائے۔ جس دن اس
کی طبیعت کسل مند ہوتی، نعیم اس سے زیادہ پست ہو جاتا۔

اب تک ہزاروں بار وہ ایلس کے بوسے لے چکا تھا لیکن ان بوسوں میں کوئی خاص کیفیت نہ تھی۔ جیسے اور کسی لڑکی کے بوسے لیے جاتے ہیں۔ جیسے ان تمام لڑکیوں کے بوسے جو اس سے شباب تک لیے گئے تھے۔ مگر اب جب وہ ایلس کا بوسہ لیتا تو معلوم ہوتا کہ اس کا دل اس کے ہونٹوں میں آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا کہ جتنی لذت اس ایک بوسے میں ہے اتنی لذت اور کسی چیز میں نہیں اور ایلس کی انگلیوں کے ناخن تک اسے عزیز معلوم ہوتے۔

اسے ایلس کی قدر بھی معلوم ہونے لگی تھی۔ ایلس کی "وفاداری" کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جب سے ایلس پیرس آئی تھی شاید ہی وہ کسی اور نوجوان کے ساتھ اِدھر اُدھر گئی ہو۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس کی ملاقاتیوں میں بہت سی لڑکیاں وقتِ واحد میں "ایک ہی لڑکے" سے دوستی رکھنا مناسب سمجھتی تھیں۔ خصوصاً خاموش طبیعت کی لڑکیاں، سنجیدہ لڑکیاں۔ ایلس نے بھی اگر کسی اور سے دوستی نہ کی تھی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ لیکن یہ کیا کم تھا کہ ایلس نے اس سے دوستی کی تھی۔ اس کو انتخاب کیا تھا اور پھر اس وفاداری سے ـــــ اسے ایلس سے مل کے ابھی دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے ـــــ وہ انتخاب پر قائم تھی۔

اب تک ایلس کے آخری انکار سے اسے سخت ترین جسمانی اور اکثر ذہنی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اسے حد سے متجاوز نہ ہونے دیتی تھی۔ اب نعیم اس کے اس انکارِ وصل کی وجہ سے اس کی اور عزت کرنے لگا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ دوشیزہ ہے۔ وہ ابھی تک "خراب" نہیں ہوئی۔ اسے اپنی عصمت اس قدر عزیز ہے۔ اب ایلس کے خوانِ محبت سے اسے جو کچھ مل جاتا، وہ کتنا ہی ناکافی کیوں نہ ہوتا، وہ اسی پر راضی تھا۔ اب وہ اس کی

سوئت اور اس کا احترام کرنے لگا تھا۔

پھر بھی جب رات کو اسے اس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا کے دروازے پر شب بخیر کہتے ہوئے وہ اس کو لپٹاتا۔ جب دونوں کے جسم ایک دوسرے کو والہانہ خلوص سے بھینچتے اور دونوں کے لب مل جاتے تو وہ محمد جو نعیم کے خمیر میں تھا پکار اٹھتا کہ اکثر مذاہب میں جنّت کا تصوّر کتنا ناقص ہے۔

(۴)

لاسورس میں بیٹھے بیٹھے ذرا سُرور کے عالم میں ہروشا نے کہا "جو خواتین آج اس میز پر موجود ہیں، وہ اس سے مستثنٰی ہیں۔ مگر میری اب بھی یہی رائے ہے۔"

"عورتوں سے آپ کو اگر اتنی نفرت ہے تو پھر آپ ہم لوگوں کے ساتھ کیوں پھرتے ہیں؟" ایلس نے پوچھا۔

کراکسلے نے ہروشا کی طرف سے جواب دیا "زرتشت کا ایک باغ ——— یا ایک وادی ——— بہر حال کسی جگہ گذر ہوا جہاں لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ انھوں نے زرتشت کو بلایا کہ آئے اور ان کے ساتھ ناچے۔ وہ گیا اور ان کے ساتھ ناچا۔ مگر پھر اپنی راہ چل دیا ———"

نعیم نے کہا "معلوم ہوتا ہے کسی نے زیدنک کو بڑا دھوکا دیا ہے۔"

"ہمیں سُناؤ تو سہی" میری پاول نے کہا۔

"اس کے بال سنہرے تھے؟" ایلس نے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"یا کالے؟" میری پاول نے جملے کی تکمیل کی۔

"ہاں اگر ہم لوگوں کو تم ضرورت سے زیادہ متجسّس نہیں سمجھتے تو سُناؤ۔"

"اب تک مجھے صرف ایک سے محبت ہوئی ہے۔ لیکن اب وہ محبت بھی کم ہو رہی ہے۔
ایک دوسری محبت اس کی جگہ لے رہی ہے . . . " یہ کہہ کے ہروشا ذرا ٹھہرا۔
دونوں لڑکیوں نے میز پر اپنی کہنیاں ٹکیں اور ہتھیلیوں پر اپنی ٹھڈیاں رکھ دیں۔ دونوں نے ایک دوسری کی طرف شرارت سے دیکھا اور پھر ہروشا کے اعتراف کا انتظار کرنے لگیں۔

ہروشا نے کہنا شروع کیا "اب سے جو دہ سو سال پہلے وہ راستہ بھٹک کے یروشلم پہنچی۔ اب سے گیارہ سو سال پہلے اسے معلوم ہوا کہ یروشلم میں ایک شخص کو انسانوں سے محبت کے جرم میں سُولی پر چڑھایا گیا، جب سے اسے اس شخص سے عقیدت ہو گئی —— یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ میرا عقیدہ نہیں ——"

"ہاں۔ پھر کیا ہوا؟" میری پاول نے شرارت اور اشتیاق سے پوچھا۔

"جس مکان میں وہ رہتی تھی اس کے مغرب میں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے ایک موٹا تیم شحیم جرمن رہتا تھا جو اڈالف ہٹلر کے پردادا کا رشتے کا بھائی تھا۔ وہ اکثر اندھیری رات کو کھڑکی کے راستے یا دیواریں پھاند پھاند کے اس کے مکان میں گھس آتا اور . . . . ."

"اور ظاہر ہے تمہاری محبوبہ کو اس موٹے، بیٹر پیئے والے جرمن سے نفرت تھی؟" میری پاول نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ مگر وہ گھر میں اکیلی رہتی۔ اس زمانے میں یہ اس جرمن کے حرم میں داخل ہوئی۔ جبکہ ہارون الرشید بغداد کے بازاروں میں چھپ چھپ کے گشت لگایا کرتا تھا۔"

"اور جب اس نے تمہارے جرمن کو تحفے میں ایک ہاتھی بھیجا تھا۔ میری پاول نے کہا۔

"یہ آخر تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟" ایلس نے کہا، جو ان عجیب و غریب باتوں کو ذرا حیرت اور پریشانی سے سن رہی تھی۔

"صبر، صبر، پیاری صبر" میری باول نے ایلس سے کہا۔

نعیم جو اس قصے کو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ اس نے محض ایلس کی خاطر کہا "سنتی جاؤ ایلس، ہروشا پر ذرا سرور کا اثر ہے"

"ہاں۔ ہروشا پھر؟" کراکسلے نے کہا۔

"پھر مسٹر کراکسلے یہ ہوا کہ میری محبوبہ کو تھی اس جرمن سے نفرت۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس جزیرے میں جو ہندوستان کے جنوب میں ہے ..."

"سیلون!"

"نہیں جی، سسلی۔ اس جزیرے میں ایک جرمن نے ہارون الرشید کے نکالے ہوئے درباریوں سے حرم کے آداب سیکھے اور ذرا ذرا روشن خیالی سیکھی"

"اس سسلی والے جرمن کا نام فریڈرک تو نہیں تھا؟" میری نے سوال کیا۔

"ہاں۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"فریڈرک ثانی" میری نے مصنوعی فخمندی کے انداز میں کہا۔

کراکسلے نے کہا "وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ لوگ مشرق سے تہذیب سیکھتے تھے اور نتیجے کے طور پر نشاۃ ثانیہ ظہور میں آیا۔ اب مسٹر نعیم حسن مغرب میں تہذیب سیکھ رہے ہیں اور دوسری عالمگیر جنگ کے ظہور میں آنے کی توقع ہے"

اب ایلس بھی ذرا دلچسپی سے ہروشا کی داستان سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"خیر تو اس سسلی والے جرمن نے میری محبوبہ کو اندر ہی رکھا۔ مگر خدا آنا دی دی

اور عورتوں کا تو یہ خاصا ہے کہ ذرا آزادی ملی اور وہ اپنے جامہ سے باہر۔ میری محبوبہ نے بھی ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ یہاں تک کہ جرمن کے حرم کی کئی بیگمات کو اپنی کنیزیں بنا کے اپنے مکان میں رکھ لیا۔ اس پر وی آنا والے جرمن کو غصہ آیا ....“

”روڈولف فان ہاپس برگ؟“ میری نے کہا

”ہاں۔ روڈولف۔ اس نے پہلے تو میری محبوبہ کے گھر میں نقب لگائی اور تمام کنیزوں کو جو کوٹھڑیوں میں بند تھیں اڑا لے گیا۔ اس نے میری محبوبہ کی بھی بے عزتی کرنی چاہی مگر وہ کسی طرح اس کے ساتھ راضی نہ ہوتی تو اس نے ایک اور جرمن سے اس کی شادی کرا دی اور وہ جرمن خانہ داماد ہو کے اسی مکان میں رہ پڑا.. ..“

”وین سس لاس؟“ میری نے جلدی سے کہا۔

”ہاں وین سس لاس۔ اس نے میری محبوبہ کو پڑھایا لکھایا اور جب وہ یروشلم کے سولی پانے والے کی محبت میں سچ بولی تو اسے جلایا گیا اور پھر ایک اور جرمن نے اس کے شوہر ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ اندھی تھی مگر لڑتی رہی ......“

”اندھی تھی —— یعنی جان زیزکا؟“

”ہاں وہ جان زیزکا بن کے اندھی ہوئی مگر جس کی چتا نے اسے جو آنکھیں دی تھیں وہ نہیں پھوٹی تھیں۔ کچھ دن اسے چین بھی ملا اور وہ چھوٹے چھوٹے مکان اور تصویریں بنواتی رہی۔ یہاں تک کہ وی آنا کے ایک جرمن نے اسے پھانس دیا، اس سے شادی کر لی۔ اس کی اور بھی سوکنیں تھیں ... .“

”مثلاً ہنگری؟“ میری نے کہا۔

”چار سو سال اس کا یہ شوہر زندہ رہا اور اسے ایک دن راحت نہ ملی ہیں آپ لوگوں

سے کیا کہوں کہ اس سہاگ کے زمانے میں اس کا گھر کیسا جہنم تھا۔ اٹھارویں صدی میں اس کے جرمن شوہر نے عورت کا روپ بدلا اور عورت بن کے اپنی بیویوں کی آزادی کی خواہش سے ایسا چڑنے لگا کہ اس نے میری محبوبہ کو دن رات نقاب پہننے کا حکم دیا۔ اب تو یہ جرمن راتوں کو اسے اپنے کمرے میں سُلاتا۔ لیکن ــــ خواتین مجھے معاف فرمائیں ــــ لیکن اپنے بستر پر نہیں۔ سرد پتھر کے فرش پر۔۔ "

"جب جرمن نے اپنا روپ بدلا اور عورت بنا تو اس کا نام میرا یا تھریسا تو نہیں تھا؟"

"ہاں۔ مگر پھر انیسویں صدی آئی۔ وہ بھی کیا صدی تھی۔ اس کی قدر انگریزوں سے پوچھو۔ کیوں جیمز! اس صدی میں میرا یا تھریسا کی ایک لڑکی اور اس کے شوہر سے پیرس کے شہری اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے ایک قید خانہ توڑ ڈالا۔ یہ خبر ہوتے ہوتے ہمارے دی آما والے جرمن کے حرم میں پھیلی۔ پیرس زنانہ فیشن کا مرکز ہے۔ عورتوں کے فیشن کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ میری محبوبہ کو بھی اس فیشن کا شوق ہوا۔ پھر اس نے طلاق کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ۱۹۱۸ء میں جب اس کے بوڑھے شوہر نے گھائل ہو کے دم توڑ دیا تو میری محبوبہ نے نوجوان قحبہ کی طرح اپنا نقاب ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اپنے شوہر کے گھر سے بھاگ کے پھر اپنے گھر میں رہنے لگی۔ خدا نے اسے پھر سے جوانی دی۔ اب اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہے۔"

"میں نے اسے دیکھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ کتنی حسین ہے۔" ـــ میری نے کہا۔

"خوب۔ خوب۔ زیدنک بڑی دلچسپ داستان تھی۔" کرا کسلے نے کہا۔

"ہم سب ہروشا کی محبوبہ چیکوسلواکیا کا جامِ صحت پئیں" نعیم نے کہا۔
"مگر اب تمہاری نئی محبوبہ کون ہے؟" ایلس نے پوچھا۔
"میں بتائے دیتا ہوں" یہ کہہ کے جیمز کراکسلے نے "پیری سوار" (شام پیرس) کا تازہ پرچہ اُٹھایا جو وہیں میز پر پڑا ہوا تھا۔ اس میں اسٹالن کی تصویر تھی۔ کراکسلے نے پنسل سے تصویر کو لہنگا پہنا دیا۔ اور پرچہ ایلس کی طرف بڑھایا اور کہا "یہ ہے ہروشا کی نئی محبوبہ!"

ایلس نے اس کی تعریف پھر اسی امریکی لفظ سے کی جس کا ترجمہ ناممکن ہے۔
"کیوٹ!"

"مگر تمہیں کسی سچ مچ کی عورت سے محبت کیوں نہیں ہوتی؟" نعیم نے اصرار سے پوچھا۔
"چیک لڑکیاں تو بڑی جمیل ہوتی ہیں۔ خصوصاً دیہاتوں میں اپنے قومی لباس میں۔ میں تو گھنٹوں ان کے لباس کو دیکھا کرتی تھی۔" میری پادل نے کہا۔

ہروسا نے جواب دیا "معلوم نہیں کیوں۔ مگر ساتھ بیٹھ کے ہنسنے بولنے کے سوا مجھے عورتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

کراکسلے نے کہا "اس کی وجہ خدا کو معلوم ہوگی یا فرائڈ کو۔ خدا کا شکر ہے، مجھے تو اس وقت میری اور ایلس بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہیں۔ کیوں نعیم؟"

اور نعیم نے کہا "بےشک" دونوں لڑکیاں مسکرائیں۔

(۵)

اسی رات کو نعیم ایلس کو اس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا کے واپس آیا ہی تھا کہ خادمہ نے اسے اطلاع دی، کوئی ٹیلیفون پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

اس نے نیچے اُتر کے رسیور اٹھا کے کہا۔ "ہلو!"

"پیارے۔ میں ایلیس ہوں!"

"کیا ہے ایلیس ڈارلنگ؟"

"کل دس بجے میں جینوا جا رہی ہوں!"

"کیا؟"

"کل دس بجے میں جینوا جا رہی ہوں۔ مجھے ابھی ابھی تار ملا ہے میرے چچا وہاں آگئے ہیں۔"

"کون؟"

"میرے چچا۔ وہی جو ترکی میں ۔۔۔ کونسل تھے۔ وہ واپس جا رہے ہیں۔ میں ان سے ملنے جاؤں گی۔"

"کب تک وہاں رہو گی؟"

"ایک دن جینوا میں۔ پھر ان کے جانے کے بعد دو تین دن سوئٹزرلینڈ میں ذرا گھوموں گی ...... یہی لوزان، مونترو وغیرہ۔ میں ہمیشہ سے سوئٹزرلینڈ دیکھنے کی مشتاق ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے!"

"میں یہاں اکیلا تمہارے لئے تڑپتا رہوں گا!"

"مگر کہیں میرے فراق میں میرے آنے سے پہلے مر نہ جانا۔ کسی اور سے دل بہلا لینا جیسے میری ۔۔۔"

"ایلیس۔ خدا کے لئے . ."

ٹیلیفون پر ایلیس کے قہقہہ کی آواز آئی "یہ میری مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی

خوبصورت ہے۔ ہے نا؟ ... کیوں؟"

"چُپ" نعیم نے ٹیلیفون پر ہنستے ہوئے کہا "تمہارے مقابلے میں تو وہ کچھ نہیں معلوم ہوتی۔ اور تم سے تو مجھے بہت محبت ہے۔"

"بیشک۔ بیشک۔"

"سچ۔ آج تک مجھے کسی اور سے اتنی محبت نہیں ہوئی جتنی تم سے ہے۔"

"سچ؟ اچھا اب شب بخیر۔ دیر ہو رہی ہے۔ اچھے لڑکے کی طرح سو رہو اور میری عدم موجودگی میں اچھے لڑکے کی طرح رہنا۔"

"مگر تمہاری گاڑی کتنے بجے جا رہی ہے؟"

"مجھے ٹھیک نہیں معلوم۔ کل صبح کو دس یا بارہ بجے۔ کل صبح سویرے معلوم کر دوں گی۔"

"میں اسٹیشن پر تمہیں رخصت کرنے آؤں گا۔"

"شکریہ، پیارے لڑکے۔ شب بخیر" یہ کہہ کے اس نے ٹیلیفون کے آلے کے سامنے بوسے کی سی آواز نکالی۔

"شب بخیر، پیاری۔ آرام سے سونا۔"

آٹھواں باب

انتخاب

باوجود ایلس کی محبت کے اس گہرے اثر کے میری کے لئے بھی نعیم کے دل میں کافی جگہ موجود تھی ۔ مرد کی اسی عجیب نفسی کیفیت میں تو تعدد ازدواج کا فلسفہ مضمر ہے۔ وہ برابر میری یا ول کو کھانے پر یا تھیئٹر کے لئے بلاتا رہا اور اسے کبھی تو کارڈ پر ایک آدھ جملہ لکھا ہوا مل جاتا' یا کبھی کبھی جب وہ زیادہ اصرار سے بلاتا تو اس قسم کے خطوط ملتے:۔

"ڈیر نعیم حسن!

مجھے بڑا افسوس ہے کہ آج تمہارے ساتھ جائے نہ پی سکوں گی ۔
کیونکہ پانچ بجے مجھے ایک ضروری جلسے میں شریک ہونا ہے ۔
توقع ہے کہ تم سے کل ملاقات ہوگی۔ تمہاری میری!"

یا

[illegible]

"یا افسوس ہے کہ منگل کے دن میں نے دوپہر کے کھانے پر آنے کا وعدہ کر کے تمہیں انتظار کرایا۔ میں وقت پر نہ آ سکی اطلاع بھی نہ دے سکی کیونکہ مجھے وہاں [illegible] چلا جانا پڑا۔ ہسپانیہ کی کچھ پناہ گزین لڑکیاں یہاں آئی تھیں اور [illegible] دیکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے کوشش کی کہ تم اسٹی تیوٹ میں مل جاؤ تاکہ میں معافی مانگ لوں مگر تم ملے نہیں۔

تمہاری مریم"

وہ کھانا کھاتے [illegible] بہت ہی خشک قسم کی باتیں کرتے۔ [illegible] جب وہ بنس مکھ ہوتی تو اس کا انداز بالکل شفقانہ اور سنجیدہ ہو جاتا۔ تکبر یا تعصب کا سایہ بھی نہ ہوتا۔ [illegible] میں بھی ایک سادگی ہوتی تھی۔ دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل تھی جو دونوں کو بے تکلف نہ ہونے دیتی۔ گفتگو بالکل اسی طرح کی ہوتی جیسے اجنبیوں میں ہو۔ اشتراکیت کے متعلق، ہندوستان کے متعلق، یہودیوں کے متعلق مختلف حقائق کا ذکر ہوتا۔ دوستوں کا بھی کبھی کبھی ذکر ہوتا۔ لیکن مریم پاول کے طرز [illegible] میں ایسی جذباتی بے رنگی تھی کہ کبھی ایسی گفتگو نہ ہوتی جو ایک نوجوان مرد اور نوجوان عورت میں ہوتی ہے۔

اتوار کو ساڑھے دس بجے گاڑی پیڈنگٹن اسٹیشن پہنچی۔ کے نعیم مریم کو لنچ کے لیے طلوع سال نورمیں کے ایک ایسے چھوٹے سے ریستوران میں لے گیا تھا جہاں شور رہنے کے باوجود [illegible] آنا [illegible] کے [illegible] مختصر [illegible] ایک میز پر بیٹھے۔ [illegible] اور [illegible] طرح باتیں کرتی رہی اور لنچ کے خاتمے پر اس نے

محسوس کیا کہ میری اس سے پہلے کے مقابل اور زیادہ دور ہو گئی ہے۔ ایک شاخ کی طرح اس میں بلا کی لچک ہے" ہاتھ بڑھاؤ اور وہ شاخ لچک کے ہٹ جاتی تھی۔

(۳)

اس وجہ سے ایلیس عزیز تر معلوم ہونے لگی۔ اب وہ دور تھی۔ بی۔ ال۔ ام کا تیز تخن اسے سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں کی طرف اڑائے لئے جا رہا ہو گا۔

اور نعیم نے اپنے دل میں اس کے لئے جگہ سی محسوس کی۔ گویا وہ دل کے اندر سماتی چلی آ رہی ہے۔ اس کی ایک ایک بات اسے یاد آنے لگی۔ وہ تیز امریکی خوشبو جو وہ استعمال کرتی تھی، اس کی ہنسی کا انداز، اس کے لبوں کی مصنوعی سُرخی، اور یہ مصنوعی سُرخی نہ بھی ہوتی تب بھی اس کے ہونٹ بڑے سُرخ معلوم ہوتے، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت، اور اس کے جسم کی قربت، اس کے ہونٹوں کا مزا، اس کا لپٹنا گویا اس کا جسم نعیم کے جسم کا سہارا لے رہا ہے۔

سہ پہر کو وہ ہرونشا کے ساتھ لاسورس گیا۔ وہاں کراکسلے اور ہرونشا میں موت پر بحث شروع ہوئی۔ نعیم ذرا کھویا کھویا ہی سا رہا اور میکانکی طریقے پر دونوں کی باتیں سُنتا رہا۔ کراکسلے آکسفرڈ کے شستہ لہجہ میں کہہ رہا تھا "۔۔۔ ابھی تک آدمی محض اس ایک چیز کو فتح نہیں کر سکا۔ موت کو۔ یہ اس کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے موت اس کے تمام آلام کا راز ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو قومیں جنگ نہ کرتیں۔۔۔۔"

اور پھر کراکسلے کی تقریر خلا میں حل ہونے لگی۔ پھر نعیم کے سامنے ایلیس کا تصور اُبھرا۔ بوٹ ریل میں وہ اس کے ساتھ ہوتا اور وہ دونوں ڈبے میں اکیلے ہوتے۔ نعیم اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ریل سے فرانس کے مناظر دیکھتا جاتا۔۔

ہروشا کی آواز سنائی دی " زندگی سے عاجز آنے . . . "

کراکسلے نے جواب دیا " کیا تم زندگی سے عاجز ہو؟ کیا جب ہم بڈھے ہو جائیں گے تو زندگی سے سیر ہو جائیں گے؟ ہر سال جو گذرتا ہے کتنا افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک سال ختم ہو گیا۔ اور بڈھوں کو زندگی کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ بڈھا موت سے کتنا ڈرتا ہے؟"

ہروشا نے کہا " پھر بھی بڑھاپے میں موت نجات بن کے آتی ہے "

کراکسلے نے جواب میں کہا " نہیں یہ اس کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ موت نہ آنے والی ہو تو بڑھاپا بھی نہ آئے۔ اگر انسان موت پر فتح پالے تو وہ بڑھاپے کے ضعف کو بھی شکست دے دیگا۔ زندگی کی رو انسان کے جسمانی زوال کو اس قدر مدھم کر دے گی کہ جتنے برسوں میں انسان اب بڈھا ہو جاتا ہے اسے بڈھا ہونے میں اتنی ہی صدیاں لگیں گی ..... ؟

نعیم نے اپنے دل میں کہا کیا خرافات ہے۔ اس نے کہنا چاہا کہ روح کی ابدیت کے تصور کی وجہ سے انسان موت پر فتح پا چکا ہے۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ کراکسلے ضرور اس کی مشرقیت کی ہنسی اڑاتا۔ اس نے دیوار پر ٹنگی تصویر کو دیکھا۔ پھر سوچنے لگا۔ کیا وجہ تھی کہ اب میری پادل کا تعاقب کرنے میں، اس سے باتیں کرنے میں، اس کے ساتھ کھانا کھانے میں وہ لطف نہیں آتا تھا جو ایلس کے ساتھ رہنے میں آتا تھا میری پادل سے ایک رکاوٹ سی بڑھتی جا رہی تھی۔ میری میں تو پہلے ہی سے رکاوٹ تھی لیکن یہ رکاوٹ اسے بری کیوں نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کیوں میری کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاتے ہوئے اسے ایلس کا خیال آیا تھا؟ کیوں اسے یہ خیال آیا کہ ایلس میری سے زیادہ خوبصورت .....

اپنے اس سلسلۂ خیال سے وہ چونک پڑا۔ جیسے کوئی خواب میں لرز اٹھے ۔

اسے معلوم ہوا کہ دفعتاً اس نے اپنے دل کی گہرائی میں کوئی شے دیکھ لی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا کہ ایلیس اسے میری سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگی ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ـــــ دراصل میری بہت خوبصورت ہے۔ لیکن ایلیس اس کی اپنی چیز ہے۔ جیسے ماں کو اپنا ہی بچہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بغداد کی بدکردار خاتون کو اپنا حبشی غلام اچھا معلوم ہوتا ہے۔

ہروشا اور کرا کسلے اسی طرح موت پر بحث کر رہے تھے۔

"زورِ حرکتِ حیات؟......" ہروشا نے اپنے پائپ کا ایک کش لیا۔ اور کش بھی طنز کے انداز میں لیا۔ " یہ زندگی ہے کیا جو محض ایک کارتوس سے بجھائی جا سکتی ہے؟ یہ زورِ حرکتِ حیات کیا کہ اگر درجۂ حرارت ذرا کم ہو جائے تو اس کائنات کا خاتمہ ہو جائے۔"

کرا کسلے نے کہا "لیکن ارتقائے تخلیقی سے کارتوس اور درجۂ حرارت کا توڑ پیدا ہو جائے گا۔"

اور ہروشا نے اب پہلی مرتبہ ذرا جوش سے اپنا پائپ جھٹک کے کہا "میرے دوست یہ کبھی نہ ہوگا۔ اس وقت فرانس میں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ایک شخص ارتقائے تخلیقی کا افسانہ گھڑ رہا ہے اور ایک ہزار کارخانے کارتوس بنا رہے ہیں۔ یہ ہے آپ کا زورِ حرکتِ حیات۔ یہاں برگسوں اور نیتشے ملتے ہیں۔"

(۲)

اس رات نعیم کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ برگسوں یا نیتشے یا ارتقائے تخلیق یا زورِ حرکتِ حیات یا موت یا انگیرین کے خیال سے نہیں، ایلیس کے خیال سے اس کے

ول نے رات کے بارہ بجے کے قریب ارمان لی۔ اس کا حلق خشک تھا۔ اس نے اُٹھ کے پانی پیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کی ایک لہر سی آئی۔ اس کا دماغ تھکا ہوا سا تھا۔ اس نے رات کی تنہائی میں اپنے آپ سے اقرار کیا۔ مجھے جتنی محبت ایلیس سے ہے اتنی کسی سے نہیں ہوئی یلقیس ابتدائے شباب کا کھلونا تھی اور میری گل سُرخ ہے جو دور سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی کبھی اس کی خوشبو سونگھ لی مگر ایلیس۔ اور ایک خیال نے آہستہ سے اس کے دماغ میں جمنا شروع کیا۔ اگر ایلیس مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے تو ......

(۴)

تیسرے روز ایلیس کا خط آیا۔

جینوا

پیارے نعیم:

میں نے کل جینوا میں پہلی رات گذاری۔ جب میں سونے کو لیٹی تو مجھے خیال آیا کہ مہینہ بھر کے بعد یہ پہلی شام تھی جس میں ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تھے جس میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ نہیں لیا۔ مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ صبح کو جب میں سو کے اُٹھی تو اُوپر کی منزل سے باجے کی بڑی پیاری آواز آ رہی تھی۔ کوئی وائلن پر "پیاری نیلی ڈینیوب کے کنارے" والا راگ بجا رہا تھا۔ میری نظر جھیل پر پڑی اور یہ نغمہ اور بھی اچھا معلوم ہوا۔ ناشتے پر اپنے چچا سے بہت باتیں کیں۔ پھر شہر کی سیر کرنے انہی کے ساتھ گئی۔ آج شام میرے چچا نیپلز روانہ ہوں گے، جہاں سے وہ امریکہ جائیں گے۔

یہاں دھوپ ہے اور نیلا آسمان ہے، اور نیلی جھیل ہے اور میں ہوں، عجیب بات ہے میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ پیرس سے دور ہونے کی وجہ سے میرے خیالات صاف ہو کر میرے سامنے آ رہے ہیں۔ میں ان میں تمیز کر سکتی ہوں۔ معلوم نہیں کیوں یہ احمقانہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا کہ تم میرا بڑا خیال کرتے ہو، مجھے بہت چاہتے ہو۔ یہ تو میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے عشق نہیں۔ پھر تمہارا اس طرح میرے ساتھ ساتھ پھرنا، ہر بات میں میرا لحاظ رکھنا تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ بار بار تمہارا خیال آتا ہے۔ اب تک جب کبھی تم نے مجھ سے عشق جتایا، میں نے تمہیں جھٹلایا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ یقین کر لوں کہ تمہیں مجھ سے عشق ہے، لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ کیونکہ ... ... معلوم نہیں کیوں؟ ..... شاید اس لئے کہ جب تم میری پاؤں کی طرف دیکھتے ہو تو معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہیں اس کے بالوں میں پھنس کے رہ گئیں ...... معاف کرنا مجھے ذرا سی جلن معلوم ہوئی۔ حالانکہ میری بچی مجھے بھی بڑی پیاری لگتی ہے۔

معلوم نہیں تم نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی؟ مگر میرے پیارے نعیم میرے متعلق کوئی بُری رائے قائم نہ کرنا۔ اس سے میرے دل کو تکلیف ہوگی۔ کسی دن میں آپ ہی بن جاؤں گی کہ تم میرے متعلق جو رائے قائم کرو گے وہ اچھی ہی ہوگی۔

میرے دل میں پھر ایک خیال آیا۔ یہ خیال کہ یہاں ایک نوجوان اس وقت مجھے گھور رہا ہے۔ اس نے آج لنچ کے وقت میرے چچا سے اور مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ امریکن ہے۔ اس کا قد اونچا ہے، بال سیاہ ہیں اور خوبصورت ہے ــــ اگر تم جل رہے ہو تو معاف کرنا ــــ اس نے مجھے آج رات ناچنے کی دعوت دی۔ میں نے انکار کر دیا۔ کیوں انکار کر دیا؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جس طرح پیرس میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تمہارے سوا اور کسی

نوجوان کے ساتھ میں کیوں نہیں اِدھر اُدھر پھرتی ۔

یہ خط میں تمہیں ہوٹل کے صحن سے چائے پیتے ہی لکھ رہی ہوں ۔ چچا کو رخصت کرنے اسٹیشن جاؤں گی ۔ پھر آکے کھانا کھاؤں گی ۔ آج کی رات یہاں گنار کے کل لوزان جاؤں گی ۔

تمہیں معلوم ہے کہ اب میں کیوں اور کچھ نہیں لکھ سکتی ؟ اس لئے کہ گویا کوئی میرا ہاتھ روک رہا ہے ۔ اس لئے کہ میں ڈرتی ہوں کہ میں کہیں وہ بات نہ لکھ جاؤں جو میں چاہتی ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہونے پائے ۔ میرے اور تمہارے متعلق ایک بات ایسی ہے جو میں نہیں لکھ سکتی ۔ پیارے جب میں پیرس واپس آؤں تو مجھ سے اصرار نہ کرنا کہ میں وہ بات بتا دوں ۔

مجھے امید ہے کہ جلدی خط لکھو گے ۔ بہت بہت پیار ۔

الیس !"

(۵)

نعیم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔

کیا بات ہے جو اس نے نہیں لکھی ۔ کون سی ایسی بات ہے جو وہ چھپانا نہیں چاہتی ، اور چھپانا بھی چاہتی ہے ۔ چھپانا چاہتی تو اس کا ذکر ہی کیوں کرتی اور چھپانا نہیں چاہتی تو بتا دیتی ۔

"یقیناً ، ۔ یہ بھی مجھ سے محبت ہے ۔"

بار بار نعیم کا دل یہ فقرہ دہرا رہا تھا ۔ پہلی بار اسے محبت کا جواب محبت سے ملا تھا ۔ پہلی بار ایک اور دل نے دھڑک کر اس کا جواب دیا تھا ۔ وہ دوستی جس کی ابتدا نفریکی دست درازی سے ہوئی تھی اب بڑھ کر عشق بن گئی تھی ۔

اور نعیم نے ایک سرور محسوس کیا۔ اعلیٰ ترین کامیابی کا سرور۔ دور دور کسی قسم کی تلخی کا پتہ نہ تھا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس سرور میں ذرا بھی خلل ڈال سکتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سرور ساری کائنات پر چھا رہا ہے۔ اسے سڑک پر ٹرام کی گھڑگھڑاہٹ اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے اسے پیرس کی یہ گلی وسّ گنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ محبت کا جواب اسے محبت سے ملا تھا۔ اس وقت وہ سارے عالم پر چھایا ہوا تھا کسی تیسری طاقت کا وجود نہیں تھا۔

اس کا دل گا رہا تھا۔ اس کے خون میں باجے بج رہے تھے۔ اس نے فوراً ایلس کے خط کا جواب لکھنا شروع کیا۔

"میری پیاری ایلس!

تمہارے پیارے خط کا بہت بہت شکریہ۔ تمہارا خط ذرا غیر متوقع تھا۔ پہلے تو یہ کہ میری کے متعلق تمہارے دل میں جو شبہ پیدا ہوا وہ بے بنیاد ہے۔ میری تیسری بین الاقوامی جماعت کے لئے بنی ہے اور تم میرے لئے۔

مجھے تم ہی سے محبت ہے۔ اور اتنی محبت ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ پیاری تمہارے جانے کے بعد مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ مجھے تم سے کس قدر عشق ہے۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ تم سے ایک راز کی بات کہوں؟ تمہارے مقابل مجھے میری بدشکل معلوم ہوتی ہے۔

وہ کون سی بات ہے جو تم مجھے نہیں لکھ سکتیں؟ خدا کرے وہ بات وہی ہو جو میں سمجھ رہا ہوں۔ اگر میں اسے ٹھیک سمجھا ہوں تو یہ دنیا میرے لئے جنت ہے، اور اگر میں غلط سمجھا ہوں تو میری ناامیدی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

ایلس میں جانتا ہوں تم نئی دنیا کی ہو اور میں بہت پرانی دنیا کا۔ تمہارے والدین زندہ ہیں اور بہت امیر ہیں۔ کچھ بھی میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی ہے۔ ایک فضول سی خواہش جو میں تم سے کبھی بیان نہ کر سکوں گا۔ اس وقت بھی نہیں جب تمہارا سر میرے شانوں پر ہو یا تمہارے لب میرے لبوں سے ملیں۔ کیا تم مجھ سے شادی کر سکو گی؟ میں یہ تم سے لکھ کے پوچھ سکتا ہوں تمہاری موجودگی میں میری زبان یہ سوال نہ کر سکتی۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔

تمہارا نعیم"

(۶)

ایلس نے یہ جواب دیا۔

"پیارے نعیم!

تمہارے خط کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے اسے بار بار پڑھا۔ تم نے میرے ساتھ زندگی گذار دینے پر جو آمادگی ظاہر کی ہے اس سے کم از کم یہ تو مجھ پر ثابت ہو گیا کہ واقعتاً تم کو مجھ سے بہت محبت ہے، سچی محبت ہے۔ میرے نعیم بہت بہت شکریہ۔ لیکن تم نے جو لکھا ہے وہ اتنا غیر متوقع تھا، اس طرح دفعتاً تم نے ایک ایسا سوال کیا جس کے جواب کے لئے میں بالکل تیار نہ تھی۔ کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تمہیں کیا جواب دوں۔ میں سوچ رہی ہوں، برابر سوچ رہی ہوں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

اتنا میں کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں، دنیا بھر میں اور کسی کو نہیں کرتی میں جرات تمہیں اپنے گذشتہ خط میں لکھتے لکھتے رک گئی تھی، وہ یہی تھی کہ مجھے اپنے آپ پر یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔

شاید مجھے بھی تم سے اسی طرح محبت ہے، جس طرح تم کو مجھ سے ہے۔ لیکن ابھی شادی کا سوال میرے لئے ذرا قبل از وقت ہے۔ مجھے اپنی محبت کا کچھ اور یقین ہو جانے دو شاید دو چار سال کے بعد میں تمہارے ساتھ ہندوستان جانے کے خیال کی اپنے آپ کو عادی بنا سکوں۔ فی الحال تو یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن شاید اتنے دن تک تم انتظار نہ کرنا چاہو یا نہ کر سکو۔ ایسی صورت میں میرے پیارے نعیم میری یہ خطا معاف کر دینا۔

مجھ سے ایک بات کا وعدہ اور کرو، یہ کہ مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔ تمہاری دوستی کی میرے دل میں جو قیمت ہے، کسی کی دوستی کی نہیں۔ پھر ہم اسی طرح ملیں، ہنسیں، بولیں، ایک دوسرے کو پیار کریں لیکن اپنے خط کے مضمون کو تم بھی فی الحال بھول جاؤ۔ میں بھی بھول جاتی ہوں نعیم میری بات سمجھو۔ سمجھ گئے نا؟ میرا وطن بہت دور ہے اور تمہارا وطن بہت دور۔ اس دوری کو رفع کرنے کے لئے شادی سے پہلے ہم دونوں کو ایک، دوسرے کے بہت قریب آنا پڑے گا۔ یہ ممکن بھی ہے یا نہیں، میں کہہ نہیں سکتی۔ اس لئے فی الحال تو تم سے شادی کا خیال میں دل میں نہیں لا سکتی۔

پرسوں صبح کو میں پیرس واپس پہنچوں گی۔ تم مجھے لینے اسٹیشن آنا۔ اس دن اتفاق سے اتوار ہے دوپہر کا کھانا کھانے ہم دونوں کہیں باہر جائیں گے اور تیسرے پہر کو لوٹ آویلون چلیں گے۔

پیارے نعیم تمہارا بہت بہت شکریہ اور بہت بہت پیار۔

تمہاری ایلس!

(۷)

اس رات ڈیڑھ بجے جب نعیم کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گیا تو اٹھا اور سفید چادر

اپنے جسم پر لپیٹی۔ اس غصے اور مایوسی کے عالم میں بھی اسے شرارت سوجھ رہی تھی شاید ہروشا ڈر جائے۔ اس لئے اس نے ڈریسنگ گون نہیں پہنا تھا۔ آہستہ سے اس نے ہروشا کے کمرے کا دروازہ کھولا اور زور سے دروازہ بند کیا۔ اس آواز سے ہروشا یکلخت چونک پڑا۔

"کون ہے؟"

نعیم نے سوچا۔ معلوم نہیں مجھے زیزکا کی رُوح سمجھ رہا ہے یا روڈالف فان ہالپس برگ کی۔ میں اس کی جگہ ہوتا تو میری تو شاید گھگی بندھ جاتی۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی شکل کو بھوت نہ بھی سمجھتا تو چور تو ضرور سمجھتا۔

لیکن ہروشا جو صرف ایک ڈکٹیٹر سے ڈرتا تھا، چوروں سے بھی خائف نہ تھا۔ اس نے اُٹھ کے بڑے اطمینان سے کہا "یہ کیا ہے نعیم؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"ایلیس کی وجہ سے؟"

"ہاں!"

"کیوں کیا بہت یاد آ رہی ہے؟"

"نہیں اس نے لکھا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ کم از کم فی الحال۔"

"شادی؟ تم اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"ہاں!"

"حماقت کی کوئی انتہا ہوتی ہے۔"

"میں نسبت ہو جانے کے بعد تم سے اس کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ تمہاری ذہنی حالت ذرا غیر معمولی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی جلدی پھنس جاؤ گے۔"

"اب میں کیا کروں؟"

"جا کے سو رہو۔"

"شکریہ۔ یہ نسخہ تو میں آزما چکا ہوں۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ ہروشا میں بہت پریشان ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔" ہروشا نے کہا اور آہستہ سے دروازہ کھول کے نعیم سے کہا "ایک عورت کے لئے ساری رات کی نیند خراب کرنا، یہ کون سی عقلمندی ہے۔ جاؤ شب بخیر۔"

اور نعیم پھر صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔

(۸)

صبح سویرے جینوا سے گاڑی آئی تھی۔ اسٹیشن پہ ایلس کو لینے جب نعیم گیا تو وہ ہنستی ہوئی ہشاش بشاش اُتری۔ معلوم ہوتا تھا اس درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے اس نے جینوا جاتے وقت نعیم کا ہلکا سا بوسہ لیا تھا اب بھی لیا لیکن وہ بوسہ اتنا ہلکا تھا کہ نعیم کا دل اندر ہی اندر غصے اور پستی سے کانپنے لگا۔ ٹیکسی میں راستے بھر وہ سوئٹزرلینڈ کا ذکر کرتی رہی۔ اپنے یا نعیم کے خطوط یا ان کے مضمون کی طرف اس نے اشارہ بھی نہیں کیا۔ نعیم بھی "صم بکم" بیٹھا سنتا رہا۔ صرف اس کی خاموشی ترکِ موالات کر رہی تھی۔ اور اس خاموشی کی طرف ایلس نے کوئی توجہ نہ کی۔

ایلس کو اس کے بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کے نعیم نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا، اور خود

زیر زمین ریل سے واپس آیا۔ اپنے کمرے سے کتابیں لیں۔ انسٹی ٹیوٹ پہنچا۔ وہاں ایلس بھی آئی ہر دو سا ذرا دلچسپی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے وہ اسے نعیم کے ساتھ شان زلیزے کے ایک ترکی ریستوران گئی۔ وہاں سے بوآ دبولون بھی قریب تھا۔

کھانے کا بل بہت ادا ہوا۔ سے ایلس نے ادا کیا۔ "دراصل میں نے نہیں مدعو کیا تھا۔ اپنے خط میں۔ یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے اور اس خط کی اور بھی بہت سی باتیں یاد ہیں جو مجھ کو ذرا اچھی نہیں معلوم ہوئیں۔"

ایلس نے اس مضمون سے گریز کرنے کے لئے ہلکے سے تہدیدی لہجے میں کہا "نعیم!"

اس پر نعیم خاموش ہو گیا۔ دونوں آہستہ سے اس ریستوران سے نکلے۔ دھوپ اچھی خاصی تھی اور ایلس کے پیلے بالوں پر چمک رہی تھی۔

ایلس نے کہا "دھوپ ذرا تیز ہے۔"

"ٹیکسی پر چلو گی؟" نعیم نے رُوکھے اخلاق سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"میٹرو میں؟" نعیم نے اسی لہجے میں پھر سوال کیا۔

"نہیں میں پیدل چلوں گی۔" نعیم کی طرف اس نے پھر ذرا غور سے دیکھا۔ اب اس نے دیکھا کہ نعیم کے چہرے پر ملال کا کتنا اثر تھا۔ دھوپ میں اس کا غم اس کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ اس نے نعیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نعیم نے مسکرا کے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"نعیم! تم خوش اخلاق نہیں۔"

"معاف کرنا۔" نعیم نے تلخی کے ساتھ کہا "خوش اخلاق تو انسان ہوتے ہیں۔
میں تو تمہارے لئے کھلونا ہوں۔ سونے کا کھلونا!"

ایلس نے ندامت کے لہجے میں کہا "نعیم!"

کچھ دیر تک دونوں خاموش ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر ایلس نے اپنے ہاتھ سے نعیم کا بازو پکڑ لیا اور اس کے قریب ہو کے کہا "نعیم مجھے معاف کرنا میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتی لیکن حالات کا ۔ ۔ ۔"

نعیم نے تلخی کے ساتھ درشت لہجے میں کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے معاملات یہاں شاں زلیزے کے بھرے بازار میں طے کریں؟"

ایلس خاموش ہو گئی اور اسی طرح نعیم کا بازو پکڑے چلتی رہی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کے پیلے پیلے بال گرم ہو رہے تھے۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی ٹیکسی والے کو اشارے سے بلا لیتی۔

(۹)

بوئے دبولون (بولون کا باغ) بڑا خوبصورت باغ ہے۔ اس کا حسن دراصل بہار میں شب کا ہوتا ہے۔ جب اونچے اونچے درختوں کے درمیان ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوتی ہے اس کی نہروں اور چشموں کا پانی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ اس کی دھند کی تہ ہے۔ [illegible] راستہ طے کر کے جب ایلس اور نعیم اس باغ کے اونچے اونچے درختوں [illegible] پہنچے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایلس کے پیلے پیلے بال آفتاب کی زرد کرنوں [illegible] دھاریاں [illegible] گئے۔

ایک خاموش چمکتے ہوئے چشمے کے کنارے، ایک بلند بالا درخت کے سائے میں سبزے پر دونوں بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس سبزے کی کوئی انتہا نہیں۔ یہاں تک کہ وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتا تھا۔ دور ایک پتلی سی سڑک کی کالی لکیر تھی۔ جس پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی موٹر آتی یا دوسری طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس وقت بُرآ میں لوگ کم تھے۔

نعیم نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے ایلس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ایلس کی انگلیوں کی جوابی گرفت محسوس کی۔

اس کی ساری تلخی اور درشتی اب لجاجت میں بدل چکی تھی۔ اس نے نرمی کے ساتھ پگھلتی ہوئی آواز میں کہا "ایلس! میری اس وقت کی بدتمیزی کو معاف کرنا"

"پیارے کوئی بات نہیں" اور اس کی انگلیوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

نعیم نے اپنے آپ کو سبزے پر گھسیٹا اور اس کے ہونٹوں نے ایلس کی آنکھوں کو ایک ایک بار چوما۔

"پیاری!"

"کیا۔ پیارے؟"

"میں تم سے اس خط کے متعلق باتیں کر سکتا ہوں؟"

ایلس نے جواب زمین پر دراز تھی، سر کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

"ایلس! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے"

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ ایلس نے اسے جھٹلایا نہیں۔ ہمدردی سے ——— محبت سے زیادہ، ہمدردی سے ——— اس کی نگاہیں نعیم کے چہرے پر پیوست ہو گئیں۔ اس نے

نعیم کے پنجے کو پھر آہستہ سے دبایا اور کہا "ہاں مجھے معلوم ہے؟
"مجھے اتنی محبت اب تک کسی اور سے نہیں ہوئی"
ایلس کے چہرے پر محبت کی ہلکی ہلکی سنجیدگی برس رہی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"اور تم؟ تم محض میرا خیال کرتی ہو؟"
"نہیں۔ اس سے بہت زیادہ نعیم۔ مجھے بھی تم سے لگاؤ ہو گیا ہے۔ بہت بہت زیادہ۔ جتنا اب تک کسی اور نوجوان سے نہیں ہو سکا۔ معلوم نہیں کیوں تمہیں معلوم ہے کسی اور کے ساتھ میں کبھی تفریح کو نہیں جاتی"
"صرف لگاؤ؟"
"شروع شروع میں تو اسے میں محض لگاؤ سمجھتی تھی۔ ایک طرح کی گہری، سچی دوستی۔ لیکن اس مرتبہ جو میں تم سے کچھ دن جُدا رہی تم مجھے بہت یاد آتے تھے ..."
نعیم نے کچھ جواب نہیں دیا۔
ایک لمحہ وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے کہا "پہلی رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی اور میں سوچتی رہی۔ رفتہ رفتہ مجھ پر منکشف ہونے لگا کہ دوستی کا اثر اتنا گہرا نہیں ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر یہ انکشاف ہونے لگا کہ شاید مجھے تم سے ہلکی ہلکی محبت ہے۔ یہ تو میں نے تمہیں اپنے دوسرے خط میں لکھا تھا۔ کیوں؟"
"ہاں!"
"میں بھی تمہیں چاہتی ہوں۔ پھر تم کیوں ناراض ہو؟"
"تم نے مجھ سے شادی کرنے سے کیوں انکار کیا؟"
"میں نے قطعی انکار تو نہیں کیا۔ میں نے لکھا تھا کہ یہ قبل از وقت ہے۔ ابھی

میری عمر زیادہ نہیں۔ مجھے تجربہ کم ہے۔ مجھے اپنے جذبات کا کامل یقین نہیں۔ اس لئے مجھے ذرا ڈر معلوم ہوا۔"

"مجھ سے ؟"

"نہیں۔ بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم سے نہیں، شادی سے۔ شادی کے ذکر سے تم نے کچھ اس طرح دفعتاً یہ ذکر چھیڑا ہے میں اس کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔"

نعیم کے چہرے پر پھر وہی ملال کے بادل چھا گئے۔ اس کی آنکھوں سے کچھ ایسی مایوسی ٹپک رہی تھی کہ ایلس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ان آنکھوں کی مایوسی سے آزردہ ہوکر کہا "پیارے مجھے اس طرح نہ دیکھو۔"

نعیم نے مصنوعی اور طنزیہ اخلاق کے ساتھ کہا "پیاری۔ مجھے معاف کرنا۔" اس کی آنکھوں میں وہی مایوسی تھی۔ اس پر ایلس نے دفعتاً اس کا سر اپنے سینے سے لگا کے اس محبت کے انداز میں کہا جو والدین کو اپنے بچوں سے یا ایک جان نثار دوست کو دوسرے جان نثار دوست سے ہوتی ہے "نعیم میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔ میں نے تم سے مہلت مانگی ہے۔ دو سال، چار سال۔ اس عرصے میں تم کو بھی غور کرنے کا موقع مل سکے گا۔"

نعیم نے دو تین منٹ تک اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایلس کے دھڑکتے ہوئے دل اور اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ کو نعیم کا تنفس محسوس کر رہا تھا اور اس کا سخت سینہ، نعیم کے جلتے ہوئے چہرے کی حدت کو۔

بالآخر نعیم نے آہستہ سے کہا "پیاری۔ میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔"

اور گویا اس لفظ تنہا کے ساتھ اس کی خود اعتمادی، اس کی ارادیت میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔

"ہندوستان میں میرا کوئی قریبی عزیز یعنی ماں، باپ، بھائی بہن زندہ نہیں۔ میں تمہارے لئے اپنا وطن چھوڑ سکتا ہوں۔ ہندوستان میں میرا کوئی دوست نہیں جب سے تم مجھے مل گئیں، مجھے محسوس ہوا کہ اب میں اکیلا نہیں رہا۔ اب کوئی اور بھی ہے جو میرا ساتھ دے گا۔ جب ہروشا چیکوسلواکیا چلا جائے گا تب بھی تم میرے ساتھ رہو گی۔ تمہارے لئے میں ہر چیز چھوڑ دوں گا۔"

ایلس کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نازک ترین نفسیاتی لمحہ قریب آرہا تھا۔ اس نے اندھیرے میں اس لمحہ کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا "اور اگر تمہارے ماں، باپ، بھائی، بہن ہوتے تو کیا تم ان کو میرے لئے چھوڑ دیتے؟ کیا تم اس پر بھی تیار ہو جاتے کہ ہندوستان واپس نہ جاتے اور یہیں رہ پڑتے یا میرے ساتھ امریکہ چلتے؟"

نعیم کی زبان سے بے اختیار "ہاں" نکل گیا۔ اسی وقت اس کے دل کے اندر سے کسی باطنی طاقت نے کہا "چل جھوٹے۔"

ایلس نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں "نعیم جینوا میں میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے اپنے ماں باپ کو چھوڑنا پڑے تب بھی میں تمہارے ساتھ رہنے پر آمادہ ہوں گی یا نہیں؟ اور اس وقت مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ تم مجھے اپنے ماں باپ سے زیادہ پیارے ہو۔ نعیم میں تمہارے لئے سب کو چھوڑ دوں گی۔ دیکھ لینا سب کو چھوڑ دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ ہندوستان چلوں گی۔ مجھے ہندوستان سے ڈر معلوم ہوتا ہے پھر بھی میں تمہارے ساتھ ہندوستان چلوں گی۔ لیکن ابھی مجھے مہلت دو۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

"مگر پیاری کیوں؟" نعیم کی آغوش کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔
ایلس نے آہستہ آہستہ اپنے کو چھڑاتے ہوئے کہا "معلوم نہیں کیوں۔ شاید عورت کی جبلت جو مجھ میں ہے ۔ ابھی میں یہ سب کچھ اچھی طرح نہیں سمجھی صرف محسوس کر سکی ہوں۔ مجھے کچھ مہلت دو۔ چار سال نہیں تو دو سال کم سے کم ایک سال، جب تم ہندوستان واپس جانے لگو گے تب؟"

نعیم نے مجنونانہ جوش سے اس کے جسم کو اپنی آغوش میں لیا۔ اور اس طرح جیسے کوئی ہارتا ہوا فریق آخری مدافعت کرے، اس نے کہا "میں تمہارے لئے زندگی بھر انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ مگر میری پیاری، میری جان، نسبت ہو جانے میں کیا حرج ہے؟ تمہیں اطمینان نہ ہو جائے گا؟"

دونوں کے لب ملے نعیم ان لبوں کو اب تک ہزاروں بار چوم چکا تھا چوس چکا تھا۔ لیکن آج ان میں وہ نمی تھی، وہ گداز تھا، وہ لطافت تھی، وہ سحر تھا کہ اسے معلوم ہوتا تھا اس نے آج تک اس عورت کا بوسہ ہی نہیں لیا تھا جو اب اس کی بیوی بننے والی تھی۔ گویا اس عورت کے ہونٹ دل کو تراش کے بنائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ایلس کا جسم جو اس کی آغوش میں تھا اسے عزیز معلوم ہونے لگا۔ اتنا عزیز جس کی کوئی انتہا نہ تھی یہ جسم گویا اب اس عورت کا جسم نہ تھا، یہ اسی کے رگ و پوست اسی کے خون کا لطیف ترین حصہ تھا جس نے اس کے جسم سے الگ ہو کے اس عورت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس مرتبہ جب اس کے ہاتھوں نے ایلس کے سخت سخت سینے کو چھوا، تو اس کے ہاتھ اس کی تحقیر سی نہیں کر رہے تھے۔ ان کا لمس انہیں پیار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایلس کے پیلے پیلے بال بھی اس کے اپنے ہی جسم و جان کا ایک حصہ

ہو گئے تھے۔ لُو آدِ پولون میں اس سہ پہر کو ایک جاندار ہستی روحانی طور پر اس کے جسم و جان کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اب وہ دنیا میں تنہا نہیں تھا۔

اور وہ خواہش جو ایلس کی دوستی کے ساتھ ظہور میں آئی تھی، ایلس کے جسم ایلس کے کنوارپن کو فتح کرنے کی خواہش، اب اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ ایلس اب بھی کنواری ہی تھی۔ لیکن وہ احترام جو ایک عرصے سے آہستہ آہستہ نعیم کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اس ایک لمحے میں جذبۂ پرستش بن گیا۔ اس کی محبوبہ، اس کی ہونے والی بیوی، کسی سے، یہاں تک کہ خود اس سے آلودہ نہیں ہوئی۔ مشرق کا تصورِ عصمت اسے ایلس کے اطراف اس وقت اس طرح چھایا ہوا نظر آ رہا تھا جیسے ماہتاب کے گرد ہالہ۔

اس وقت نعیم کے دل میں کوئی شک نہ تھا جیسے اس وقت آسمان پر تیز، پاک سورج چمک رہا تھا اور کہیں ابر کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آتا تھا، جس سے یہ نیلی فضا مکدر ہوتی۔

(۱۰)

دونوں نے طے کر لیا تھا کہ نسبت پوشیدہ رہے۔ گذشتہ رات کو جس سرد مہری سے ہر وشا نے بجائے چارہ سازی اور غمگساری کے ناصح کی خدمت انجام دی، اس پر نعیم کو اتنا غصہ تھا کہ وہ ہر وشا سے اپنی کامیابی کا راز چھپانا چاہتا تھا۔ ایلس اس لئے اس کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی کہ وہ پہلے اپنے باپ کو اس کی اطلاع کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد اسے معلوم تھا کہ طوفان آئے گا۔ مگر اس کا بھی یقین تھا کہ طوفان گذر بھی جائے گا۔

وہ تین دن دلی محبت کے کیف و سرور میں گذرے خصوصیت سے نعیم کے لئے، اس زمانے میں وہ رومیو اور جیولیٹ پڑھ رہا تھا۔ دنیا کی کوئی ہیروئن جیولیٹ سے زیادہ

دلکش، جولیٹ سے زیادہ "لطیف" نہیں "لطافت" نرمی، گداز، دل کی نرمی، جسم کی
رمی، رُوح کی نرمی، یہی وہ چیز تھی جو اسے اپنی اور ابلس کی محبت کی اصل معلوم ہوتی تھی۔
کہیں جذبات کی آندھی نہیں تھی، کہیں طوفان نہیں، کہیں طغیانی نہیں، کوئی زور و شور نہیں،
کوئی ہلچل نہیں، محبت کی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے بُوآ دِ لولون یا فا اُنی کی بحرِ طویل
میں نسیم بسیم، ہلکی ہلکی ہوا۔ ہر طرف سکون ہی سکون۔ ایسا سکون، ایسا لطیف سکون، ایسی
لطافت جو اس کی رُوح نے آج تک محسوس نہیں کی تھی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا کہ
صوفیائے کرام جب خدا سے لَو لگاتے ہوں گے تو ان کی رُوحیں کیسا سکون، کیسا لطیف
سکون محسوس کرتی ہوں گی کائنات کا سارا جوش و خروش اجزائے کائنات کا سارا تصادم
ختم ہو چکا تھا زمین اسے خوابیدہ سکون کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

یکایک اس جنّت کے دروازے پر ابلیس نے دستک دی۔ جنّت سکون ہے، اور
زندگی کی ہر اٹھتی ہوئی موج ابلیس۔ ایک رات کو جب نعیم ابلس کو اس کے بورڈنگ ہاؤس
چھوڑ کے واپس آیا تو ایک حسد کے زہریلے سانپ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

کیا ابلس فی الحقیقت کنواری ہے؟

یا صرف میں بیوقوف بن رہا ہوں؟

اور اس کے جسم میں آہستہ آہستہ زہر پھیلتا گیا پھیلتا گیا۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔
صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگی مگر زہر چڑھتا گیا چڑھتا گیا۔ دن چڑھنے لگا۔
دھوپ میں اس کا جسم اس کے دل سے اپنا حصہ مانگ رہا تھا۔

نواں باب

امریکہ کا ایک طیّارہ

ایک اور طرح کا سانپ ابلیس کی جنت کے دروازے پر بھی پھنکار رہا تھا۔ اب تک وہ نعیم کو ایک اجنبی رفیق سمجھتی رہی تھی۔ نعیم کے وطن سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اب جب نعیم کے ساتھ ہندوستان جانے کا خیال پیدا ہوا تو قدرتی طور پر ہندوستان کے متعلق اسے کھوج ہونے لگی۔ ہندوستان کے متعلق دو تین فلم جو اس زمانے میں پیرس میں دکھائے جا رہے تھے اس نے نعیم کے ساتھ دیکھ ڈالے۔ ان فلموں سے ہندوستان کی زندگی کا ذرا برا ہی اندازہ ہوتا تھا۔ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس نے کپلنگ کے ناول اور افسانے پڑھنے شروع کیے جو اس زمانے میں فرانس میں بہت مقبول تھے۔ آہستہ آہستہ شادی سے خوف کی وجہ اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ در اصل وہ ہندوستان جانے سے ڈرتی تھی۔ "تپتے ہوئے میدان، اتنا گرم سورج کہ صرف گرم ہوا سے لوگ وہاں مر جاتے ہیں۔ "رینگتی ہوئی چیزیں" ---- یہ فقرہ اس کی

ابھار تھا۔ اس میں چھپکلیاں، بچھو، کیڑے، پتنگے، سانپ سب ہی شامل تھے کیسا عجب ملک ہوگا۔
اور وہاں کے انسان، صرف ایک ہندوستانی سے مل کے وہ ہندوستان کا کیا خاک اندازہ کر سکتی۔ کیا وہ جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ کیا جیسا انگریزوں کا خیال ہے، صرف راجاؤں مہاراجوں کو رہنے کے مکانات ملتے ہیں۔ باقی سب جنگلوں، جھونپڑوں، ٹیٹوں کے گھروں میں رہتے ہیں۔ کیا وہاں کے مرد ظالم ہوتے ہیں اور عورتوں کو بند کر دیتے ہیں، انہیں مارتے ہیں۔ کیا وہاں ایک ایک مرد کئی کئی شادیاں کرتا ہے۔ نعیم کا کس طبقے سے تعلق ہے؟ مجھے کیسے لوگوں میں رہنا ہوگا؟ کیا وہاں لوگ مجھ سے نفرت کریں گے؟ اور نفرت کریں گے تو میں کس حد تک اسے برداشت کر سکوں گی؟ میں کتنے سال میں ایک بار امریکہ جا سکوں گی؟

نعیم نے اسے کپلنگ اور اس قسم کے دوسرے مصنفین کی زد سے بچانے کے لئے ای۔ ایم۔ فارسٹر کی "سفرِ ہند" پڑھنے کو دی۔ اس سے اسے ہندوستان کے تمدن کا خفیف سا اندازہ تو ضرور ہوا مگر زیادہ تسلّی نہیں ہوئی۔ اس کتاب سے بھی یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ سفیدوں اور سانولوں کی دوستی ہندوستان میں نہیں نبھ سکتی۔

یہ نعیم کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ایلس اور نعیم کے دونوں انگریز دوست جیمز کرا کسلے اور میری پاول بہت فراخ دل تھے۔ میری پاول نے تو ایلس کو صاف صاف یہ مشورہ دیا کہ جس طرح تم سمجھتی ہو کہ تم خوش رہ سکو گی وہی راہ اختیار کرو۔ انسان دنیا کے ہر ملک میں خوش رہ سکتا ہے، ہندوستان یا امریکہ کی کوئی قید نہیں۔ میری پاول نے کرا کسلے یا ہروشا سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کرا کسلے یوں ہندوستانیوں کی تعریف ہی کیا کرتا تھا۔ اس اشتراکی اور اشتمالی پس منظر میں ایلس کو ذرا تسکین سی معلوم ہوئی۔

میری پاول نے ایلس کو یہ رائے بھی دی تھی کہ اپنے والد کو ضرور لکھ دینا۔ ان سے چھپانا

بیوقوفی کی بات ہوگی اور ویسے یا سویرے انہیں تمہاری اس نسبت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

(۲)

اس ہفتے نعیم کی نیند پھر غائب ہوگئی۔ رات کو تین تین چار چار بجے تک وہ نہ سوتا کچھ کچھ تو اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں ایلس ہندوستان سے بدگمان نہ ہو جائے لیکن اس خیال کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ آہستہ آہستہ لیکن مضبوطی سے شک اس کے دل میں جاگزیں ہو رہا تھا۔ شک ـــــ جو دلوں اور روحوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے کہیں وہ غلطی تو نہیں کر رہا ہے؟ کیا ایلس اس سے وفاداری کرے گی؟ کہیں اس کا بھی تو مسز چند کا سا حال نہ ہوگا؟ اور ـ اب بھی، اب بھی وہ کنواری ہے یا نہیں؟ یا وہ اسے دھوکا دے رہی ہے اور وہ بے وقوف بن رہا ہے؟ اس نے بے چینی سے بستر پر کروٹ بدلی۔ کیا وہ سچ مچ کنواری ہے؟ وہ لطیفہ جو اسے شجاعت نے سنایا تھا "ایک اجنبی کئی گھنٹے سے ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کے مجسمے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ لندن کا ایک خاموش اور باوقار پولیس مین اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ آخر جب رات کے بارہ بج گئے تو اس نے پوچھا "آپ کیا ڈھونڈھ رہے ہیں؟" اجنبی نوجوان نے کہا "میں کسی کنواری کا منتظر ہوں۔" پولیس مین نے کہا "یہ پہچان لینا تو بہت آسان ہے کہ کوئی لڑکی کنواری ہے یا نہیں کیونکہ جب انگلستان کی کوئی کنواری لڑکی اس جگہ سے گذرتی ہے تو نیلسن کا مجسمہ اپنی ٹوپی اتار کے جھک کر اس کی تعظیم کرتا ہے اور یہ دونوں پتھر کے شیر چھینکتے ہیں۔"

جو راستہ اس نے چنا ہے وہ مناسب بھی ہے؟ کیا وہ زندگی سے یہی چاہتا تھا؟ کہ وہ کسی ایک لڑکی کا ہو جائے اور پنجاب یا مدراس کے کسی ضلع کے مستقر پر اس کے ساتھ اپنی زندگی گذار دے۔ سال میں ایک بار چھٹی لے کر اسے خرید و فروخت اور سیر کرانے بمبئی یا

دہلی لے جائے اور جب اس پر کسی انگریز یا کسی فیشن ایبل ہندوستانی کی للچائی ہوئی نظر پڑے تو جل کے کباب ہو جائے۔ پھر وہ ایلس کے ساتھ اپنے مستقر کو واپس ہو۔ اور پھر چاندنی رات اور گرمی۔ یا سردیاں اور کمرے کی چار دیواری اور جھینگروں کی آواز۔

اور بلقیس؟ کیا بلقیس کا ملنا اب بالکل ناممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ جب وہ ہندوستان واپس ہوگا تو اس کے قدموں کے نیچے ہندوستان کی مٹی تھرائے گی۔ اس سے زیادہ قابل اور تیز دماغ نوجوان جنھوں نے اپنے قومی یا انتشار کی جنون میں آئی۔ سی۔ ایس کی طرف توجہ نہیں کی اور پھر پچھتا کے یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہو گئے یا آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے، اس کی طرف حسد سے دیکھیں گے۔ اس وقت خانم قدموں پر گر کے اپنی لڑکی کا اس سے بیاہ کریں گی۔ مگر۔ ... مگر ..... اب تو یہ سارے تصورات بعد از وقت تھے۔ نور کے تصویر خانے سے کسی نے مونالیسا کی تصویر چرا لی تھی۔ اس کی جگہ میٹرو گولڈن میئر کمپنی کی ایک حسینہ، ایک ستارۂ سینما کی تصویر تھی جس کے بال پیلے تھے . . .

ایلس شادی ہونے کے بعد ضد کرے کے ضرور سال دو سال میں ایک آدھ مرتبہ امریکہ جایا کرے گی اور نوکری کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ نہ جا سکے گا۔ اور وہ اسے روک بھی تو نہ سکے گا۔ کیونکہ ایلس کو اپنے باپ کا کچھ حصہ تو ملے گا۔ پھر؟ ..... پھر؟ اور اسے برائٹن کا ایک واقعہ یاد آگیا جہاں وہ آکسفورڈ سے ہفتے کے ختم پر گیا تھا۔ وہاں ایک ہندوستانی کی منکوحہ جو چند ماہ کے لئے ہندوستان سے آئی تھی، ایک انگریز لڑکے سے لپٹی ہوئی سمندر کے کنارے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اور اس کے جسم کا رشتہ رشتہ کہہ رہا تھا۔ میں سفید چمڑے سے وصال کے لئے ترس گئی ہوں۔ چونکہ وہ اسی ہوٹل میں تھی جس میں نعیم ٹھہرا تھا، اس لئے اس نے اسے پہچان لیا تھا۔

اب مشورہ لینے کے لئے نعیم نے پہلی بار کسی ہندوستانی سے قربت کی ضرورت محسوس کی۔ بہت سے بددماغ اور غلط خیال ہندوستانی طالب علموں کی طرح اس کا بھی یہ اصول تھا کہ ہندوستان واپس جا کے تو اپنے ہم وطنوں میں ساری عمر گذارنا ہی ہے، ان سے یورپ میں جس قدر بچا اچھا ہے۔ اس کے دوست سب کے سب انگریز، یورپین اور امریکی تھے۔

اس نے شجاعت کو ایک خط لکھا اور اسے ریو دے ریولی میں ایک کیفے میں چائے پر بلایا۔ شجاعت سے اس کی زیادہ دوستی نہ تھی۔ مگر چونکہ پیرس کے ہندوستانیوں کے حلقے میں شجاعت کی حیثیت مرکز کی سی تھی اور وہ ہر ایک کی تھوڑی بہت مدد کرتا تھا اس لئے محض ذہنی اور نظری مشورہ لینے میں نعیم نے کوئی ہرج نہ سمجھا۔

شجاعت نے کہا "بھئی دو صورتیں ہیں۔ اگر تم بیوی سے عصمت، عفت وغیرہ کے طالب ہو تو یہاں مت پھنسو۔ ہندوستان میں تمہیں اپنے مطلب کی گھر والی مل جائے گی، دبکی رہے گی، جتنا چاہنا اتنا فیشن کرانا اس سے زیادہ نہ بڑھنے دینا۔ ایک آدھ وقت مار بیٹھو گے تب بھی بیچاری خاموش ہو جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر تم کو واقعی اس امریکن لڑکی سے محبت ہے تو محض محبت کی خاطر شادی کرو اور عصمت، عفت کو ڈالو چولہے میں، ان ڈھکوسلوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ اگر لڑکی شریف ہے تو ممکن ہے ٹھیک طرح رہے، اگر نہیں رہی تو الگ ہو جانا۔ یہی نا کہ آدھی تنخواہ کٹوا لے گی، تم تو کہتے ہو کہ شریف ہے اور گھر کی کھاتی پیتی ہے۔ تم کو بیوقوف بنانے کے لئے تو شادی کر نہیں رہی ہے تم خود اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس لئے اگر الگ ہوئی تو آدھی تنخواہ بھی نہیں کٹوائے گی پھر کیا ہے مزے ہی مزے ہیں۔" بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد شجاعت نے پھر نعیم سے کہا "بھئی میں تو کسی یورپین یا امریکن لڑکی کے اتنی عمر تک کنواری رہنے کا

قائل نہیں، لیکن اگر تم کو اطمینان ہی کرنا ہے تو کر کیوں نہیں لیتے ؟"

(۳)

اسی شام کو نعیم ایلس کو فولی برژیر لے گیا۔ محض اپنے حملے کے لئے نفسیاتی ماحول کو ٹھیک بنانے۔ وہاں سے ایک نائٹ کلب کو جہاں تقریباً بالکل برہنہ لڑکیاں ناچ رہی تھیں اور ایک شخص بڑی جاندار آواز میں شہوت انگیز فرانسیسی گیت گا رہا تھا۔ ایلس کو اس نظارے سے ذرا گھبراہٹ معلوم ہونے لگی۔ اور نعیم ڈرا کہ کہیں نفسیاتی اثر اُلٹا نہ ہو۔ وہ ایلس کو اپنے کمرے میں لایا۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے لیکن نسبت کے بعد سے ایلس کبھی کبھی بہت رات گئے تک نعیم کے یہاں رہتی۔

ایلس نے گھر جانے پر اصرار کیا۔ نعیم نے کہا "بہت دیر ہو چکی ہے۔ کوئی ٹیکسی ملے گی نہیں اور پیدل جائیں تو دیر لگے گی۔ تم یہاں میرے پلنگ پر سو جاؤ۔ میں فرش پر سو جاتا ہوں۔"

یہ وہ نسخہ تھا جسے یورپ بھر میں لاکھوں بار دہرایا جا چکا تھا اور جو ہزاروں بار کامیاب ہو چکا تھا۔

فرش پر سونے کا تو محض بہانہ تھا۔ جب پلنگ پر اس کا منگیتر اس سے لپٹ رہا تھا تو نیند اور شامپین کے اثر میں وہ اسے ہٹاتی کیسے ؟ اس نے شروع شروع میں نعیم کے بوسوں کا جواب بوسوں سے دیا۔ پھر جب نعیم کے ہاتھ اسے بہت بے قابو کرنے لگے تو اس نے اسے ہٹانا چاہا۔ اس سے کہا بھی کہ "جاؤ۔ اب سو جاؤ۔" جب اس نے دیکھا کہ نعیم اس پر بھی نہیں مانا اور ہاتھوں کی جگہ اس کا جسم زیادتی کرنے پر تُلا ہوا ہے تو اس نے بڑی منت سے کہا "پیارے۔ شادی سے پہلے نہیں۔ میں تمہاری خوشامد

کرتی ہوں، ابھی نہیں، شادی سے پہلے نہیں۔"

لیکن خود اس کا جسم اور اس کے خون کی حدت، نعیم سے اور شامپین کے اثر سے سازش کرنے لگے۔ وہ سسکیاں لے کے رونے لگی۔

وہ ساری رات اس نے ایلس کے ساتھ گزاری۔ ایلس کے آنسو جو جسمانی اور ذہنی تکلیف سے نکلے تھے، رک گئے۔ وہ بے خیالی میں نعیم کے بوسے لیتی رہی اور لیٹتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح کو جب وہ جانے لگی تو نعیم نے اس سے کہا۔ "جو کچھ ہوا اس کا تمہیں افسوس ہے؟"

اس نے پیار سے نعیم کی طرف دیکھ کے کہا "نعیم پیارے میں ڈر رہی تھی۔"

نعیم نے اس کا ہاتھ چوم کے کہا "اس خیال سے کہ کہیں بچہ نہ ہو؟ ایسا معلوم ہوا تو ہم فوراً شادی کر لیں گے۔"

اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا "شکریہ۔ ڈارلنگ!"

نعیم نے کہا "اور آئندہ سے میں بڑی احتیاط کروں گا۔"

ایلس نے آہستہ سے "ہاں" کہا۔ اس کا ہاتھ اسی طرح نعیم کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ یک لخت اس کی طرف مخاطب ہوئی۔ اس کے پیلے بالوں نے ریشمی نور کا ایک نیم وائرہ سا ہوا میں بنایا اور پھر اپنی اپنی جگہ جم گئے۔ اس نے کہا "مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بڑی قدامت پسندی کی بات ہے.... لیکن.... لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھ میں وہ پاکی باقی نہیں رہی۔"

پاکدامنی کا تصوّر محض مشرق کی میراث نہیں۔

(۴)

لیکن ایلس کے دل میں ہندوستان کے متعلق شکوک بڑھتے ہی گئے۔ پورا لوورڈ تا ایام میں جس امریکی خاندان میں وہ آتی جاتی تھی، وہاں اس نے اپنی نسبت کا راز تو نہ بتایا تھا لیکن اس تاریخی رات کے بعد جو دن آیا اس میں ایک عجیب اتفاق پیش آیا ۔ ایسے ہی اتفاقات زندگی کے اہم ترین مسائل پر بڑے گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ اس امریکی خاندان نے لنچ پر ایک پنشن یافتہ انگریز لفٹننٹ کرنل کو بلایا تھا جو ساری زندگی ہندوستان میں گذار چکا تھا۔

ایلس نے لفٹننٹ کرنل سے پوچھا "ہندوستان تو بڑا ہی دلچسپ ملک ہوگا۔"

ایلس کی میزبان نے اپنی مچھلی ختم کر کے کانٹا رکھتے ہوئے کہا "میں ہمیشہ ہندوستان جانے کی تمنا کرتی رہی۔ بتائیے کیسا ملک ہے؟"

لفٹننٹ کرنل ریزے نے کہا "مجھے ہندوستان بہت پسند ہے۔ اعلیٰ درجے کا شکار، بنگلے، نوکر چاکر، پہاڑی اسٹیشن۔ میری رجمنٹ تقریباً ہندوستان کے ہر حصے میں رہ چکی ہے۔"

یہ لفٹننٹ کرنل کسی طرح بھی کرنل بلمپ سے مشابہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ نہ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ نہ انداز گفتگو میں پختہ صاحبیت تھی۔ بلند قد، داڑھی مونچھیں صاف، آنکھوں میں البتہ ذرا تیز تیز چمک۔ ایلس نے دل میں کہا "یہ متعصب نہیں ہو سکتا۔"

پھر اس نے پوچھا "وہاں گرمی بہت ہوتی ہوگی۔"

"بہت" کرنل ریزے نے جواب دیا۔ "ایک بار گرمیوں کا موسم مجھے راولپنڈی میں گذارنا پڑا تھا۔ میرا سارا جسم جھلس گیا۔"

"کیا مصیبت ہو گی؟" امریکی میزبان خاتون نے کہا۔
ایلیس نے اس اظہارِ ہمدردی کو نظر انداز کر کے کہا "راولپنڈی کہاں ہے؟"
"پنجاب میں۔" کرنل ریفرے نے کہا "پنجاب ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک صوبہ ہے۔ میں بتاؤں اسے پنجاب کیوں کہتے ہیں۔ اُردو اور پشتو میں پنج کہتے ہیں پانچ کو۔ آب کہتے ہیں ندی کو۔ اس صوبے میں پانچ ندیاں بہتی ہیں۔"
"کتنی دلچسپی کی بات ہے۔" امریکن میزبان نے ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔
پھر ایلیس نے اسی طرح یک لخت سوال کیا "اور حیدرآباد کہاں ہے؟"
"کون سا ہائی ڈرا باڈ؟" کرنل ریفرے نے پوچھا "ایک ہائی ڈرا باڈ سندھ میں ہے اور ایک ڈکن میں۔ ڈکن پشتو میں ساؤتھ (جنوب) کو کہتے ہیں۔"
اس پُر معلومات تصریح کے بعد ایلیس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ہندوستان کے متعلق مزید جغرافیائی معلومات حاصل کرے۔
لیکن اب کرنل کی باری تھی۔ اس نے شکار کے قصے اور اپنی رجمنٹ کے کارنامے شروع کئے۔ جن میں بدمعاش دیسیلوں کی شرارتوں کا ذکر تھا۔ ان بدمعاش کالی چمڑی والوں کو ذرا سر چڑھاؤ تو مصیبت ہو جاتی ہے۔"
ایلیس نے احتجاج کے طور پر کہا "یہ تو ہندوستان کے غریب اور جاہل طبقے کا حال ہو گا۔ لیکن وہاں متوسط طبقے کے لوگ تو بڑے شائستہ ہوں گے۔"
لیکن اس کا کیا علاج کہ انگریز کرنل جس نے ساری عمر ہندوستان میں گزاری تھی وہ متوسط طبقے کے ہندوستانیوں کے وجود کا قائل ہی نہ تھا "کچھ بابو لوگ ضرور ہماری نقل کرتے ہیں۔" ان بابوؤں کے سوا کسانوں اور راجاؤں کے درمیان

اس نے ہندوستان میں کسی مخلوق کو نہ دیکھا تھا۔
پھر وہ مہاراجاؤں کے ساتھ اپنے شکار کے قصّے سُنانے لگا۔ کس طرح وہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو، دو دو سو بیویوں کے حرم رکھتے ہیں۔ اور یہ راجاؤں ہی پر کیا موقوف ہے، ہندوستان میں شاید ہی کوئی آدمی ہو جس کی دو تین بیویاں نہ ہوں۔
ایلس نے کہا "میں تو سمجھتی تھی کہ ہندوستان میں عورتیں کم ہیں جب ہی تو ہندوستانی نوجوان غیر ملکوں کی عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں"
کرنل ریلزے نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ جواب نہیں دیا اب وہ ایلس کی دلچسپی کا راز سمجھ گیا تھا۔
لیکن ایلس وہاں سے نکلی تو سوچ میں تھی۔

(۵)

سہ پہر کو ایلس نے نعیم سے اس ملاقات کا اور ہندوستان کے متعلق کرنل ریلزے کے بیانات کا ذکر کیا۔
"تم جانتی ہو نا کہ یہ سب جھوٹ ہے"
"ہاں پیارے۔ بالکل جھوٹ۔ میں جانتی ہوں جتنی نفرت تم لوگ ان لوگوں سے کرتے ہو بجا ہے"
نعیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ایک لحظہ کے لئے اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ اس کے دلی شکوک نعیم پر آئینہ ہوگئے۔
اسی وقت ٹیلیفون کر کے نعیم نے شجاعت اور اس کی البانوی محبوبہ جلیبہ کو رات کے کھانے پر شان زلیزے کے ترکی ریستوران میں مدعو کیا شاید اس کے سوا ایک اور

ہندوستانی نوجوان سے مل کے ایلس کی رائے بدلے۔

رات کے کھانے پر ایلس کو شجاعت کی باتوں سے اچھی خاصی دلچسپی ہوگئی۔ اس نے ہندوستان کے شہروں، دیہاتوں اور قصبوں کا ذکر کیا۔ وہاں کے سیاسی حالات کا جس میں 'مجھ سے گاندھی جی نے یوں کہا اور میں نے مسٹر نہرو سے کہا کہ اصل غدار آپ ہیں' اور اس قسم کی اور بھی رائیں تھیں لیکن ظاہر ہے ایلس کو وہاں کی سیاسیات سے کیا دلچسپی ہوتی۔ اس نے وہاں کی زندگی کے متعلق پوچھنا چاہا۔

"کیا ہندوستانی لڑکیوں کو لڑکوں سے ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا؟"

"وہاں تو دو الگ الگ کیمپ ہیں" شجاعت نے کہا: "ایک میں لڑکے ایک میں لڑکیاں۔ جب کوئی لڑکا برسرِ روزگار ہو جاتا ہے ـــــ جس سے زیادہ تر سرکاری نوکری مراد ہے ـــــ تو جتنی اس کی بازاری قیمت ہوتی ہے، اسی قیمت کے لحاظ سے اسے ایک لڑکی مل جاتی ہے۔"

"محبت کئے بغیر؟" ایلس نے ذرا دلچسپی سے کہا۔

"وہاں محبت ذرا کم کی جاتی ہے۔ اس کو بدمعاشی سمجھتے ہیں۔ ہاں اب کہیں کہیں بعض تعلیم یافتہ خاندانوں میں شادی سے پہلے بھی ذرا راہ و رسم ہو جاتی ہے۔"

حلیمہ نے کہا: "البانیہ میں تو اب بھی وہی شادی مزے کی گنی جاتی ہے جس میں کوئی نوجوان سردار کسی اور قبیلے کی دوشیزہ کو اٹھا لائے۔ اور پھر دو ایک پشت تک دونوں قبیلے ایک دوسرے کی جان کے دشمن رہیں۔"

ایلس مسکرائی۔ پھر اس نے شجاعت سے پوچھا: "کیا وہاں لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے عموماً ایک دوسرے سے ملتے بھی نہیں؟"

شجاعت نے کہا یہ ملنا تو ایک طرف۔ اسی فی صدی صورتوں میں تو وہ ایک دوسرے کو شادی کے دن پہلی بار دیکھتے ہیں۔"

"کتنا رومانٹک منظر ہوتا ہوگا"۔ حلیمہ خانم نے کہا۔

"ہاں بڑا ہی ڈرامائی"۔ ایلس نے کہا۔ جواب اس گفتگو سے اور ہندوستان سے ایک غیر فانی دلچسپی لینے لگی تھی۔

نعیم جو اب تک خاموش تھا، یا کبھی کبھی حلیمہ سے ایک آدھ بات کر دیتا تھا، ایلس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایلس نے اب یہ دیکھ لیا۔

اس نے اپنا ہاتھ نعیم کے ہاتھ پر رکھا "اگر اس طرح ڈرامائی طور پر شادی ہی کے دن میں تم کو پہلی بار دیکھتی، تب بھی شاید میں عمر بھر تمہیں سے محبت کرتی۔" اس کے لہجے میں محبت اور طنز دونوں برابر برابر تھے۔

نعیم سوچنے لگا۔ شجاعت کو یہ سب تفصیلات بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر وہ جو کہہ رہا تھا سچ تھا۔ اور سچ بولنے سے کس کو کون روک سکتا ہے۔

(۶)

ایلس نے اپنے والد کو جو اطلاع دی تھی، اس کے جواب میں اسے ایک تار ملا "ابھی عجلت نہ کرنا۔ میں تمہارے پاس پیرس آرہا ہوں۔ تم سے اور تمہارے ہندوستانی نوجوان سے گفتگو کروں گا۔"

ایلس نے وہ تار نعیم کو دے دیا، اور نعیم کی گود میں بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ سے کیانتی کا گلاس لے کے پینے لگی۔ گویا اس کا باپ، یہ تار، نعیم، اس کی گود، کیانتی کا گلاس سب غیر متعلق چیزیں تھیں جن پر اس کا اختیار نہیں۔ جیسے صبح شام، رات دن، گرمی سردی، پانی،

ہوا، جس کے درمیان اسے رہنا ہے۔

نعیم نے اس وقت محسوس کیا، ایلیس اس کے اور اپنے باپ کے درمیان ملا ارا اور متزلزل کھڑی ہے۔ جو زور سے جھٹکا دے کر بلائے گا اس کے ساتھ وہ چلی جائے گی یا امریکہ یا ہندوستان۔

(۷)

ہروشا نعیم کی بے رُخی کی وجہ سے شاکی رہنے لگا تھا۔ نعیم کو تسلی دینے کے بجائے جب اس نے اپنے کمرے سے چلتا کیا تھا، ہروشا کے نزدیک محض ایک مذاق تھا اور اسے اس کی تکلیف تھی کہ نعیم نے اس کا اتنا اثر لیا۔

ایک شام کو ایلیس پہلے بال منوانے ریوسے رود لی جا رہی تھی۔ پھر اسے میری کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ آج کل ان دونوں لڑکیوں میں بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ایلیس اس وقت ہمدردی اور رازداری کے لئے ایک سہیلی کی ضرورت بھی بہت سخت تھی اور اب میری سے رشک باقی نہیں رہا تھا تو اس کے بجائے ایسا خلوص پیدا ہوگا جو شباب ہی کا حصہ ہے۔

وہ شام خالی تھی۔ اس لئے نعیم نے ہروشا کے کمرے کا رُخ کیا۔ دونوں نے درمیان میں اپنے تعلقات کی ناخوشگواری کا ذکر نہیں کیا۔ مصافحے کے ساتھ ہی ایک طرح گرمجوشی سے تمام غلط فہمیاں دُور ہو گئیں۔

نعیم نے ہروشا سے کہا: "میں تمہیں ایک خبر سُنانا چاہتا ہوں۔ ایلیس سے نسبت ہو گئی ہے۔"

"مبارک۔ میرے دوست" کہہ کے ہروشا نے بڑے اخلاق سے ہاتھ ملایا۔

بلکہ بیٹھ کے پائپ پینے لگا۔ "مجھے ذرا ذرا شک ضرور ہو رہا تھا کہ معاملہ سنجیدہ ہوتا ہے۔"

"ہاں، ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے۔"

"بے شک، بے شک۔" ہروشا نے کہا۔

نعیم کو ذرا سی جھنجھلاہٹ معلوم ہوئی۔ اب بھی ہروشا اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ اسی وقت دروازہ کسی نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ یہ کراکسلے تھا۔

ہروشا نے کہا: "میں نے کراکسلے کے ساتھ چلا پاس سے زیادہ دور مونمارتر کی پہاڑی پر چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ چلتے ہو تم بھی؟"

"چلو۔" نعیم نے کہا۔

زینے پر اترتے ہوئے کراکسلے نے نعیم سے اس کی اور رالیس کی نسبت کے متعلق سنا اور مبارک باد دی۔ "مجھے یقین ہے تم دونوں بہت خوش رہو گے۔ بیوی تمہیں خوبصورت ملی۔"

"ہاں اس ٹیڑھی ٹانگوں والی ٹھنگنی سی مخلوق میں جس کو عورت کہتے ہیں، وہ ایسی ہیں۔" ہروشا نے پائپ کی راکھ جھٹک کے رائے دی۔

مونمارتر کی پہاڑی سے تینوں نے پیرس کو دیکھا۔ یہ شہر ان کے قدموں کے نیچے پڑا تھا۔ اس کی میلی میلی دیواریں، اور اس کی کھڑکیاں جو لندن کی کھڑکیوں سے کہیں بدشکل معلوم ہوتی ہیں لیکن جن میں قدامت کی بے نیازانہ شان ہے، اور اس کے دور بارونق محلے۔ اس کی روشوں پر بساطیوں اور کتاب فروشوں کی دکانیں، اس لوں پہ شہریوں کے لباس، اور ان کی مجموعی آوازوں کا ایک ہلکا سا شور۔ پیرس،

دنیا کا حسین ترین شہر۔

وہاں سے تینوں دوست پلاس دے ترتر پہنچے۔ یہاں کے جھونپڑیوں جیسے رنگین مکانات جو معلوم نہیں کتنی صدیوں قبل بنے تھے، ہروشا کو بڑے ہی دلکش معلوم ہوتے تھے۔

نعیم نے کہا یہ ان پرانے جھونپڑوں جیسے مکانوں میں مجھے تو کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔ ایسے کھنڈر تو ہمارے ہندوستان میں بھی بہت ہیں۔"

"دنیا میں صرف ایک پلاس دے ترتر ہے اور وہ یہ ہے۔" ہروشا نے کہا۔

"اور ہم شام کا کھانا یہیں کسی ریستوران میں کھائیں گے۔" کراکیلے نے کہا۔

"بہت ٹھیک۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ہمارے ساتھ کوئی عورت نہیں۔" ہروشا نے کہا۔

نعیم مسکرایا۔ وہ سب ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچے جس کا حدود اربعہ اور اندر کا جغرافیہ تقریباً ایسا ہی تھا جیسے لکھنؤ کے قریب کے کسی دیہات کے زمیندار کے گھر کا۔ یوں کہئے کہ وہ رودولی شریف اور ریلوے یوپی آئی کے فن تعمیر کے امتزاج کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ریستوران کا فرنیچر اعلیٰ ترین قسم کا تھا۔ ایک دالان میں ایک آرکسٹرا رومانی نغمے بجا رہا تھا۔ سارا مقام اجنبی سیاحوں اور بالخصوص امریکی سیاحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک اور ہندوستانی نوجوان کے ساتھ ایک سویدستانی (جو کم از کم اپنے انگریزی لہجے سے سویدستانی معلوم ہو رہی تھی) لڑکی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر ہروشا نے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کے ڈھلتے ہوئے سینے سے شباب پھسلتا جا رہا ہے، پھر بھی وہ نعیم کے اس ہم وطن کو کس کامیابی سے بیوقوف

بتا رہی ہے۔

(۸)

جب نعیم اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو فضا میں اوائل ستمبر کی رات کی ٹھنڈک تھی۔ میز پر ایک پرزے پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ ایلس کی چٹھی تھی: "میرے والد آگئے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں تم سیدھے اوٹل ویپری آؤ۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ پیار۔ ایلس!"

اس وقت اس چٹھی کو پا کے وہ ذرا پریشان ہوا۔ بظاہر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ایلس کے والد تو بہرحال آنے ہی والے تھے۔ ان کی مخالفت بھی یقینی تھی۔ ایلس پھر بار بار یقین دلاتی رہی تھی کہ وہ اپنے والدین سے بڑھ کے اسے چاہتی تھی۔ لیکن فتح کی امید ذرا کم معلوم ہوتی تھی۔

اس نے بجائے مترو سے جانے کے ٹیکسی لی تاکہ جلد پہنچ سکے۔ اوٹل ویپری روشنیوں اور شراب کے گلاسوں سے جگمگا رہا تھا۔ امیر فلشن ایبل بوڑھیاں، شائستہ ہلا ہلا کے باتیں کرنے والے فرانسیسی، شانے ہلا ہلا کے ناواقفیت کا اظہار کرنے والے مادام، اعلیٰ ترین قسم اور قیمت کے ڈنر جیکٹ پہنے ہوئے انگریز جن کے ایک ہاتھ میں گلاس ہوتا اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں اور ان کا اعلیٰ پبلک اسکول کا لہجہ ——— ان سب کو دیکھتا ہوا نعیم ہوٹل کے کاؤنٹر کے قریب بڑھا کہ ایلس کے والد مسٹر کلاڈل کے کمرے کا نمبر پوچھے۔

لیکن اس اثنا میں ایلس نے اسے دیکھ لیا تھا جو دور دیوار کے قریب اپنے والد کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ اسے بلانے کے لئے تیزی سے آئی۔ نعیم نے ایلس کی آواز سنی۔ اس کا سارا خون کنپٹیوں میں کھنچ کر آ گیا۔ مسٹر کلاڈل کے پاس جاتے ہوئے

اسے آئی۔سی۔ایس کے انٹرویو اور میڈیکل بورڈ کے لئے جانا یاد آگیا۔ انتخاب سے پہلے دل کس تیزی سے دھڑکتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ ذرا سی لغزش، ذرا سی کمزوری اس وقت خطرناک ہے۔ ایلیس کے ساتھ اس ہندوستانی نوجوان کو آتا دیکھ کے مسٹر کلاڈل کی نگاہوں نے سر سے پیر تک نعیم کا جائزہ لیا۔ سختی سے نہیں، انتہائی متانت کے ساتھ۔ پھر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد بلند تھا اور بال ایلیس کے جیسے تھے۔ پیلے بال تھے، چہرے پر اور ہاتھوں کی جلد پر بھورے بھورے سے دھبّے تھے جو نعیم نے اکثر امریکنوں کی جلد پر دیکھے تھے۔ خندہ پیشانی سے اور بڑی ہی مہربان مسکراہٹ سے اس نے نعیم کا خیر مقدم کیا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اس کے طرزِ عمل کی ذرا سی بھی سختی ایلیس کو ہمیشہ کے لئے اس نوجوان کے سپرد کر دے گی۔ بہر حال نعیم کے دل میں یہی خیال گذرا۔

ایلیس نے تعارف کرایا "یہ میرے والد۔ اور یہ نعیم ہے۔"

کلاڈل نے مصافحہ کے لئے ہاتھ ہلایا۔ نہ سرد مہری سے اور نہ گرم جوشی سے اس کی نگاہیں نعیم کے چہرے میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ آخر جوہری کی نظر تھی۔

"آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔ جب سے مجھے ایلیس نے اپنے فیصلے کی اطلاع دی ہے، میں آپ سے ملنا چاہتا تھا..... کوئی چیز پیو گے؟"

نعیم نے معافی چاہتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں ابھی کھانا کھا کے آیا ہوں۔"

"پھر بھی کچھ۔ کافی ہی سہی؟" اور انہوں نے گارسوں کو تینوں کے لئے کافی لانے کو کہا۔

نعیم نے اب ذرا غور سے ایلیس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ باوجود عصبی اور تقریباً

مصنوعی مسکراہٹ کے اس پر ہلکی سی سراسیمگی کے آثار تھے۔

دو تین منٹ تک مکمل خاموشی رہی نعیم نے محسوس کیا کہ پھر سارا خون کھینچ کر اس کی کنپٹی میں آرہا ہے۔

بالآخر ایلس سے نہ رہا گیا۔ یہ مکمل، ناقابلِ بیان، ناقابلِ برداشت خاموشی دو تین منٹ اور رہتی تو وہ چیخ پڑتی "یہ نعیم میری والدہ بیمار ہیں"

نعیم نے کہا "مجھے افسوس ہے۔"

کافی آگئی۔ ایلس نے کافی بنانی شروع کی۔

نعیم نے پھر پوچھا "کیا بات ہے؟ مرض کیا ہے؟"

مسٹر کلاڈل نے کہا "اعصاب کی خرابی"

پھر دو تین منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ پھر یک لخت مسٹر کلاڈل نے کہا "اب تو ہندوستان میں گرمیوں کا موسم ختم ہو چکا ہو گا"

نعیم نے کہا "جی ہاں ستمبر میں بالعموم سارے ہندوستان میں گرمی ختم ہو جاتی ہے جنوب تو جون میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے"

مسٹر کلاڈل نے مسکرا کے کہا "ہاں مجھے وہاں کے جون کی گرمی خوب یاد ہے"

"کیا آپ ہندوستان گئے تھے؟"

"ہاں والد کو ہندوستان بہت پسند آیا تھا۔ ہم بچپن میں قصے سنا کرتے تھے" ایلس نے کہا "کیوں ابا تم وہاں ہاتھی پر بھی بیٹھے تھے نا۔ کیوں ابا۔ ہم سب لوگوں کو اس کا بڑا فخر ہے۔ ابا کی ہاتھی پر ایک تصویر بھی ہے"

"آپ کتنے دن ہندوستان میں رہے؟"

"چند ہفتے" مسٹر کلاڈل نے ایک سگار نکال کے جلاتے ہوئے جواب دیا۔ "کوئی اٹھارہ سال ہوئے ہیں جنگ کے بعد پورے ایشیا بھر میں پھرتا رہا۔ جواہرات جمع کرتا اور خریدتا رہا۔ ہندوستان، چین، جاوا، سمرقند، ایران"

"بڑا دلچسپ سفر رہا ہوگا"

"بڑا دلچسپ"

"ہندوستان آپ کو پسند آیا؟"

"ہاں بہت۔ اور اگر گرمیاں نہ ہوتیں تو اور پسند آتا۔ میرا پروگرام ایسا تھا کہ غلط موسم میں مجھے وہاں جانا پڑا لیکن کشمیر پہنچ کے مجھے وہاں کی گرمی کا معاوضہ مل گیا۔"

پھر ایلیس نے پوچھا "ابا۔ کیا وہاں آپ ہندوستانیوں سے ملے؟"

"ہاں کئی سے بعض مشہور لوگوں سے بھی" جواب اور بھی زیادہ مشہور ہیں، جیسے موہن داس گاندھی، لیکن زیادہ تر میرا سابقہ تاجروں ہی سے رہا۔ ہندوستانی مجھے بہت پسند آئے۔ سادہ اور مہمان نواز۔"

اس کے بعد نعیم کی جھجک اور وہ امید سے زیادہ بھرم کی کیفیت کم ہوگئی۔ اور وہ زیادہ بے تکلفی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ جب نفسیاتی موقعہ آ گیا تو مسٹر کلاڈل نے دفعتاً یہ پوچھا "کتنے عرصے سے آپ ایلیس کو جانتے ہیں؟"

"اب کوئی ڈھائی مہینے ہوئے ہوں گے"

ایلیس نے کہا "لیکن وقت کی بجائے خود کوئی اہمیت نہیں۔"

"بیشک۔ بیشک میری پیاری بیٹی۔ وقت کو مدت سے تو میں بھی نہیں تول رہا ہوں۔ میں تم دونوں کے فیصلے کی پوری عزت کرتا ہوں اور اس میں دخل نہیں دینا

چاہتا لیکن کچھ اور باتیں ہیں ۔۔۔۔"

نسیم نے ایلس کے چہرے پر بجائے متابلے کے تذبذب کے آثار دیکھے اور اس کا دل بیٹھ گیا۔

مسٹر کلاڈل نے کہنا شروع کیا "پیرس عجیب مقام ہے ۔یہاں کی زندگی شامپین کے اثر کی سی ہے ۔ یہاں انسان اکثر اپنا وسیع تر ماحول بھول جاتا ہے ۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جذباتی قدم اکثر یہاں متزلزل ہو جاتے ہیں ۔خود مجھ پر یہ گذر چکی ہے ۔ایلس تمہاری ماں سے شادی کرنے سے پہلے اسی پیرس میں میں ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کر چکا تھا "

"پھر؟" ایلس نے پوچھا ۔نسیم نے محسوس کیا کہ وہ بہت غور سے اپنے باپ کا ایک ایک لفظ سن رہی ہے ۔

"پھر میں امریکہ واپس گیا ۔اس سے وعدہ کر کے کہ سال بھر بعد آ کے شادی کروں گا اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن سنسناٹی میں چند ہی مہینے گذرے تھے کہ فرانس اور پیرس اور اس لڑکی کا خیال شامپین کے نشے کی طرح زائل ہونے لگا خط و کتابت کم ہوتی گئی ۔ یہاں تک کہ جب میں نے عزتِ نفس کے تقاضے سے مجبور ہو کے نسبت توڑنے کا خط اسے لکھا تو معلوم ہوا کہ پندرہ دن ہوئے اس کی شادی ہو چکی ہے ۔ ایلس ،تمہاری والدہ اب بھی کبھی کبھی اس واقعہ کا مذاق اڑاتی ہیں "

"لیکن ڈیڈی اگر آپ دونوں کو واقعاً ایک دوسرے سے محبت ہوتی ۔۔۔ تو وہ ایک دوسرے سے دور ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی "

"بالکل ٹھیک ۔ٹھیک میری پیاری بیٹی ۔یہی تو محبت کے اصلی ہونے کی پہچان ہے ۔

گر وہ اصلی ہے تو سفنانی ہو یا پیرس، اس میں فرق نہیں آنے پائے گا۔ وقت اور مسافت سے گھٹا نہیں سکیں گے یہی تو محبت کا امتحان ہے۔ کیا تم اس میں پوری اُتر سکو گی؟"

"میں نعیم کو ہمیشہ چاہتی رہوں گی۔" ایلیس نے اپنے باپ سے آہستہ سے کہا۔ اور اس کے ہاتھ نے میز کے نیچے نعیم کا ہاتھ ڈھونڈھ کے مضبوط پکڑ لیا۔

"وقت اور مسافت ہی تمہارے دعوے کو سچ یا جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں۔۔۔"

مسٹر کلاڈل نے مسکرا کے جواب دیا ...... وہ مڑ کے بڑی متانت اور شفقت سے نعیم سے مخاطب ہوئے "مسٹر نعیم حسن! آپ کے خلاف میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ رنگ کی تفریق کا میں قائل نہیں ہوں۔ میرے آبا و اجداد ابراہیم لنکن کی طرف سے حبشیوں کو آزادی دلانے کے لئے لڑے تھے۔ اس کے علاوہ میں ہندوستانیوں کو سفید نسل ہی کی ایک شاخ سمجھتا ہوں۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا کہ میں نسلی تعصب کی وجہ سے دخل دینا چاہتا ہوں۔۔"

"جی۔" نعیم نے آہستہ سے کہا۔ ایسا تذبذب اس نے فضا میں اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔

"مجھے اپنی لڑکی سے بہت محبت ہے۔ اور میں اب تک اس کی ہر آرزو پوری کرتا رہا۔ اس کی ماں بھی اسے بہت چاہتی ہیں۔" مسٹر کلاڈل اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے "اس لئے ہمیں اس کے مستقبل سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کی جو خوشی ہو اس میں ہم دخل نہ دیں گے بشرطیکہ ہمیں اس کا یقین ہو جائے کہ فی الحقیقت اس کی یہی خوشی ہے۔"

"آپ کی صاحبزادی خود اس کا اقرار کر چکی ہیں۔ کیوں ایلیس؟"

"ہاں مجھے تم ہی سے محبت ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔"

"بے شک۔ بے شک" اس کے باپ نے اس اطمینان سے مسکرا کے جواب دیا گویا
وہ اس کے الفاظ کا یقین نہیں کرتا۔

برافروختہ ہو کے ایلس نے جواب دیا "ڈیڈی۔ آپ میرے ساتھ اس طرح پیش نہیں
آ سکتے جیسے کسی ڈھائی برس کے بچے کے ساتھ۔"

"نہیں، میری بیٹی۔ میں جانتا ہوں تم بڑی ہو گئی ہو" اس نے دلاسا دینے کے لئے کہا۔

"اور اگر آپ مجھے روپیہ وغیرہ دینا نہیں چاہتے تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں نعیم کی
تنخواہ میں ہم دونوں کی گذر ہو جائے گی۔"

"یہ سن کے مجھے بڑی خوشی ہوئی" اس کے باپ نے جواب دیا "اگر میں تمہارا باپ نہ
ہوتا تو مجھے یقین بھی آ جاتا کہ تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ وہی فیصلہ ہے جو تمہیں کرنا چاہئے
تھا۔ تمہارے حصے کا روپیہ ہر صورت میں تمہیں ملے گا۔ اس کا تم یقین رکھو۔ تمہارا یہ خیال
بھی غلط ہے کہ میں یا تمہاری والدہ تمہاری اس نسبت کے مخالف ہیں۔ یہیں محض شک
ہے . . . "

"شک۔ شک۔ شک" ایلس نے کہا "ڈیڈی آپ اسی طرح باتیں کرتے رہے تو
میں چیخنے لگوں گی۔"

ایلس کے اس جواب کی پروا کئے بغیر مسٹر کلاڈل نے نعیم سے مخاطب ہو کے کہا "اس
دس منٹ کے عرصے میں تمہارے متعلق میں نے صرف ایک رائے قائم کی ہے اور وہ یہ
کہ تم شریف ہو۔ اس لئے میں تم سے اپیل کرتا ہوں۔ تمہیں ایلس سے پہلی بار ملے کتنے
دن ہوئے؟"

"تقریباً ڈھائی مہینے۔" نعیم نے کہا۔

"اب تم ہی بتاؤ۔ کیا صرف ڈھائی مہینے کی واقفیت اس کے لئے کافی ہے کہ دونوں ساری عمر ساتھ رہنے کا تصفیہ کرلو؟ اور پھر وہ بھی ایک ایسے ملک میں جو تم دونوں میں سے ایک کے لئے اجنبی ہے۔"

نعیم نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا: "لیکن معاف کیجئے گا۔ وقت کی مقدار واقفیت کے جانچنے کا صحیح پیمانہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو آپ سالہا سال سے جانتے ہوں گے، ان سے آپ اچھی طرح واقف نہ ہو سکے ہوں گے۔ لیکن چند ایسے بھی آپ کے دوست ہوں گے جن کو بہت کم عرصے میں آپ بہت اچھی طرح جان گئے ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں۔ نہ میں نے یہ کہا کہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں۔ میں تم دونوں سے محض یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی محبت کی آزمائش کر لینے دو۔ اس کی آزمائش کر لینے دو کہ تمہاری محبت عمر بھر باقی رہے گی۔ پھر تمہاری نسبت اور شادی کی سب سے زیادہ خوشی مجھ ہی کو ہوگی۔"

"اور ڈیڈی آپ کی آزمائش کیا ہے؟" ایلس نے اس لہجے میں سوال کیا گویا وہ دنیا کے ہر امتحان کے لئے تیار تھی۔

اس کے باپ نے کہا: "ایلس! میرا امتحان یہ ہے۔ تم میرے ساتھ ہوائی جہاز پر کل ہی امریکہ چلو۔ سنسناٹی میں اپنی ماں سے ملو۔ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ چھ ماہ گذارو۔ اس درمیان میں تم نعیم سے خط و کتابت کر سکتی ہو۔ اگر چھ ماہ بعد بھی تم کو اسے اس نوجوان سے ویسی ہی محبت رہے جیسے اب ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم اس پہلے امتحان میں کامیاب ہو گئیں۔"

نعیم کا دل بیٹھنے لگا۔ اوقیانوس کا پانی بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جب دو دلوں کے درمیان ایسا بحرِ زخّار حائل رہے تو ممکن ہے دلوں کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔ نہیں، اس کا ٹھنڈا پڑ جانا یقینی ہے۔ سنسناٹی میں ایلیس پھران نوجوانوں سے ملے گی جو اسکول اور کالج میں اس کے ساتھ پڑھ چکے ہوں گے۔ اس کے بچپن کے دوست اور رفیق، اس کے ہمسائے۔ وہ ان کے ساتھ ہنسے گی، بولے گی، ناچے گی۔ اور رفتہ رفتہ وہ پیرس کے اس واقعے کو اور خود اس کو ایک خواب سمجھنے لگے گی۔

ایلیس اب تک کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی۔ برابر سوچ رہی تھی۔

اُس کے والد کی نگاہیں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ اس کی تمام تر نفسیاتی گہرائیاں، تمام نامحسوس کیفیتیں اس دنیا دار کے سامنے روشن تھیں۔

اس کے باپ نے کہا "ایلیس تم امتحان سے ڈرتی ہو؟"

نعیم کہنا چاہتا تھا کہ آپ اپنی لڑکی کی نفسیاتی کمزوری سے بے جا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر الفاظ اس کی زبان تک نہ آسکے۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

"ڈیڈی میں تمہارے کسی امتحان سے نہیں ڈرتی"۔ ایلیس نے کہا "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم کل جاؤ گے تو کل سہی۔ اور میں تمہیں بتا دوں گی۔"

"ایلیس۔ یہ غضب نہ کرنا" نعیم نے بے اختیار ہو کے کہا۔

"نعیم۔ تم۔ تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ میری محبت چھ مہینے میں مر جائے گی؟ تم جسے میں نے سب کچھ دے ڈالا"

"پیاری ایلیس! مجھے معاف کرنا" نعیم نے کہا۔ لیکن اس کا دل اوقیانوس میں میلوں نیچے تہ کی طرف ڈوبا جاتا تھا گویا اس پر کئی من سیسے کا وزن ہو اور اوقیانوس کی سطح پر

امریکہ جانے والے جہاز جا رہے تھے "نارمنڈی" اور معلوم نہیں کتنے خوب صورت، خوبصورت جہاز جن کے عرشوں پر رات بھر ناچ ہوتا ہے۔ اور جن کے حوضوں میں ننگی پیٹھ والی امیرزادیاں نہایا کرتی ہیں۔ اور ان سے اوپر خاموش طائروں کی طرح اڑتے ہوئے طیارے۔

مسٹر کلاڈل نے اس خاموشی کو توڑا "الیس! میں خوش ہوں کہ تم نے میرے چیلنج کو منظور کیا۔ میں تم دونوں سے اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چھ ماہ بعد الیس اپنے فیصلے پر اڑی رہی تو میں اس کو خود یہاں لا کے پہنچا جاؤں گا۔ میرے عزیز نوجوان، تم ناراض تو نہیں ہوئے؟"

نعیم نے میز سے اٹھ کے کہا "مسٹر کلاڈل! اس وقت تو فتح آپ کی ہوئی ہے میرے ناراض ہونے یا نہ ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ فیصلہ الیس کے اختیار میں تھا۔ اب مجھے اجازت ہو۔"

الیس بھی اٹھ کھڑی ہوئی "ڈیڈی! مجھے کل تو آپ کے ساتھ جانا ہی ہے۔ بس آج رات کے دو تین گھنٹے نعیم کے ساتھ ادھر ادھر پھر کے گزارنا چاہتی ہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"بالکل نہیں" مسٹر کلاڈل نے کہا۔ وہ اپنی لڑکی سے اتنی اچھی طرح واقف تھے کہ انہیں یقین تھا، اب یہ نوجوان ہندوستانی الیس کی کتنی ہی خوشامد کیوں نہ کرے وہ امریکہ جانے کا وعدہ نہ توڑے گی۔

مسٹر کلاڈل نے نعیم کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا۔ لیکن ان کی آنکھوں سے ایک قسم کی بے رحم ذہانت برستی تھی۔

نعیم کا بازو پکڑے ایلیس ہوٹل سے باہر آئی۔
نعیم نے پوچھا "کہاں چلوگی؟ دوم یا کورپول؟"
ایلیس نے اس سے لپٹ کے کہا "نہیں پیارے۔ تمہارے گھر!" اور وہ پھوٹ پھوٹ کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(۹)

دوسرے دن جب ایک طیارہ ایلیس کو مغرب کی طرف اڑائے لئے جا رہا تھا اور نظر سے غائب ہو رہا تھا، نعیم نے محسوس کیا کہ گویا وہ خود اس طیارے سے ریشمی چھتری کے ذریعے ابھی ابھی اترا ہے۔ ایلیس اس پر کیسی چھا گئی تھی۔ وہ زندگی کو بھول سا گیا تھا اور اب جو وہ ناامیدی اور مایوسی سے اس غائب ہوتے ہوئے طیارے کو دیکھ رہا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ زندگی، تیز رو، دہشت ناک زندگی، خالی زندگی، ظالم زندگی، انسان اس کے بنائے ہوئے مکانات، مکانات کی ہوا سے کھڑکھڑانے والی کھڑکیاں، تیز چلتی ہوئی موٹریں، اس کے دوستوں کے ہنستے ہوئے، بناتے ہوئے، تسلی دیتے ہوئے چہرے، لڑکیاں، ہزاروں لڑکیاں، ان کے جسموں کی لچک، ان کے سائے، ان کی رفتار، ان کی پنڈلیاں، ان کے سینے، اور کا مدھے پلا بلا کے باتیں کرتے ہوئے فرانسیسی اور خوبصورت پیرس، پیرس کے باغات، عجائب خانے، اور لندن اور ہندوستان اور حیدرآباد، اور حیدرآباد کی سیمنٹ کی سڑکیں اور میلند میں پینے والے امراء اور فرانس میں شامپین پینے والے سیاح اور ہزاروں لاکھوں طالب علم —— ان سب کے درمیان اب وہ کھڑا تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔ اس کا دل بار بار شک کرتا تھا کہ ایلیس اب کبھی واپس نہ آئے گی۔ وہ کبھی اپنے امتحان میں پوری نہ اترے گی۔

(۱۰)

اِسی دوراں میں بے شمار سڑکیں آ کر ملتی ہیں، اور بیسیوں موٹریں تیزی سے اِدھر سے اُدھر گذرتی ہیں۔ اور سڑک کے پار جاتے جاتے موٹروں کے اس رواں اور تیز ہجوم میں جب نعیم ذرا ٹھٹکا تو ہروشل نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اور ذرا گھسیٹ کے کہا یہ سڑک کے پار جاتے ہوئے تم ہمیشہ اس قدر ڈرتے کیوں ہو؟ تم نہ ٹھہرو گے تو موٹر خود ٹھہر جائے گی۔ اور یوں راستے میں کھڑے ہو جاؤ گے تو کسی ٹیکسی کا ڈرائیور موٹر ٹھہرا کے کوئی نامناسب سا لفظ کہہ دے گا۔"

اس پر نعیم نے مسکرا کے اپنے دل میں کہا یہ کون کہتا ہے کہ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔

دسواں باب

گمریز

اسی دن شام کو راجکمار ربوسال دتی میں انکار کے کمرے میں اپنی سالگرہ کی تقریب میں پارٹی دے رہے تھے۔ بعد حسن کو اطلس کی یاد بری طرح ستا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بھاگ کر کہیں پناہ لینا چاہتا تھا۔ وہ سب سے پہلے ربوسال دتی پہنچا۔ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے۔ میزبان اور اس کے نوکروں کے سوا ابھی تک اور کوئی نہ آیا تھا۔ شجاعت وہاں تھا۔ بہت تپاک سے ملا اور [illegible] جا سکا حال سن کے کہنے لگا "اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھول پال رہے ہو [illegible] مبتلا ہوتے ہو؟"

اعجاز صاحب شغل فرما رہے تھے اور [illegible] میں تھے۔ ابو رشد احمد [illegible] زمانے کے لئے بادہ و جام سے محظوظ ہو رہے تھے۔ حلیمہ خانم البانیہ کے ہر سلطان کی تعریف کر رہی تھیں۔ علی پاشا کی بانو نے نئی نئی ستائش کی ہے۔ اس پر اعجاز حسن

کہہ رہے تھے "یہ سب چور تھے۔ ڈاکو تھے۔ خواہ وہ علی پاشا ہوں یا خود لارڈ بائرن اس کمینے پور زدہ شاعر کا بھی عجیب حال تھا۔ جمہوریت کی صدا بلند کرتے۔ بس اور یونان کا تاج پیش کیا گیا تو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔"

راحکار خاد ماؤں سے ہنستے بولتے اور ان کی کمر میں ہاتھ ڈال ڈال کے پارٹی کے سازو سامان کی تیاری کر رہے تھے۔ برف سے بھری ہوئی بالٹیوں میں نائیں کی قتلیں رکھی جا رہی تھیں۔ ان کی سوتیلی بیوی بیگم جو انسٹروم جس کی عمر بیس کی ہوگی۔ ور چہرے سے بہتیں کی [illegible] رہی تھی۔ انہیں مدد دے رہی تھی اور وہ ان دو نسبی خاد ماؤں کی طرف ان کا رجحان دیکھ کے۔ بار بار سے کہتی "ڈارلنگ تم بڑے شریر ہو"

پھر مہمان آنے شروع ہوئے۔ غازی الدین صاحب کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ ایک پستہ قد، سیاہ بالوں والی اور ایک اور لڑکی جس کی صورت اگرچہ پھیکی سی تھی لیکن اس میں [illegible] تھی۔ غازی الدین سے نعیم آکسفرڈ اور لندن میں مل چکا تھا۔ وہ لندن میں جغرافیہ کی ڈگری کے لیے [illegible] رہے تھے۔ [illegible] میں انہوں نے ایک پنجابی لڑکے [illegible] ایک [illegible] ساتھ ایک [illegible] کا تعارف انہوں [illegible] کہ [illegible] کو ایک آدمی [illegible] اس [illegible] انسان کے [illegible] گریجویٹ ہیں۔ دوسری کا تعارف انہوں نے [illegible]

[illegible] اگر [illegible] پوچھا [illegible] تو [illegible]

[illegible] پہلی [illegible]

[illegible] الدین [illegible]

[illegible]

اس لڑکی کے بازو بہت گداز تھے، سینہ چوڑا تھا، اور ہونٹ پتلے تھے۔ لیکن نعیم باوجود اس لڑکی کے اس بیان کے سوچ رہا تھا کہ غازی الدین نے اس کی نسل اور قوم کا ذکر چھیڑا ہی کیوں؟ ممکن ہے اسے بُرا معلوم ہوا ہو۔ اس بدمذاقی کی ضرورت ہی کیا تھی۔

مے رابنسن، اپنی چھوٹے قد والی انگریز ساتھی سے کہہ رہی تھی "... نہیں، ہم میں سے بعض کو رنگ کا بڑا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں جو لڑکیاں ذرا سانولی سانولی ہوتی ہیں وہ کالی لڑکیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتی ہیں۔ میں بالکل سفید ہوں مگر مجھے اس کا احساس نہیں۔"

اور غازی الدین نعیم سے کہہ رہا تھا "یار یہ دونوں لڑکیاں بڑے مزے کی ہیں۔ ان دونوں کو ساتھ ساتھ سنبھالنا مشکل ہے۔ ایک کو تم لے جاؤ۔ تمہارے ساتھ اور کوئی تو نہیں؟ .... جس کو چاہو لے جاؤ۔ اگر حبشن کا مزہ ابھی تک نہ چکھا ہو تو تم اسے لے جاؤ اور پھر سفید حبشن اتنی گرم ہے۔ آرٹ اسکول میں پڑھتی ہے   مگر یار ان حبشنوں کی ہم سے تم سے تسلی نہیں ہوتی، انہیں تو حبشی ہی چاہئے۔ جس یوروپین لڑکی کو ایک بار کسی حبشی کا مزا لگتا ہے، پھر وہ اسے نہیں چھوڑتی۔"

اتنے میں ڈاکٹر راجندر ناتھ آئے۔ اٹھائیس سال کی عمر۔ لندن میں ڈاکٹری پڑھ چکے تھے اور اب پیرس کے مدرسہ طبیہ میں درس لے رہے تھے۔ گہرا سانولا رنگ، میانہ قد، لیکن چہرے کے خد و خال مناسب اور خوبصورت۔ ہنستے تھے تو گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ اکرسمس کے ختم پر تفریح کے لئے آکسفورڈ آئے تھے اور ان کی نعیم سے ملاقات تھی۔

پھر راجہ ہمت نواز ونت آئے۔ جہاز کے ساتھ کے بعد سے اب تک نعیم سے ان کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ آتے ہی لپٹ گئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی بڑی ہی خوبصورت۔ ایک یونانی مجسمہ سا جس میں جان تھی اور جس کے منہ سے بو آتی تھی۔ ہونٹ پر ناس سے ایک

چھوٹے سے نائٹ کلب میں ننگی ناچا کرتی تھی۔ راجہ صاحب اسے وہاں سے اڑا لائے
تھے نعیم سے کہنے لگے "بڑی زوردار پٹھیا ہے"

راجہ صاحب کے آتے ہی پارٹی گویا شروع ہوگئی۔ گراموفون پر انہوں نے رکارڈ
رکھا۔ اپنی پٹھیا جس کا نام "نزارتہ" تھا ——— کو گھسیٹ کر ناچنا شروع کیا۔ رکارڈ بج رہا تھا
اور ایک فرانسیسی گیت کے ساتھ ناچ کے سُر بلند ہو رہے تھے۔

"ہمیشہ ہمیشہ محبت ....."

اوروں نے بھی ناچنا شروع کیا۔

شجاعت نعیم سے کہہ رہا تھا ...." اور یہ آپ کے ایرانی، ترکی، البانوی، مراقشی، مصری
مسلمان سب بڑے پاجی ہوتے ہیں۔ آپ تو ان کو اپنا بھائی سمجھ کے جان دیتے ہیں اور یہ اپنے
گورے رنگ کی وجہ سے اپنے آپ کو میڈی ٹرے نین نسل کا اور سفید فام سمجھتے ہیں۔ یہ آپ
کی پان اسلامیت صرف ہندوستان کی حد تک ہے ... مجھ سے ایک مصری صاحب سے
ملاقات ہے۔ جو عرصے تک ہم سب کو دھوکا دیتے رہے کہ اطالوی ہیں۔ اطالوی ذرا
اچھی بول لیتے ہیں ——— مگر تم کچھ پیو گے نہیں؟"

ایک جوڑا اور آیا۔ نزوبدی ایک غریب طالب علم جو کوارٹنے لاتاں میں ایک ریستوران
میں کام کرتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک بلند قامت، سُرخ ہونٹوں والی یہودی لڑکی جس کے
ہاتھ میں جواہر لال کی سوانح عمری تھی۔

شجاعت نے نعیم سے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

نعیم نے اس یہودی لڑکی سے پوچھا "کیوں، جواہر لال کی سوانح عمری آپ کو پسند آئی؟"
"نزوبدی نے مجھے کل ہی یہ کتاب دی ہے۔ ہم یہودیوں کی اور آپ لوگوں کی حالت

اور شکلیں بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں۔ مجھے تو تردیدی کے ساتھ ہنسنے سے بھی معلوم ہوا۔"

"آپ ہندو نہیں ہیں؟"

"میں جرمنی سے بھاگ کے آئی ہوں اور ہندو ہوں۔ جب سے اس ملک کا راج شروع ہوا سب ہندو گھر ہو رہے ہیں اور آپ لوگ اپنے گھروں میں خادم ہیں"

اس موقع پر شوکت نے کہا یہ مسٹر نعیم حسن آئی سی ایس ہیں اور ان کا شمار خادموں میں نہیں حاکموں میں ہے۔"

پھر قاضی ہاشم صاحب آئے۔ احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ جیوٹ رنگ کے لوگ جسم دوہرا تو نہیں تھا ڈیل ڈول ضرور تھا۔ ان سے بھی نعیم اس سے پہلے مل چکا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بد شکل اور کرخت سے پست قامت نوجوان تھے۔ قاضی ہاشم نے ان کا تعارف "فرہاد آپا جی" کہہ کے کرایا۔ ان دونوں کے ساتھ سنہرے بالوں والی ایک بڑی خوبصورت اور بلند قامت لڑکی تھی۔ قاضی ہاشم نے نعیم سے ان کا تعارف کرایا — "یہ مس بریتھا اکسن سن ہیں۔ سویڈن کی رہنے والی ہیں۔ یہ میرے دوست مسٹر نعیم حسن ہیں۔" بریتھا اکسن سن ہاتھ ملاتے وقت شہزادیوں کی طرح مسکرائی۔

یہ پہلی لڑکی تھی جو اس پورے مجمع میں شریف اور اعلیٰ طبقے کی معلوم ہو رہی تھی۔ راجہ ہمت نواز ونت نے ناچتے ناچتے اسے گھور کے دیکھا۔ اور اس کی آنکھیں بھی ایک منٹ کے لئے ان کے مردانہ حسن کی طرف کھنچیں۔ پھر اس کے چہرے پر شرافت کی نقاب پڑ گئی۔

غازی الدین، فریاد اکبر آبادی کو دیکھتے ہی گرٹروڈ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے لپکے۔ وہ ان کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اور ناچ میں یہ جوڑا معلوم بھی عجیب ہو رہا تھا کیونکہ وہ غازی الدین کے قد سے ایک چوتھائی کم تھی۔ غازی الدین نے جلدی سے ایک دوسرے کا تعارف کرایا "یہ گرٹروڈ۔ مسٹر فریاد۔ یہ شاعر بھی ہیں۔ کیمبرج میں تاریخ پڑھ رہے ہیں۔" پھر اردو میں فریاد سے کہا "اماں اسے چھوڑنا نہیں۔ سیدھی تمہارے کمرے تک ساتھ جائے گی۔ مجھے ان دونوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس پارٹی میں کوئی نئی مل جائے تو اچھا ہے۔ اس کو لے جاؤ۔ تمہارا اس کا جوڑ بھی ہے۔"

فریاد نے اس سے کہا "تم بڑے بیہودہ ہو یار!" پھر گرٹروڈ سے کہا "آپ ناچیں گی؟"

اور نعیم اس ڈھنگ سے جوڑے کو ہنستے اور ناچتے دیکھتا رہا۔

غازی الدین نے اس سے مخاطب ہو کے کہا "نعیم تم ابھی تک نہیں ناچے؟"

شجاعت نے جو حلیمہ خانم کے ساتھ ناچتا ہوا قریب سے گذرا، کہا "ابھی تک معلوم ہوتا ہے کہ ان پر رقص کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔"

غازی الدین نے کہا "اس کیفیت ویفیت کا میں قائل نہیں۔ یہی حال ہمارے قاضی صاحب کا ہے۔ جب تک کسی لڑکی سے عشق نہ ہو جائے، اسے چائے پر بھی نہیں بلاتے۔"

قاضی صاحب نے کہا "جب تک مجھے کسی لڑکی سے محبت نہ ہو اور وہ بھی اس محبت کا تھوڑا بہت جواب نہ دے، مجھے اس کے ساتھ کہیں آنے جانے میں بھی کوئی لطف نہیں آتا۔ جنس سے آپ عشق و محبت کے عنصر کو نکال دیجئے، باقی کیا رہ جاتا ہے۔

—— حیوانیت محض حیوانیت۔ اس میں ہمارے ان ہندوستانی نوجوانوں کو لطف آتا ہوگا جنہوں نے انگلستان آنے سے پہلے کبھی عورت کی صورت نہیں دیکھی۔ لیکن اس حیوانیت میں مزا ہی کیا خاک ہے ...... عشق کی چاشنی سے عورت مرد کے ساتھ میں روحانیت پیدا ہو جاتی ہے عشق کی وجہ سے انسان عاقل، حیوان نہیں رہتا۔ وہ حیوانی مدارج سے کہیں آگے پہنچ جاتا ہے۔ ..... چنانچہ جب سے مجھے برتھا سے محبت ہوئی ہے، میرے نفس میں ایک طرح کی پاکیزگی پیدا ہو گئی ہے..... کیوں برتھا؟" یہ کہہ کے چچک رُو قاضی صاحب نے پلٹ کے اپنی سیدی حسینہ کی طرف دیکھا جو اب راج بہت نوازونت کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اور بہت نوازونت کی نائٹ کلب والی ننگی ناچنے والی رقاصہ غازی کے ساتھ۔

اور گراموفون کا رکارڈ بج رہا تھا۔

"دو کے لئے چائے اور چائے کے لئے دو"

اور رقص کرنے والے جوڑے تھرک رہے تھے، اور لپٹ رہے تھے، اور ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔ سینوں سے سینے مل رہے تھے اور کبھی ایشیا کے ہونٹ یورپ کے رخساروں یا سنہری بالوں سے مس کرتے۔ اور کچھ لوگ قہقہے لگا رہے تھے، اور شامپین کے گلاسوں پر بجلی کی روشنی ہیروں کی طرح چمک رہی تھی۔

اگر برتھا بھی ان زندگی کا لطف اٹھانے والوں اور اٹھانے والیوں میں نہ ہوتی تو قاضی صاحب نعیم کو اقبال کا وہ شعر سناتے جو انہیں یاد آ گیا تھا۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم   عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

لیکن اب یہ شعر ذرا بے محل سا تھا۔
اور گراموفون کا رکارڈ تو بج ہی رہا تھا۔

"دو کے لئے چائے اور چائے کے لئے دو۔"

نعیم شرارت سے مسکرایا۔ اور پھر گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے اس نے قاضی ہاشم سے کہا: "عورتیں شام کے لباس میں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرے خیال میں ساڑھی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لباس نہیں۔ لیکن آپ ناچئے گا نہیں؟ میرے ساتھ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ میں تو پیدا ہی محبت کرنے اور غم اٹھانے کے لئے ہوا ہوں۔ عشق اور درد کا ساتھ ہے .... لیکن آپ ناچئے اور میرے ساتھ باتیں کر کے وقت نہ ضائع کیجئے۔

در محفلِ خود یار مدہ ہم چو منے را　　افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را"

خیر اقبال کا شعر پڑھنے کا موقع نہ تھا، نہ سہی۔ یہ فارسی شعر پڑھ کے قاضی صاحب نے کچھ دل کی بھڑاس نکال لی۔

پھر نعیم کے دل میں کشمکش شروع ہوئی۔ شامپین اور رقص، اور ایشیا اور یورپ کے اس امتزاجِ عاشقانہ کے ماحول میں اسے پھر ایلیس یاد آئی، اور اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ اس نے پھر اپنے آپ سے گریز کرنے کے لئے اس میز کے پاس پہنچ کے جس کے گرد راجکمار، حلیمہ خانم اور اعجاز بیٹھے پی رہے تھے، دو گلاس پئے اور پھر ہلکے سرور سے مسلح ہو کے اس نے سر کے اشارے سے حلیمہ خانم سے رقص کی درخواست کی

وہ ناچ رہا تھا کہ کچھ لوگ اور آئے۔ دو ہندوستانی لڑکیاں تھیں۔ ایک سانولی اور بدشکل

دوسری سانولی اور قبول صورت۔ دونوں کا میزبان سے تعارف کرایا گیا۔ بڑی سانولی اور بدشکل بہن کا نام کوکب زمان تھا، چھوٹی کا نام خورشید زمان۔ دونوں یو۔پی کے کسی ڈپٹی کلکٹر صاحب کی لڑکیاں تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا۔ لمبا تڑنگا۔ ایبٹ آباد کا رہنے والا۔ نعیم ناچتے میں اس کا نام نہ سن سکا۔

ناچتے میں نعیم نے محسوس کیا کہ حلیمہ خانم کا جسم جس کی جنبش میں فرانسیسیوں سے بڑھ کے فرانسیسیت تھی، رقص کے ہر موڑ پر دو دو تین تین جگہ سے لچکتا۔

"البانیہ بڑا خوبصورت ملک ہوگا؟"

"ہاں بڑا خوبصورت ملک ہے۔ آپ کبھی ضرور تشریف لائیے۔"

"وہاں کی عورتیں تو بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"شکریہ!"

پھر حلیمہ خانم نے پوچھا "آپ کی امریکن دوست کہاں ہیں؟"

"وہ امریکہ واپس چلی گئی۔ اس کی ماں بیمار ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ نسباحت کی آنکھیں ان دونوں کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ اور زیادہ تکلف اور دوری سے ناچنے لگا۔ اس نے حلیمہ سے کہا۔ "کیا اب بھی آپ کے ملک میں قبیلوں کی وہی رقابت ہے اور لوگ دوسرے قبیلوں کی لڑکیاں اٹھا لے جاتے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر کیا آپ کے ہندوستان میں یہ نہیں ہوتا؟"

"ہوتا کیوں نہیں۔ میں محض اس لئے پوچھ رہا تھا کہ میرے خیال میں اس قصہ کی بڑی رومانی ہوگی۔"

"تم بے حد [illegible]" اور یہ کہہ کر علیمہ ہنسی۔

دوسرا ناچ پال جونس تھا۔ عورتیں ایک دائرہ بنائے گھوم رہی تھیں اور ان کے اطراف [illegible] دائرہ بنائے ہوئے مرد، کہ یکا یک باجا رُکا۔ ہنسی اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں [illegible] جو جس کے سامنے رُکی ناچ کے لئے اس کے حصے میں آئی۔ نعیم کے حصے میں پستہ قد گرٹروڈ سیمسن آئی۔ اس کے ساتھ چند منٹ ناچنا بھی مشکل تھا۔

گرٹروڈ نے خود ہی پوچھا "آپ بھی پیرس میں پڑھتے ہیں؟"

"فی الحال تعطیلات میں یہاں پڑھ رہا ہوں" نعیم نے جواب دیا "فرانسیسی زبان اور ادب لیکن دراصل میں آکسفورڈ میں پڑھتا ہوں۔"

"آکسفورڈ۔ کیا کہنے" کالے بالوں والی، کالی آنکھوں والی، پستہ قد لڑکی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگی "آپ کو آرٹ سے دلچسپی ہے؟"

"ہے تو ضرور لیکن جب سے میں پیرس آیا ہوں مجھ پر تھکنے کی سی کیفیت ہے۔ یہاں [illegible] خوبصورت [illegible] میں نے بہت سے آرٹ کے خزانے دیکھ کر میں بالکل مبہوت سا ہو گیا ہوں۔ اور اچھی طرح غور کرنے اور پڑھنے کی صلاحیت جیسے بالکل سلب ہو گئی ہے۔"

"میں جب پہلے پہل پیرس آئی تو میرا بھی یہی حال ہوا تھا" گرٹروڈ نے ہنس کے کہا "آج کل میں بچوں کی استعداد مصوری پر کام کر رہی ہوں۔ میں نے بچوں کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں جمع کی ہیں۔ ۔ ۔"

"بڑا ہی دلچسپ ذخیرہ ہو گا" نعیم نے جواب دیا۔ باجا پھر ایک جھنکار کے ساتھ

رُکا۔ نعیم نے اپنی ہم رقص کا سر کے اشارے سے شکریہ ادا کیا اور پھر پال جونس سے گھومنے والے دائرے میں شامل ہو گیا۔

اب کے اس کے حصے میں چیک رُو قاضی صاحب کی محبوبہ طناز بر تھا اکمل آئی۔ ان سب لڑکیوں میں وہی ایک ایسی تھی جس سے وہ جان پہچان بڑھانا چاہتا تھا۔

اس بلند قامت، خوش رُو، زریں بالوں والی، سفید حسینہ کے ساتھ ناچتے ہیں اسے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ دنیا میں ایلس کے سوا اور بھی عورتیں ہیں۔ یہ عجیب احساس تھا۔ آج صبح ایلس کے جانے کے بعد سے اب تک میری یاد اسے ایک بار بھی یاد نہ آئی تھی۔ بلقیس کا خیال البتہ کئی بار آیا۔ مگر ہر بار دل سے نکل گیا، جیسے ہوا کا جھونکا آیا اور نکل گیا۔

اس نے ربھا سے پوچھا "آپ سویڈن کے کس حصے کی رہنے والی ہیں؟"

وہی شہزادیوں کا سا ذی وقار تبسم اس کے لبوں پر نمودار ہوا۔ اس کے دانت ہموار اور بے حد سفید تھے اور جب نعیم کے مقابل اس نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تو اس کے سنہرے بال اس کی گردن اور اس کے شانوں پر سونے کی موجوں کی طرح لہرا گئے۔ اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں۔

"معاف کیجیے میں نے سُنا نہیں۔"

"میں پوچھ رہا تھا کہ آپ سویڈن کے کس شہر کی رہنے والی ہیں؟"

"اشتوک ہولم کی۔" اس نے شائستہ اور متبسم انداز سے جواب دیا "آپ کبھی سویڈن گئے ہیں؟"

"نہیں، جانا بہت چاہتا ہوں۔"

"ایک بار تو اسکینڈی نیویا ضرور جائیے۔ یورپ بھر سے ہم لوگوں کے ملک بہت مختلف ہیں۔"

"جی ہاں، وہاں سنہرے بالوں والی، نیلی آنکھوں والی پریاں رہتی ہیں۔"

اس تعریف پر وہ ہنسی۔ ہنسی کی جنبش سے اس کے پھیپھڑے اور اس کا سینہ اس طرح متحرک ہوئے کہ گویا یہ بھی ایک ادائے دلبری تھی۔

ناچتے میں نعیم نے اس کے جسم کو آہستہ سے کھینچ کے اور قریب کر لیا۔ قاضی صاحب جو سفید جیشن کے ساتھ ناچ رہے تھے ان کی آنکھیں پیچ و تاب کھا کھا کے رہ گئیں۔

"میں نے اسٹاک ہولم کی بڑی تعریف سنی ہے۔"

"ہاں ہمارا شہر سات جزیروں پر آباد ہے۔ اس کے ایک طرف جھیلیں ہیں اور دوسری طرف سمندر۔"

"اور اس شہر کی دوشیزاؤں کی آنکھیں سمندر کے پانی کی طرح نیلی ہوتی ہیں۔ اور ان چہروں پر آرورا بوریالس کا سا نور ہوتا ہے۔"

"کیا آپ شاعر بھی ہیں؟" اس نے خوشی کی ہنسی ہنس کے کہا اور اس کے سارے جسم پر ہنسی کی اس جنبش کا اثر ہوا۔

"نہیں تو۔" یہ کہہ کے نعیم نے اسے اپنے سے اور قریب کر لیا۔ اب یہ دونوں سینہ بہ سینہ ناچ رہے تھے۔ اور ان کے جسم گویا پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ ایلیس سے وفا کا خیال ہتھوڑے کی طرح بار بار نعیم کے دماغ پر پڑ رہا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ برتھا کی کمر کے گرد تھے اور برتھا کی سنہری زلفیں اس کے رخساروں اور سانس کی

گردن سے مس کر رہی تھیں۔

ایک لمحہ باجا رکا اور یہ سحر ٹوٹ سا گیا۔ نعیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ آئندہ لمحوں میں کیا ہونا چاہیے۔ برنٹا کی نسوانیت البتہ اگلے لمحے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس پال جونس کے بعد کسی اور کے ساتھ ناچنے کے خیال سے اور خصوصاً اپنے دوست تاغی صاحب سے وہ گریز کرنا چاہتی تھی۔

"آپ کو کاک ٹیل بنانا آتا ہے؟" اس نے نعیم سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آپ کی طبیعت چاہتی ہو تو چلیے۔ میری ایک خاص [illegible] ہے [illegible] میں بھی بنا لیتی ہوں۔"

وہ [illegible] پاس اس میز کی طرف بڑھ گئے [illegible] شراب کی بوتلیں چنی ہوئی [illegible] سجے [illegible] اور انگلستان کی مزدور جماعت [illegible] اشتراکیوں کو گالیاں [illegible] کہ یہی [illegible] [illegible] کو [illegible] رہے ہیں [illegible] کی۔

"آپ کو میرا نام [illegible]" نعیم سے پوچھا

برنٹا [illegible] [illegible] تو [illegible]
[illegible] نام [illegible] کے حوالے کیا۔
دونوں [illegible] [illegible] گئے

[illegible] کیا [illegible]

[illegible] ایک [illegible] [illegible] نگاہ [illegible]

ـنے میں انگلستان میں پڑھتی تھی، اسے اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔

”محض اسی وجہ سے آپ کو میرا نام یاد رہا؟ ورنہ یاد نہ رہتا؟“

برتھا نے کہا ”نہیں شاید یوں بھی میں آپ کا نام نہ بھولتی۔ میرا نام آپ کو ـہے؟“

”برتھا اکسل سن۔“ نعیم نے ہنس کے کہا۔

”آپ کا حافظہ بڑا اچھا ہے۔“ وہ ہنس کے کہنے لگی۔ کاک ٹیل کے گلاس پر ـلی کی روشنی کی شعاع چمک رہی تھی اور برتھا کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں، اور ـسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ نعیم نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ وہ راجہ بہت نواز ونت ـطرف دیکھ رہی تھی۔ راجہ کی نظر بار بار اپنی ... اس پر پڑتی۔

نعیم نے ایلس سے اس چند لمحے کی بے وفائی پر اپنے دل کی ملامت سُنی۔ پھر اس ـخیز رومان کی جگہ سمجھے ہوئے طنز نے لے لی۔

نعیم نے کہا ”جی ہاں۔ برتھا اکسل سن تو ... کے کسی ڈرامے میں نہیں۔“

وہ پھر ہنسی۔ پال جونس کا یہ قصہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ راجہ بہت نواز ونت تیر کی طرح ـن دونوں کی طرف آئے۔ برتھا نے ان سے پوچھا ”آپ بھی یہ کاک ٹیل پئیں گے؟“ ـنہوں نے کہا ”ضرور شکریہ۔“ برتھا کاک ٹیل بنانے لگی اور راجہ صاحب نعیم کی ـطرف مڑے۔ ”یار نعیم کیا زور دار چھیڑ ہے ... ہے۔ لیکن اگر تجھے زیادہ پسند ـہے تو تُو لے لے۔ ... ... کو نہیں سمجھا۔ لیکن تیرے ـپاس کوٹھی اور موٹر کیوں ... ... اور یار بڑے اچھے خاندان ـکی لڑکی ہے۔ اس کا باپ ... ... ـیار ... ان دو کوڑی کی رنڈیوں سے

تنگ گیا۔"

نعیم نے کہا "شوق سے راجہ۔ میں تمہارے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔ مگر قاضی صاحب تمہیں مار ہی ڈالیں گے۔"

راجہ نے کاندھے ہلا کے "اونہہ" کہا۔ اتنے میں بیرے نے کاک ٹیل کا گلاس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس درمیان میں قاضی ہاشم صاحب بھی خراماں خراماں پہنچ گئے۔ نعیم نے راجہ ہمت نواز سے ان کا تعارف کرایا۔

قاضی صاحب نے آہستہ سے نعیم سے کہا "مجھے اس وقت بے اختیار ایک مصرع یاد آگیا:

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا"

نعیم کو ہنسی آگئی۔ قاضی صاحب اور برافروختہ ہوئے۔ نعیم نے کہا "قاضی صاحب کسی عاشق نے اپنے معشوق کے متعلق کیا خوب لکھا ہے۔ ع

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا"

یہ کہہ کے نعیم وہاں سے ٹل گیا کہ راجہ صاحب اور قاضی صاحب سویڈن کے بیچ جمال و زریں بال کا قضیہ خود طے کر لیں گے۔ اس نے اپنے میزبان سے رخصت چاہی۔ راجکمار نے کہا "ابھی سے؟ ابھی تو ایک ہی بجا ہے۔"

"مجھے ذرا نیند آرہی ہے۔" نعیم نے جواب دیا "بہت بہت شکریہ۔ آپ کی سالگرہ بہت سی آئیں۔"

شجاعت سے رخصت ہونے کے بعد اس نے اور دو ایک سے ہاتھ ملایا۔ اب لانا چ شروع ہونے ہی والا تھا اور اس مرتبہ قاضی صاحب اپنی محبوبۂ طناز کے ساتھ ناچنے نکلے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں راجہ کے دانۂ حسن کا لاکھ تعاقب کریں، جنز تو وہ ان کی تھی۔

تھا اپنے چیچک رُو عاشق کے ساتھ ناچنے اُٹھ ہی رہی تھی کہ نعیم اس سے رخصت ہونے لگا۔ اس نے جلدی سے بٹوا کھولا اور اپنی ناک پر پاؤڈر لگانے لگی۔ پھر "شب بخیر" کہہ کے اس نے بم سے مصافحہ کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ نعیم نے جب ہاتھ ملایا، تو اپنے اور اس کے ہاتھ کے درمیان اس نے کاغذ کے ایک سخت سے ٹکڑے کو محسوس کیا، جسے اس نے فوراً ہی مٹھی میں بند کر لیا۔ اب بھی اسے یقین نہیں تھا کہ برتھا کی نیلی آنکھیں اس کی طرف مائل ہیں یا راجہ ہمت نواز کی طرف یا فاصنی کی طرف یا تینوں کی طرف۔

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اسے ان نیلی آنکھوں کے ہرجائی پن کے مقابل ایلس کی وفاداری یاد آئی۔ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کارڈ پر برتھا کا سویڈن اور پیرس کا پتہ تھا۔

اور کمرے سے رقص کی، ہنسی کی، چھیڑ چھاڑ کی آواز آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بند دروازے کے باہر تک بھی ریکارڈ باجے کے ساتھ یہ گیت گا رہا تھا۔ یہ پیغام سُنا رہا تھا۔

"دو کے سلئے چائے اور چائے کے لئے دو"

(۲)

باقی رات کا بڑا حصہ ایلس کی یاد میں اس نے پیرس کی سڑکوں پر پھرتے گذارا۔ راتوں کو شہر کی سڑکوں پر پھرنا بھی ایک عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ اندر انسان اپنے آپ سے ڈرتا ہے، اور باہر شہر کی خاموش دنیا ہے۔ خاموش روشنیاں، اخباروں میں لپٹے ہوئے آدمی، مکانوں کی کھلی ہوئی کھڑکیاں، کسی کسی کھڑکی میں روشنی، پولیس والے کے قدموں کی چاپ، دو دو تین تین آدمیوں کی ٹولیاں جو تھوڑی دیر کے بعد باتیں کرتی گذر جاتیں شریفوں کی ٹولیاں اور بدمعاشوں کی ٹولیاں اور رنڈیوں کے کھٹکھٹاتے ہوئے جوتوں کی آوازیں۔

"شیری۔ وُدلے مُدفیرا مور او ک مُو آ" اور بودلیر کا مصرع " شہر، خوابوں سے بھرا ہوا شہر" سناٹا اور اس سناٹے میں وہ آہٹیں جن کی وجہ سے انسان کبھی کبھی دیووں سے بھی زیادہ خوفناک اور ظالم معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت اس بظاہر خاموش شہر میں، اس دنیا کے سب سے حسین شہر میں معلوم نہیں کتنے جوڑے ہم آغوش ہوں گے، کتنے بچے پیدا ہو رہے ہوں گے، کتنے لوگ مر رہے ہوں گے۔ پیدائش، افزائشِ نسل اور موت، اور پھر اس بے مقصد ڈرامے میں بیکاری اور بھوک۔ اخباروں میں لپٹے ہوئے کھانستے ہوئے جسموں کے آر پار ہو جانے والی تیز ہوا۔ اور آج ہی صبح کو ایک طیارہ ایلیس کو اڑا لے گیا تھا۔ چھ ماہ کے لئے یا عمر بھر کے لئے؟ اس کی یاد ہمیشہ ستائے گی؟ یا برتھا یا میری پاول یا کوئی اور اس کی جگہ لے لے گی؟ اور بلقیس سات سمندر پار کا وہ نقطۂ موہوم۔ وہ نقطۂ موہوم جس کی گردش سے جذبات کا پہلا دائرہ بنا۔

"اور اب ستمبر کا پہلا ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ تعلیمی سال شروع ہونے ہی والا ہے۔ ایلیس تو چلی گئی۔ میں ابھی سے انگلستان کیوں نہ چلا جاؤں؟ اب پیرس میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہ جگمگاتی ہوئی لال روشنیوں والا شہر۔ یہ برہنہ جسموں والا شہر۔ یہ شہر جو میرے ہم وطنوں، میرے ہمراہان سست عناصر کو جس قدر راس آتا ہے اور کوئی شہر راس نہیں آتا۔ ۔۔۔

اسی شہر میں لوور بھی ہے اور قومی کتب خانہ بھی۔ یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی بھی ہے اور دنیا بھر سے چنے ہوئے آرٹ کے نادر ترین نمونے بھی۔ پھر بھی میرے ہم وطنوں کے قدم مون مارتر کی طرف ہی کیوں اٹھتے ہیں۔ برہنہ جسموں کی خبر گی کیوں ان کے دماغوں پر اس قدر چھائی ہوئی ہے۔

اور اب تو کرا کسلے اور ہروشا بھی جا رہے ہیں۔ میں یہاں کچھ دن اور رہا تو اپنے انہی ہم وطنوں کے ساتھ گذر کرنی پڑے گی۔ میں ہروشا کے ساتھ کیوں نہ چلا جاؤں۔ رہائن لینڈ کو بھی لگے ہاتھوں دیکھ ہی لوں؟

اور اس رات کو تنہا ٹہلتے ٹہلتے سفر کا جنون نعیم کے دماغ پر چھانے لگا۔ سفر ہی میں اپنی ذات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آتی۔ سفر ہی میں زندگی کا لطف اور حسن اس کی آنکھوں میں جچتا۔ سفر میں وہ گویا اپنے آپ کو پا لیتا۔ قیدِ مقام میں اس کے حواس خوابیدہ سے ہو جاتے۔ زندگی اس کے پاس سے ہو کر گذر جاتی اور اسے خبر نہ ہوتی شاید سفر ہی اس اندرونی شدید دلی تکلیف کا ازالہ کر سکے جو ایلس کے چلے جانے سے پیدا ہوئی۔ شاید سفر ہی سے یہ خلا پر ہو۔ تعلیمی سال کے لئے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے تو کیا ہرج ہے۔ کسی بہانے دو ہفتے کی رخصت سہی۔ پھر اس نے ٹہلتے ٹہلتے سفر کا پروگرام بھی بنانا شروع کیا۔ کولون تک تو ہر صورت میں ہروشا کا ساتھ ہوگا۔ ہروشا کو وہ مجبور کرے گا کہ میونک اور وی آنا کے راستے پر رک جائے۔ ورنہ وہ خود اکیلا کم سے کم میونک تو ہو آئے گا۔ پروشیا جانے کے لئے کافی وقت نہیں۔ لیکن جنوبی جرمنی کی سیر تو ہو جائے گی۔ اور اگر کرا کسلے بھی ساتھ چلنے پر تیار ہو جائے تو کیا کہنے۔

(۳۷)

اور تین چار روز کے بعد کرا کسلے، نعیم اور ہروشا ریل گاڑی کے ایک تیسرے درجے کے ڈبے میں کولون جا رہے تھے۔ جب ریل اس سرحد پر رکی جس پر سے دنیا کی انتہائی طاقتور فوجیں گذری ہیں اور جس کے اطراف میں دنیا کی خونریز ترین لڑائیاں ہوئی

ہیں، تو پلیٹ فارم سے آلۂ مکبّر الصوت نے کرک کے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی میں اعلانات سُنائے کہ جس کے پاس جتنی نقدی ہو وہ پاسپورٹ افسر کو بتا دے۔ پاسپورٹوں کا امتحان ہوا مہریں لگیں اور گاڑی نے پھر حرکت کی۔

جب گاڑی کولون پہنچی تو رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا اور مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اس موسم میں شہر کی روشنیاں اور گوٹھانی رسم الخط میں دوکانوں کے برقی نام بھی دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہوٹل شوائیسر ہوف میں کرا کسلے نے پہلے سے کمرے محفوظ کرا لئے تھے۔

رات اور مسلسل بارش میں نعیم نے محسوس کیا کہ اب وہ پیرس سے اور اس ماحول سے جس میں الیس کے بغیر ایک ناقابلِ برداشت خلا تھا باہر آ چکا ہے۔ ہوٹل کی سیڑھیوں اور راستے پر باتیں کرنے والوں کی زبان مختلف تھی۔ صفائی تھی۔ ستھرا پن تھا۔ بھدّا پن تھا مگر اب نعیم نے اپنے کو ذرا آزاد محسوس کیا ——— پیرس کے طلسم سے آزاد۔

صبح کو پھر وہی لگاتار بارش۔ لیکن اس بارش کے باوجود کولون کی سیر ضروری تھی کیونکہ دو تین دن کے اندر ہیروشاتو اپنے وطن کو روانہ ہونے ہی والا تھا۔ لیکن کرا کسلے بھی زیادہ نہ ٹھہر سکتا تھا۔ دریائے رہائن کا صرف تھوڑا ہی سا حصّہ پُل سے نظر آتا تھا۔ باقی دُھند سے چھپا ہوا تھا۔ راٹ ہاؤز (ٹاؤن ہال) دیکھ کے ان لوگوں نے ایک کیفے میں چائے پی۔ وہاں گھنٹہ بھر تک باتوں میں وقت گذارا۔ رہائن کے قریب ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ جرمن غذا بہت بھاری تھی۔ بڑے بڑے کٹ لٹ اور ان کے ساتھ بڑے بڑے آلو۔ پھر گھر واپس آئے۔ چار بجے پانی رُک چکا تھا۔ کافی پی کے پھر باہر نکلے اور کولون کے اس مشہور و معروف آہنی پُل کو دیکھنے گئے جس پر گذشتہ

جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں کے فوجی جوتوں کی چاپ کی آواز جرمنوں کے دل چھیدتی رہی تھی
رہائن پر سے اب دھند کا بادل چھٹ چکا تھا اور شفاف دھوپ میں میلے رنگی سوندھی
... توں کی چھتیں چمک رہی تھیں۔ دریائے رہائن اس وقت فی الحقیقت موجزن رہے تھے
ہو رہا تھا۔ وہ دریا جس سے قرونِ وسطیٰ کی پوری رومانیت وابستہ ہے
کنارے قلعے ابھی تک جرمن فروسیت اور جرمن شاعری کی نشانیوں کے کنارے بہت سے
کولون کا کلیسائے اعظم بھی ان لوگوں نے دیکھا جو یورپ کے جن کا پانی چمک رہا تھا
میں سے ہے۔ ہم دوستانے جرمن یہودی شاعر ہائنے کی وہ مشہور رہا تھا۔ ۳۱
جس میں اس نے عظیم اور مقدس کولون کے کلیسائے اعظم کا ذکر کیا ہے جس کا عکس
پانی پر پڑتا ہے۔ اس کلیسا میں حضرت مریم کی ایک تصویر ہے جس کو دیکھ کر شاعر کو
اپنی محبوبہ یاد آتی ہے۔

دوسرے دن موسم خوشگوار رہا اور اگرچہ دو تین گھنٹے ابر رہا لیکن بیچ بیچ میں دھوپ
چمکتی رہی کشتی میں یہ تینوں اوپر شمال کو دوسل دورف گئے جو رہائن لینڈ کے صنعتی مرکزوں
میں سے ہے۔ کشتی کے کنارے تیرہ چودہ برس کی دو جرمن لڑکیاں عرشے پر کٹہرے
کا سہارا لگائے کھڑی تھیں۔ ان کے ستھرے اور خاکی بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔
اور ان کا لباس کٹہرے سے اُلجھ رہا تھا۔

جرمن عورتیں بالعموم گداز تھیں، بلکہ کسی قدر بھدی۔ گوشت اور آلو اور بیئر کے
زیادہ استعمال کی وجہ سے چربی کی تہ کی تہ چڑھی ہوئی۔ اور مردوں میں ہر چوتھا یا پانچواں
یونیفارم میں۔ بازو پر سواستکا کا نشان جس سے جرمنی آنے سے پہلے نسیم کو انتہائی
نفرت تھی مگر اب وہ اس کا عادی ہو چلا تھا۔

ہیلے

اعلان، نعیم کو پہلے تو یہ خیال تھا کہ جرمنی میں جس نسلی تعصب کی تبلیغ کی جا رہی ہے اس
کا امتحان ہے وہاں کے لوگ ہندوستانیوں کو بھی بہت ذلیل سمجھتے ہوں گے لیکن کراکسلے
جب گاڑنوں نے یقین دلایا کہ یہ نام نہاد نسلی تعصب دراصل معاشی تعصب ہے۔
رہی تھی۔ اس موسمانی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستانیوں اور حبشیوں سے تعصب
دھندلے معلوم ہو رہی کے حالات کا اقتضا یہ ہے کہ یہودیوں سے تعصب ہو۔ ہاں قانون
محفوظ کرا لئے تھے سے شادی بیاہ کی روک کرتا ہے لیکن ہندوستانی یہاں ہیں کتنے؟ اور
، رات اٹے ہی کبھی چشم پوشی بھی کر جاتا ہے۔

دوسل دورف کی جدید وضع کی عمارتوں کے درمیان لمبی چوڑی سڑکوں پر یہ تینوں گھومتے رہے۔ اس شہر کا نقشہ اور اس کی تعمیر جدید قسم کی تھی۔ کولون میں اور اس میں وہی فرق تھا جو قرونِ وسطیٰ اور عصرِ جدید میں ہے، پھر بھی ان دونوں شہروں کی زندگی، ان کی روحِ عمل، ان کا فلسفۂ حیات، ان کا طرز اور تمدن بالکل ایک تھا۔ عمارتیں پرانی ہو جاتی ہیں اور نئی بھی بنتی ہیں۔ لیکن دونوں میں رہنے والا انسان اس صورت میں ایک ہی تھا۔

اگلے روز ریل پر ری ماگن گئے۔ یہ کولون سے جنوب میں رہائن کے کنارے ایک گاؤں ہے۔ پہاڑی پر ایک چھوٹا سا کلیسا اور زیارت گاہ ہے۔ ندی کا پاٹ چوڑا ہے اور کناروں کا منظر دل کش۔ آج موسم بھی بڑا دلفریب تھا۔ گذشتہ دو دنوں کی سردی کے بجائے موسم میں ایک ہلکی سی خوشگوار خنکی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کے یہ تینوں ندی کے کنارے کنارے چلے۔ سامنے رہائن کا پُل تھا اور اس پُل پر لڑکوں کا جمِ غفیر تھا۔ لڑکوں نے بہت کم اس سے پہلے کسی

گندمی رنگ کے باشندے کو اس اطمینان سے اپنے گھروں کے پاس چہل قدمی کرتے دیکھا ہوگا۔ نعیم کے ایک طرف کرا کسلے تھا اور دوسری طرف ہروشا۔ یہ دونوں عمومی مغربی کپڑے پہنے تھے۔ صرف نعیم عام ہندوستانی طالب علموں کی طرح اس موقع پر بھی بھاری سوٹ پہنے تھا۔ ایک لڑکے نے جس کے ذہن میں شاید الف لیلیٰ کے قصے گھوم رہے تھے، چلا کے اپنے ساتھیوں سے کہا "یہ دیکھو عرب شہزادہ آ رہا ہے۔"

پُل سے یہ تینوں ندی کے اس پار پہنچے اور ندی کے کنارے بہت دُور دُور چلے گئے۔ اس وقت اس دریا پر عجب بہار تھی۔ دھوپ میں اس کا پانی چمک رہا تھا۔ اس کا پاٹ چوڑا تھا اور پرشکوہ اطمینان کے ساتھ اس کا پانی بہہ رہا تھا۔ اس پانی کے کنارے کتنے بڑے بڑے فاتحوں کے سر جھکے، کتنے ہیرو اپنی جان پر کھیل گئے۔ کتنی سنہری بالوں والی لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ جان بچا کے بھاگیں۔ یہ سب افسانے جرمن شاعری اور رہائن کا مشترکہ ترکہ ہیں۔

اس درمیان میں یہ تینوں ٹہلتے ٹہلتے ایک اور گاؤں میں پہنچے۔ ایک چھوٹی سی سڑک پر ایک یہودی نا شخص، ایک سنہرے بالوں والی جرمن لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے جا رہا تھا۔ کرا کسلے نے کہا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔"

اس گاؤں میں رہائن پر کوئی پُل نہ تھا۔ سڑک پانی کے پاس ایک چبوترے پر ختم ہو جاتی تھی۔ ایک بڑی سی کشتی لوگوں کو اس پار سے اُس پار پہنچاتی تھی۔ کشتی کی ساخت ایسی تھی کہ موٹریں تک اس میں آ جاتیں۔ اس کشتی سے یہ تینوں اور کچھ اور مسافر اور ان کی موٹر دوسرے کنارے پہنچے۔

رات کو تینوں اسی گاؤں کے چھوٹے سے ریستوران میں کھانا کھانے گئے جس میں

یہ ٹھہرے تھے۔ اس وجہ سے کہ یہ لوگ انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے 'ری ماگن' کے کچھ لوگوں نے جو وہاں بیئر پینے آئے تھے۔ ان سے انگریزی میں "گڈ ایوننگ" کہا۔ غالباً اس سے زیادہ انگریزی ان میں سے کسی کو آتی بھی نہ تھی۔ یہ بھی ٹیوٹانی اخلاق کا اظہار تھا۔ جب نعیم نے جرمنی کے باشندوں کے اخلاق کی تعریف کی تو کرا کسلے نے کہا۔

"میں تو تم سے کہتا ہی تھا۔ یہ بھاری بھدے جرمن بالعموم بے ضرر ہوتے ہیں۔ جب تک یہ بیئر پیتے رہتے ہیں یہ بالکل محفوظ ہیں، لیکن جہاں انہوں نے سوچنا شروع کیا تو ہوا میں اُڑتے ہیں، اور ان کی مابعد الطبیعات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یا زمین پر کھیلنے لگتے ہیں اور اسی نئے ہتھیار اور سیاسی اسکیمیں بناتے ہیں، یا سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں اور یو بوٹ بناتے ہیں لیکن صلح کے ایام میں یہ قوم بالکل بے ضرر ہے۔"

اس پر ہرونشا نے کہا "یہ ذرا یہودیوں کے دل سے پوچھو۔"

رات کو ری ماگن میں آرام کر کے صبح کو تینوں دوست اسٹیشن پہنچے۔ نعیم برنرڈ شا کے اس ڈرامے کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا پہلا منظر ری ماگن میں ہے کہ اتنے میں ریل آ گئی۔ رہائن کے کنارے ریل سے عجیب ہی منظر دکھائی دیتا ہے چوڑے پاٹ والے آہستہ خرام دریا کے دونوں جانب ریلیں اور سڑکیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبے، ان کی سڑکوں پر اور ندی کے پانی پر سورج کی چمک۔ یہاں تک کہ گاڑی سینٹ گوار پہنچی جو غالباً رہائن کی تمام چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں اُتر کے تینوں نے سارا دن پھرنے میں گذارا۔ بہت دُور تک ندی کے کنارے پھرتے رہے۔ ایک کشتی لے کے ندی کو پار کیا اور دوسرے کنارے پر بہت دُور تک پھرتے رہے۔

چاندنی رات تھی۔ ہلکی سی چاندنی لیکن رہائن پر اس کی بہار عجب ہی ہوتی ہے۔ جس

چھوٹے سے ہوٹل میں یہ کھانا کھا رہے تھے وہاں کی بیس سالہ خادمہ نے کھڑکی سے چاندنی میں رائن کے منظر کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اس وقت لورے لائی بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہوگی۔"

کراکسلے نے کہا: "ہاں، بیشک، مگر جب تک ہمارے ساتھ کوئی چھوٹی سی خوبصورت لڑکی نہ ہو ہم بھلا کیا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ہاں، رائن کی کوئی بیٹی ہمیں لورے لائی کی سیر کرائے تو دوسری بات ہے۔"

اس پر وہ خادمہ ہنسی۔

کراکسلے نے کہا: "تم نہیں چل سکتیں؟"

اس لڑکی نے کہا: "مالک کی اجازت کے بغیر کیسے جا سکتی ہوں۔"

کراکسلے نے کہا: "میں اس سے پوچھ لوں؟"

لڑکی نے جواب دیا: "اگر آپ چاہیں تو پوچھ لیجیے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"تھیا۔"

"کیسا پیارا نام ہے۔"

"آپ انگریز ہیں؟"

"ہاں میرا نام جیمز ہے اور یہ میرا دوست ہے۔ اس کا نام نعیم ہے!"

"یہ بھی انگریز ہے؟" تھیا نے بھولے پن سے کہا۔

"نہیں ہندوستانی۔ عرب، حبشی جو چاہے سمجھ لو۔" کراکسلے نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک اور میز سے ایک بھاری بھرکم جرمن عورت نے تھیا کو پکارا اور وہ اس کا حکم سننے چلی گئی۔

رات کے دس بجے کے قریب تھیا کو چھٹی ہوئی اور وہ ان تینوں دوستوں کے

ساتھ چاندنی رات میں اس سڑک پہ ٹہلنے آئی جو لورے لائی کی چٹان کو جاتی تھی کبھی کبھی کوئی سائیکل پاس سے گذرتی اور سائیکل والا حیرت سے اس عجیب گروہ کو دیکھتا۔ایک نوجوان پائپ پیتا ہوا دنیا بھر سے بے خبر، ایک شخص ہلکی سانولی رنگت اور کالے چکنے بال اور غیر یورپی چال والا، ایک خوبصورت سا غیر ملکی، غالباً انگریز اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک جرمن لڑکی جس کا لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ مزدور طبقے کی ہے۔

لورے لائی کی چٹان جیسی خوبصورت چیزیں رب العلمین نے بہت کم بنائی ہیں۔ جب ہائن اس حصے سے گذرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادو کا خطہ ہے۔آہستہ آہستہ تمکنت اور عظمت سے بہنے والی ندی کے قریب یہ بڑی سی چٹان۔ ندی کے اس پار سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز اور چاندنی میں نیم عیاں اور نیم مبہم گردوپیش کا وہ منظر کہ جس کا یاد رکھنا مشکل ہے اور جس کا بیان کرنا ناممکن۔ اس چٹان اور اس مقام سے جرمن شاعری اور جرمن ادب کے ہزاروں رومان وابستہ ہیں۔اس جادو کی چٹان پر آج بھی وہی حسن بکھرا پڑتا ہے جس نے سینکڑوں برس قبل جرمن شاعروں کو مسحور کیا ہے۔

ہروشا اور نعیم ذرا الگ بیٹھے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔تھیا کراکسلے کی آغوش میں تھی اور کراکسلے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر رہا تھا۔بیچ بیچ میں ان دونوں کے ہنسنے کی آواز آتی اور پھر باتوں کی ـــــ عاشقی کی باتوں کی مبہم سی آواز۔نعیم نیم رشک اور نیم دلچسپی سے ان دونوں کو اس منظر کے پس منظر کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں تھیا کے ہنسنے اور پھر گنگنانے کی آواز آئی اور پھر اس کی آواز نغمہ بن گئی اور اس نے ایک پرانا جرمن گیت گانا شروع کیا جو سینکڑوں سال سے جرمن لڑکیاں اپنے عاشقوں کو سناتی آئی ہیں۔

ہروشا نے اس متروک زبان میں لکھے ہوئے گیت کا خلاصہ سمجھایا۔ لڑکی کہتی ہے کہ "تم مجھے سب سے پیارے ہو، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ رات کے وقت آؤ۔ آدھی رات کے قریب آؤ۔ میرا باپ سوتا ہوگا میری ماں سوتی ہوگی۔ میں اکیلی سوتی ہوں۔ کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹا — سیٹی کو بلاؤ۔ میرا باپ یہ سمجھے گا —— میری ماں یہ سمجھے گی کہ یہ ہوا کا شور ہے۔"

جب وہ گیت ختم کر چکی تو ہروشا نے تعریف کی۔ نعیم نے بھی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا اور کراکسلے نے جس کا ہاتھ تھیا کی کمر میں تھا، اسے لپٹا کے اس کا بوسہ لیا، اور پھر رہائن کی باجبروت روانی اور چاندنی کے نکھار اور چٹان کے جادو اور دور کسی ریل کی گھڑگھڑاہٹ کے پس منظر سے ابھر کر تھیا کی سریلی آواز نے ایک گیت سنانا شروع کیا جو مقابلتاً جدید زبان میں تھا اور جسے نعیم بھی بلا ترجمے کے سمجھ سکتا تھا۔

"میں ایک لڑکی کو جانتا ہوں جو بڑی حسین اور خوبصورت ہے

مجھے اس کے ساتھ سونے کی بڑی تمنا ہے

اس کا گھر رہائن سے دور نہیں

کاش میرے پیر مجھے وہاں تک بہا لے جا سکتے

آہ خدایا! کاش رہائن اتنا چھوٹا ہوتا

کہ میں تیر کے اس کے پار جا سکتا ...."

دوسری صبح کو کراکسلے تھیا سے لپٹ کے اور نعیم کو صبح بخیر کہہ کے کولون واپس جانے والی ریل میں ہروشا کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اسے سیدھا انگلستان واپس ہونا تھا اور اس کا اسے افسوس تھا کہ نعیم کے ساتھ وہ میونک تک نہیں جا سکتا۔ اور ہروشا کی تعطیلات بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ کولون سے اسے برلن ہوتے ہوئے پراگ جانا تھا۔ جہاں چار دن کے بعد اسے چیکوسلاواکیہ

کے دفتر وزارتِ خارجہ میں ایک عہدے کا جائزہ لینا تھا۔

رتنا بھی ریل کے جانے کے بعد نسیم سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوئی اور نعیم اپنی ٹرین کا انتظار کرنے لگا جو اسے جنوب کی طرف لے جانے والی تھی۔

اس نئی ٹرین سے بھی وہ رہائن کا منظر دیکھتا رہا تین عورتیں مقابل کی نشست پر بیٹھی تھیں۔ ایک بہت مہذب ادھیڑ عمر کا برمن اس کے قریب بیٹھا تھا اور اس سے اس کے وطن اور اس کے سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر وہ خاموش ہوگیا اور منظر دیکھتے دیکھتے نعیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایلیس کے خیال سے دل میں اس نے درد کی ایسی کسک محسوس کی گویا اس کے بغیر زندگی نامکمل سی تھی۔ رتنا اور کرا کسلے کے جانے کے بعد پھر تنہائی کے احساس نے اس کے دل پر ہتھوڑے چلانے شروع کئے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ سفر ایک گریز کی سی کیفیت ہے۔ زندگی سے، تنہائی سے اور اپنے آپ سے۔ اور یہ سفر ہے کیا ہے نئے پس منظروں میں اپنے آپ کو بھلا دینے کی کوشش جیسے زندگی کا سفر تنہائی سے تنہائی کا علاج۔ ایلیس واپس آئے گی یا نہ آئے گی۔ اب تک اس کا ایک خط بھی نہ مل سکا تھا لیکن آج ہائیڈل برگ میں اس کے خطوط ملیں گے۔ پیرس سے وہاں بھیج دیئے گئے ہوں گے۔

ایک طرح کی اعصابی کمزوری نعیم پر حاوی ہونے لگی۔ تین عورتیں سامنے کی نشست پر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کب تک میں اس طرح گریز کرتا رہوں گا۔ کب تک یہ ذہنی اور جذباتی انتشار باقی رہے گا۔ اور کوئی نہ کوئی نتیجہ کوئی امتزاج میری روح اور ذہن اور جسم کی مضامین سے ابھرے گا۔ کب تک میں زندگی سے بچ بچ کے خوابوں کی دنیا میں، عاشقی میں پناہ لیتا رہوں گا اور عاشقی بھی خالص جذباتی عاشقی، جس میں کوئی ذہنی اطمینان نہیں۔

مانٹس میں گاڑی بدل کے وہ ہائیڈل برگ جانے والی ریل میں سوار ہوا۔ غروبِ آفتاب سے

دو گھنٹے پہلے نعیم ہائیڈل برگ پہنچا۔ پہاڑوں پر ہلکی سی کہر تھی اور خزاں نے ان پہاڑیوں پر اُگے ہوئے درختوں کے رنگ پر زردی سی پھیر دی تھی جو دھوپ کی پیلی سی چمک میں بڑی دلکش معلوم ہوتی تھی۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں نیکر بہتا ہے، جس کے متعلق اقبال نے ایک بڑی دلکش نظم لکھی ہے۔ مکانوں کا رنگ صوفیانہ تھا۔ ان کی وضع قدیم، شہر کا نقشہ قرون وسطیٰ کا، اور صفائی بیسویں صدی کی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں قلعے کا منظر۔ کیا کوئی قصبہ اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے؟

اپنا سوٹ کیس لئے وہ اس خوبصورت شہر کی سڑکوں پر راستہ پوچھتا ہوا بڑھا۔ ہر چوتھا آدمی یونیفارم پہنے تھا۔ ایک نوجوان افسر سے اس نے "لانڈاؤ روزا اشتراسا" کا پتہ پوچھا اور وہ اسے اپنے ساتھ روزا اشتائیگ مایر کے مکان تک لے آیا۔ نعیم اس قوم کے اخلاق کا گرویدہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ با اخلاق، مہذب قوم، یہ سادگی پسند اور صاحب دماغ قوم کیونکر تیری جدوجہد کے دام میں اسیر ہو سکتی ہے۔ کیا فطرت انسانی میں اس قدر تضاد ممکن ہے؟ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی باہر جانے کے کپڑے پہنے ہوئے سیڑھیوں سے اُتری۔ روزا اشتائیگ مایر یہی تھی۔ اس کا نام روزا تھا اور اس کی صورت بھی گلاب ہی ایسی تھی۔ گول گول گلاب کی طرح سُرخ چہرہ، گداز لب، گہری نیلی آنکھیں، بھورے سُرخی مائل بال، شرمیلی آنکھیں، سفید خوشنما دانت، چھوٹی سی آریائی ناک، میانہ قد اور سڈول جسم۔ چہرے سے شرافت اور حُسن یکساں ظاہر۔

نعیم نے ٹوپی اتار کے کہا "میں فراؤ اشتائیگ مایر یا فرائے لائن اشتائیگ مایر سے مل سکتا ہوں؟"

"میں ہی فرائے لائن اشتائیگ مایر ہوں!"

"میرا نام حسن ہے، نعیم حسن۔ کیا آپ کو مسٹر کرا کسلے کا خط ملا تھا.....؟"

"جی ہاں!" اس نے ہاتھ بڑھا کے ہاتھ ملایا "آپ کا کمرہ تیار ہے۔ میں آپ کو راستہ دکھلائے دیتی ہوں۔"

نیچے پر اس نے پوچھا " ہر کرا کسلے کیسے ہیں ؟"

" اچھے ہیں ۔" نعیم نے جواب دیا " آج ہی صبح وہ لندن واپس گئے ہیں ۔ آپ انہیں اچھی طرح جانتی ہیں ؟" نعیم نے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گفتگو کرنے کی کوشش کی ۔

" جی ہاں ۔ گذشتہ سال گرمیوں میں جب وہ یہاں یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہی یہاں رہتے تھے ..... یہ ہے آپ کا کمرہ ۔" اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر کہا ۔ کمرے میں شاہ بلوط کا بھاری بھرکم ، پرانی وضع کا مگر خوبصورت فرنیچر تھا ۔ ایک بڑی سی مسہری ، بڑا سا سنگار میز ، منہ ہاتھ دھونے کا میز ۔ سرے پر بہت بڑا آتشدان تھا ۔

" آپ چائے پئیں گے ؟" روزا نے پوچھا ۔

" نہیں میں راستے میں پی چکا ہوں ۔ شکریہ ۔" نعیم نے کہا ۔

" تو اگر آپ اجازت دیں تو میں جاؤں ۔ مجھے اپنی والدہ کے ساتھ جانا ہے ۔"

" ضرور ۔ بہت شکریہ ۔"

کپڑے بدل کے نعیم پال لانکس سے ملنے نکلا ۔ یہ ایک مصور تھا جس کے نام کرا کسلے نے نعیم کو ایک خط دیا تھا ۔ بان ہوف اشترا سا یعنی اسٹیشن کی سڑک پر اس کا مکان تھا ۔ ایک بڑے سے پھاٹک سے نعیم اندر داخل ہوا ۔ پھاٹک کے دونوں طرف اندر بڑے بڑے دالان تھے ۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا صحن تھا ، اور صحن کے اطراف دو منزلہ مکان تھا ۔ نعیم کو یہ مکان کچھ ایسا ہی معلوم ہوا جیسے ہندوستان خصوصاً یو ۔ پی کے پرانے شرفا کے مکانات ۔ بائیں طرف کے دالان میں ایک آرام کرسی پر ایک بڑھیا لیٹی ہوئی تھی ۔ ایک بوڑھا بید کی کرسی پر بیٹھا عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا ۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں ۔

نعیم نے پوچھا " کیا ہر پال لانکس یہیں رہتے ہیں ؟"

اس اثنا میں پینتیس چالیس سال کی ایک دُبلی پتلی عورت بھی ایک کمرے سے باہر نکل آئی۔ بوڑھے نے اپنی عینک اتاری۔ ان تینوں کے چہروں پر انسانیت اور شفقت سی جھلکنے لگی۔اور بوڑھے نے کہا۔

"آپ پال سے ملنا چاہتے ہیں؟ اس کی شادی ہو گئی ہے۔اس نے الگ گھر لے لیا ہے۔"

بڑھیا نے پوچھا "آپ اسے جانتے ہیں؟"

نعیم نے کہا "میرے پاس ان کے نام ایک تعارفی خط ہے۔"

چالیس سالہ عورت نے کہا "میں پال کی بہن ہوں۔یہ میرے والد ہیں۔اور یہ میری والدہ" نعیم نے سب سے ہاتھ ملایا۔بوڑھے نے اپنی کرسی خالی کر کے نعیم کو اس پر زبردستی بٹھایا اور اندر سے اپنے لئے ایک کرسی نکال لایا۔نعیم نے پال کے نام کا خط اس کی بہن کو دے دیا۔

"آپ ہندوستانی ہیں؟" اس نے کہا۔

"جی ہاں!"

اور ماں باپ اور ان کی چالیس سال کی بیٹی ہندوستان کی عظمت کی تعریف کرتے رہے اور ہندوستان کے متعلق سوالات کرتے رہے۔بہت اصرار کر کے انہوں نے نعیم کو چائے پلائی۔بڑھیا نے ایک بڑا سا کیک اس کے حوالے کیا اور بڑا اصرار کیا کہ اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

پھر تامس کُک کے دفتر پہنچ کے اس نے پوچھا کہ آس کے لئے کوئی خط وغیرہ ہے۔ ایلس کے دو خطوط اسے ملے۔ بنکر کے پرانے پُل کی طرف جاتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ لفافے کو چاک کیا۔پہلے خط میں والہانہ محبت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔محبت، محبت، محبت،

پھر وہ آخر اسے اس طرح چھوڑ کر کیوں گئی؟ یہ خط نیویارک سے ایلیس نے لکھا تھا۔ دوسرا خط سنسناٹی سے لکھا تھا۔ اس کا لہجہ معتدل تھا۔ اپنی ماں کی صحت کا ذکر، اپنے تمام دوستوں کا ذکر، گھر آنے کی خوشی کا ذکر، اور آخر میں یہ کہ سب سے زیادہ وہ نعیم کو چاہتی ہے۔

نیکر کے پرانے پل سے نعیم غروب آفتاب کے وقت قلعہ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ صنوبروں میں جڑا ہوا قلعہ۔ اور ایک پہاڑ کا طویل سایہ دوسرے پہاڑ پر۔ مکانوں پر ایک خاموشی سی طاری تھی۔ ان رنگین خوبصورت رومانی جرمن مکانوں پر اور آتشدانوں کا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا۔ نیکر کا خرام اتنا ہی آہستہ اب بھی تھا، جیسا اقبال نے اسے اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہاں دیکھا تھا۔ شاید اسی پل سے، شاید یہیں کہیں کھڑے ہو کے اقبال نے گہری ہوتی ہوئی شام کو ہائیڈل برگ کے پہاڑوں اور مکانوں اور نیکر کی روانی کی خاموشی کا لطف اٹھایا ہوگا۔

اس کا دل مطمئن تھا۔ ایلیس کے دونوں خطوط محبت میں ڈوبے تھے اور ہائیڈل برگ اور اس کے دل کی طرح پرسکون تھے۔ ہائیڈل برگ کے دونوں طرف پہاڑ خاموش تھے۔ اور چوڑی ہوتی ہوئی وادی جو ان پہاڑوں کے ساتھ ساتھ میدانوں میں حل ہو جاتی ہے اور نیکر کو رائن تک پہنچا دیتی ہے، وہ بھی خاموش تھی۔ شہر کی روشنیاں مکانوں کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔

نعیم نے ہوٹل برگن ہوف میں کھانا کھایا۔ جہاں کھانا مہنگا تھا۔ پھر اشتائگ ماٹر کے پانسیاں واپس آیا۔ زینے پر اسے روزا ملی جو اپنی ماں کے ساتھ نیچے اتر رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا تعارف کرایا۔ فراؤ اشتائگ ماٹر کی عمر کوئی پینتالیس سال کی تھی۔ مگر نعیم نے اس عمر کی ایسی خوبصورت عورتیں بہت کم دیکھی تھیں۔ ماں کے مقابلے میں اس کی اٹھارہ سالہ لڑکی پھیکی معلوم

ی کتھی۔ نعیم سوچنے لگا کہ فراؤ لیتا اشتائیگ ما' جوانی میں کس قدر خوبصورت ہوگی۔

دوسرے روز اس نے ناشتہ کے بعد ایلس کو ایک بڑا لمبا چوڑا نامۂ شوق لکھا۔ پھر ں سڑک پر سیر کرنے کو نکلا جو نیکر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ ایک کلیسا کو دیکھا۔ یک مرہٹہ طالب علم ملا جو ہند آریائی السنہ پر تحقیق کر رہا تھا۔ مگر جسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ ردو زبان سنسکرت سے نکلی ہے یا سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی مرہٹے کے ساتھ یورسٹی کی لائبریری دیکھی۔ یونیورسٹی کی پرانی عمارت دیکھی، جس کو دیکھ کے آکسفرڈ یاد آتا تھا۔ ی عمارت دیکھی جو امریکی طالب علموں کی فیاضی سے بنی تھی۔ لڑکوں کا قید خانہ دیکھا دارالمطالعہ دیکھا۔ پھر اسی ہندوستانی کے ساتھ فلسفیوں کی روش پر چہل قدمی کی۔ یہ پہاڑ پر ایک چوڑی سی روش ہے۔ اس پر سے نیکر اور ہائیڈل برگ اور قلعے کا منظر بڑا حسین معلوم ہوتا ہے۔ ایک بجے تک آفتاب بڑا خوشگوار تھا۔ نیچے اتر کے ہوپٹ اشٹراسا میں ایک چھوٹے سے ریستوران میں کھانا کھایا اور گھر کی راہ لی۔

چار بجے تک نعیم جرمن قواعد زبان دیکھتا رہا۔ جرمن بولنے میں اسے اچھا خاصہ تکلف ہوتا تھا۔ چار بجے روزا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نعیم نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو روزا کافی کی کشتی لئے ہوئے کھڑی تھی نعیم نے اس کے ہاتھ سے کشتی لے لی۔ چھتوں پر دھوپ سنہری بہار دکھلا رہی تھی۔ نعیم نے موسم کی تعریف کر کے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور روزا کو قلعہ ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ روزا تیار ہو گئی اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔

ہائیڈل برگ کے پرانے قلعے کا رہبر مسافروں کی جمگھٹ میں ہر کمرے اور کمرے کی ہر دلچسپ چیز کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی روزا بھی نعیم کو کچھ سمجھاتی۔ معلوم نہیں اس وقت نعیم کو دنیا کی ہر عورت کیوں بدشکل معلوم ہو رہی تھی۔ چھنگلنی سی جانور، عورت، حسن کی خاطر

مرد اس قدر بھگتا ہے۔ یہ اس کا سینہ، اس کے سینے کا اُبھار، سخت ہو یا نرم، خوشنما ہو یا گرا ہوا اور بدنما۔ اور سب چوپاؤں کے بھی تو تھن ہوتے ہیں۔ بچوں کو دودھ پلانے کے لئے۔

ہروشا کی شوہر اور بیت اس پر بڑی بدمزگی سے طاری ہو رہی تھی اور اس وقت جنسِ لطیف سے اسے بڑی نفرت معلوم ہو رہی تھی۔ شرمیلی اور حسین روزا بھی اس وقت اسے چوپایہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تھنوں والا چوپایہ جو کپڑے پہنے پچھلی ٹانگوں کے بَل کھڑا ہے کہ اتنے میں ایک موٹی بھدی جرمن خاتون یہ دیکھ کر کہ روزا نعیم کی رہبری کر رہی ہے۔ روزا سے مخاطب ہو کے کہنے لگی "کیسی حسین رہبر ہو۔" اس پر روزا ذرا شرمائی اور اس کے گلاب سے گالوں پہ سرخی دوڑ گئی۔ نعیم کو پھر وہ ایسی ہی حسین معلوم ہوئی جیسی پہلی نظر میں گُلِ سُرخ معلوم ہوئی تھی۔ اور عورتوں اور چوپایوں کا فرق اس پر ظاہر ہو گیا۔

تیسرے دن جب وہ ہائیڈل برگ سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ پال لانکس اس سے ملنے آیا۔ ادھیڑ عمر کا دُبلا سا آدمی تھا۔ پتلا چہرہ اور دانت خراب۔ پال لانکس روزا کے حسن و جمال کی تعریف کر کے اسے چھیڑتا رہا اور نعیم سے معافی مانگتا رہا۔ یہاں تک کہ ریل کا وقت آ گیا اور دونوں نے اسے اسٹیشن پہنچا دیا۔ اسٹیشن پر بھی وہ روزا کو کراکسلے کے متعلق ستاتا رہا کہ اسے کراکسلے سے عشق ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد گاڑی اشتت گارٹ پہنچی جو ورتم برگ کا مرکز ہے، اور ان تمام شہروں سے بہت مختلف ہے جو نعیم نے اب تک دیکھے تھے۔ اس کا طرزِ تعمیر جدید ہے اور شہر خود بخود اُگا نہیں، ایک نقشے پر تعمیر ہوا ہے۔

ہوٹل سے نعیم نے ڈوروتھیا پفائی فر کو ٹیلیفون کیا جس کے نام ہروشا نے اسے خط دیا تھا۔ ڈوروتھیا نے پانچ بجے آنے کا وعدہ کیا۔ ابھی وقت بہت تھا۔ اس لئے

دوپہر کا کھانا کھا کے نعیم شہر دیکھنے اور گھومنے نکل گیا۔ موسم پست تھا۔ ابر چھایا ہوا تھا۔ اس نے "نیا قلعہ" دیکھا جس کی عمارت بڑی ہی خوبصورت تھی، اور کمروں کی آرائش قابلِ دید۔ اس نے نپولین کی خوابگاہ دیکھی۔ پھر پُرانا قلعہ اور اس کا تہ خانہ دیکھا۔ یہ تہ خانے جرمن تاریخ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں، جتنی جرمن زندگی میں بیئر۔ یا جرمن سیاسی مظاہر میں سواستکا اور ہنس کی چال۔

ہوٹل واپس آ کے نعیم نے کافی پی۔ اتنے میں ہوٹل کے نوجوان ملازم نے آ کے اطلاع دی "ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔" نعیم کمرۂ ملاقات میں گیا۔ فرلسٹےلائن یفالیفر کی عمر تیس کے قریب تھی۔ جسم گٹھا ہوا 'قدمیانہ' چہرہ گول اور سر کے بال ہلکے بھورے۔ بہت ہی ہنس مکھ عورت تھی، بات چیت لبھانے والی۔ نعیم نے اسے رات کے کھانے کی دعوت دی، اور ریستوران اور غذا کا انتخاب اسی پر چھوڑا۔ ڈوروتھیا نے صوبۂ ورٹم برگ کی خاص چیزیں منگوائیں جن میں ایک سموسا نما نمکین روٹی تھی۔ کھانے کے بعد ڈوروتھیا رخصت ہوئی۔ ایک اثر پرست نقاش سے اس کی دوستی غالباً معاشقہ تھا۔ کھانے کے وقت وہ نعیم سے برابر اس کی تصویروں کا ذکر کرتی رہی، اور کہتی رہی کہ اس کا دوست ایک دن دنیا کے عظیم ترین مصوروں میں شمار کیا جائے گا۔ نعیم نے دل میں خیال کیا کہ عورت جس مرد سے محبت کرتی ہے وہ اسے اکثر بہت بڑا سمجھنے لگتی ہے۔ اس کی نسوانیت اپنے محبوب کی انا کو اس کامل اطاعت کے ساتھ تسلیم کر لیتی ہے کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد نعیم ایک سینما گھر میں جا گھسا۔ جہاں ایک فلم دکھایا جا رہا تھا جو شلر کے ڈرامے "قزاق" سے ماخوذ تھا۔ نازی جرمنی میں شلر کی جو عزت تھی وہ گوئٹے، ٹامس مان اور لیسنگ جیسے انسانیت پرستوں اور نسلی تعصب مٹانے والوں کا تو ذکر ہی کیا تھا۔

نعیم نے سینما ہال میں بیٹھے بیٹھے غور کیا۔ دوکانوں کی کھڑکیوں میں شِلر اور گوئٹے وغیرہ کے بعد سب سے زیادہ افراط کنوٹ ہامزون کے ناولوں کی تھی۔ یہ ناروستانی نانسی اس زمانے میں جرمنی میں اتنا مقبول تھا کہ کبھی اپنے وطن میں بھی وہ اتنا مقبول نہ ہوا۔ اس کی لڑکی الینور جرمن فلموں میں کام کرتی تھی۔ گرہارٹ ہاوپٹ مان نے بھی نازیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ ہاں غیر یہودی ادیبوں میں تو ماس مان نے البتہ جرمنی اور جرمنی کی دی ہوئی عزت کو لات ماردی تھی۔ تو ماس مان کا "جادو کا پہاڑ" کیا عجیب و غریب کتاب تھی۔ اس صدی کا اور کونسا ناول اس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ شاید "ژاں کرسٹوف"۔ ژاں کرسٹوف میں رائن کی سی پُر جبروت اور بے جھجک روانی تھی۔ رائن کی چوڑائی تھی اور وہ مدو جزر اور قصہ کی بندشوں کو بہاتا ہوا رواں ہے۔ "جادو کا پہاڑ" گویا ایک سربفلک برف پوش پہاڑ ہے، جس کی دو چوٹیاں یہودی نافتا اور اطالوی ستمبرینی یا مول بلاں اور ہنگ فرا ڈیا ایورسٹ اور کے ٹو اس بلندی سے باہم سرگرمِ سخن ہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر برف کے تودے گرا رہے ہیں، اس بلندی سے دنیا کو دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں رہنے والے انسان کے ذہن کی کوئی حرکت ایسی نہیں جو وہاں سے نظر نہ آسکتی ہو۔ اس کے بعد وہ پھر فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔ فلم میں ایک سفید بالوں والی لڑکی تھی، جس کو دیکھ دیکھ کے بار بار الیس یاد آتی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے بہت دور کا چکر لگایا۔ قلعہ کا باغ دیکھا۔ ایک ٹیلے سے جس پر آبادی زینہ بہ زینہ چڑھتی چلی گئی ہے، اشتت گارٹ کا منظر دیکھا۔ میوزیم دیکھا۔ وہاں زیادہ تر مجسمے روم کے مشہور مجسموں کی نقل تھے۔ ہوٹل واپس آیا۔ سویا اور پھر اسٹیشن کے پاس ایک بالکل جدید وضع کے کافی گھر گیا۔ ایک خوبصورت چکر دار زینے نے اسے پہلی منزل پر پہنچایا جہاں وہ بینڈ کی موسیقی سنتا اور کافی پیتا رہا۔ جرمن موسیقی بالکل فوجی موسیقی بنتی جا رہی تھی

فوجوں کا کوچ۔ ہنس کی چال۔

ڈوروتھیا لیبا یغر سے حسبِ وعدہ اسٹیشن کے سامنے ملاقات ہوئی۔ ڈوروتھیا شام کے کپڑوں میں تھی، اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک چینی کے ریستوران میں کھانا کھایا۔ اور پھر اوپیرا "دخترِ عسکر" دیکھا۔ اس کے بعد ایک اور جدید وضع کے کافی گھر میں ڈوروتھیا کے ساتھ کافی پی۔ جہاں نعیم کوئی سیاسی موضوع چھیڑتا، ڈوروتھیا چوکنّی ہو کے اِدھر اُدھر دیکھتی۔ اس سے آہستہ بات کرنے کو کہتی "یہاں کسی کا کوئی اعتبار نہیں۔" اور لطف یہ کہ وہ خود بڑی پکی نازی تھی۔

اگلے روز وہ اشتت گارٹ سے رخصت ہو کر اور چند گھنٹے میں اُلم پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے۔ ان دیہاتوں میں سے جو ایک ندی اور ایک کلیسا کی وجہ سے وجود میں آئے۔ مکان بالکل قرونِ وسطیٰ کے نمونے کے ہیں۔ سڑکوں پر قرونِ وسطیٰ کا خواب آور سکون ہے اور ڈینیوب جس نے ابھی اپنے پر نہیں پھیلائے ہیں، آہستہ آہستہ گدلی گدلی بہتی ہے۔ نعیم نے یہاں ڈینیوب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ رائن کی طرح اس دریا سے بھی ہزاروں رومان وابستہ ہیں لیکن زیادہ تر عہدِ حاضر کے، جدید چند صدیوں کے رومان۔ تاریخ کو بنتے اور بگڑتے جتنا اس دریا نے دیکھا ہے شاید ہی کسی اور نے دیکھا ہو۔ مگر ڈینیوب جو بے شمار دارا لخلافوں کی دولت ہے یہاں اپنے منبع سے زیادہ دور نہ ہونے پائی تھی، اور ایک چھوٹی گدلی سی ندی معلوم ہوتی تھی۔

وہ گردن اٹھا کے کلیسا کے بلند مینار کو دیکھ رہا تھا کہ کسی نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اس کی طرف پلٹا تو مخاطب کرنے والے کو اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ مخاطب کرنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ آپیرا کا اداکار تھا اور نعیم کو اپنا ایک جرمن دوست سمجھا تھا —— نعیم نے اپنے دل میں خیال کیا کہ شاید یہودی دوست۔ شاید یہ شخص خود بھی یہودی تھا۔

اس اجنبی کے ساتھ نعیم کلیسا کے مینار پر چڑھا۔ جہاں سے ڈینیوب ایک چھوٹی سی

نائی معلوم ہوتی تھی، اور نیچے اُلم کے پُرانی وضع کے مکانات کھلونے۔ وہاں سے اُتر کے وہ اسی اجنبی کے ساتھ ندی کے کنارے ایک سڑک پر ہولیا۔ عورتوں نے نعیم کی طرف ذرا پریشانی سے، اور بچوں نے تماشا سمجھ کے دیکھا۔ اب تک جرمنی میں اسے کہیں عجیب الخلقت نہیں سمجھا گیا تھا۔ لیکن شاید اس چھوٹے سے قصبے میں ہندوستانیوں اور ایشیائیوں کا گذر بہت کم ہوتا ہے۔

شام کو ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کے دونوں نے بیئر پی۔ اجنبی ساتھی نعیم کے اعتراضات کے جواب میں ہٹلر کی حمایت کر رہا تھا۔ ہم میں سے اکثر جرمن کہتے ہیں کہ ہٹلر نے ہمارے لئے اتنا سب کچھ کیا ہے۔ اس نے ہمیں عزت عطا کی ہے —— اور روٹی۔ ہم میں سے بعض یہودیوں سے متنفر نہیں۔ پھر بھی ہم اڈالف ہٹلر کے ساتھ ہیں۔ اسے کام کرنے کا موقع دو۔ نعیم کو یقین سا ہونے لگا کہ یہ شخص یہودی ہے۔ اس نے دیکھا کہ جب یہ ہٹلر کا نام لیتا تھا تو آس پاس کے لوگ اس کی طرف ذرا مشکوک نظروں سے دیکھتے اور پھر باتوں میں محو ہو جاتے۔

دوسرے دن گاڑی کے وقت تک نعیم جرمن گرامر دیکھتا رہا اور الفاظ یاد کرتا رہا۔ اُلم کے اجنبی یہودی سے سیاسی بحث کرتے وقت اس نے محسوس کیا تھا کہ سیاسیات کے متعلق جرمن الفاظ اسے کس قدر کم یاد ہیں۔

گاڑی دو تین گھنٹے میں میونک پہنچی۔ یہ اورینٹ ایکسپریس تھی۔ پیرس سے قسطنطنیہ کو جانے والی۔ نعیم کو افسوس ہوا کہ اس رومانی گاڑی پر جس کا ذکر وہ اس قدر سن چکا تھا اور جس کے متعلق اس قدر پڑھ چکا تھا۔ وہ آگے سفر نہیں کرے گا۔ آگے کیا کیا جادو بھرے شہر ہیں۔ وی آنا، بوداپسٹ، بلغراد، صوفیہ، ادرنہ اور استانبول۔

اسٹیشن بہت بڑا تھا اور بڑے بڑے حرفوں میں میونک کا جرمن نام میونشن لکھا ہوا

تھا۔ ایک جرمن لڑکی ہلڈا گارٹ شراڈر جو بہت موٹی اور بھدی اور قدآور تھی اور جس کے متعلق کرا کسلے کہا کرتا تھا کہ اس کو دیکھتے ہی حرارت عزیزی سرد ہو جاتی ہے، جو پیرس میں کچھ دن پڑھ چکی تھی، نعیم کو لینے اسٹیشن آئی تھی۔ اس نے ایک پاں سیاں میں نعیم کے ٹھہرنے کا انتظام کرا دیا تھا۔ نعیم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ گو ٹیٹے اشترا سا میں پاں سیاں تک پہنچا کے ہلڈا گارٹ شام کو ملنے اور اپنی بہن فریڈا گارٹ کو ملانے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اور نعیم نے میونک کی سیر کرنی شروع کی۔ بویریا کے اس پایۂ تخت میں ایک دلکش قدامت ہے، ساتھ ہی وہ رونق اور چہل پہل بھی ہے جو بڑے شہروں میں ہوتی ہے۔ فراون کرشے (کلیسائے خواتین) کے قریب دو لڑکیاں ہنستی ہوئی گذر گئیں اور نعیم کی طرف انہوں نے ہمت افزائی کے لئے مڑ کر دیکھا۔ نعیم نے کلیسائے خواتین اور دوسرے کنیساؤں کو دیکھتے ہوئے ایسار کے پل کا رخ کیا۔ ایسار کے پلوں میں بھی قدامت کا حسن ہے۔ وہ میونشن کے سب سے بڑے باغ انگلشر گارتن گیا۔ جہاں خزاں کے آثار تکلیف دہ حد تک نمایاں تھے۔ واپس آ کے اس نے ایک پرانے بیئر ہاؤس میں کافی پی۔ ہٹلر کا مشہور و معروف بیئر ہاؤس اور اس کا تہ خانہ بھی دیکھا۔ وہ مقام بھی دیکھا جہاں ہر نازی یا ٹوپی اتارتا ہے یا فوجی سلام کرتا ہے۔ لیکن یہودیوں کو ٹوپی اتارنے یا سلام کرنے کی بھی شاید اجازت نہیں۔

شام کو ہلڈا گارٹ اپنی بڑی بہن فریڈا گارٹ کے ساتھ آئی۔ فریڈا اپنی بہن سے بالکل مختلف تھی۔ چھریرا سا بدن، ہلڈا سے زیادہ خاموش، لیکن اس کی آنکھیں مردوں کو اور جنسی سرور کو ڈھونڈتی ہوئیں۔ ہلڈا کے مقابلے میں وہ بہت متمدن معلوم ہوتی تھی اور اس کے کپڑے بھی اس کی خوش مذاقی کے گواہ تھے۔ ان دونوں لڑکیوں نے نعیم کو ہوف براؤ ہاؤز کی سیر کرائی۔ یہ وہ مشہور شراب خانہ ہے۔ جہاں ایک حصے میں مزدور اور

دوسرے طبقے میں مقابلتاً متمول لوگ۔ لیکن مزدور بڑے ہی لطف اور بے تکلفی اور مہمان نوازی کے ساتھ میونخ کی تازہ کشید کی ہوئی بیئر پیتے ہیں۔

کئی جرمن مزدوروں نے (ان میں متوسط طبقے کے لوگ بھی شامل ہوں گے) نعیم کو خوش آمدید کہا۔ بڑے اخلاق اور بڑی بے تکلفی سے باتیں کیں۔ بڑے بڑے قدموں جیسے جاموں میں یہ لوگ بیئر پیتے جاتے۔ نعیم کو حیرت تھی کہ اتنی بہت سی بیئر ان کے پیٹوں میں سماتی کیسے ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد نعیم کو لے کے یہ دونوں بہنیں باہر نکلیں اور ایک شائستہ سے کافی گھر میں پہنچیں جہاں حسین نوجوان خادمائیں بوریا کے دیہاتی لباسوں میں لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں دے رہی تھیں۔ بینڈ بھی تھا۔ بیچ میں ناچنے کے لئے جگہ تھی۔ یہاں معمولی کپڑوں میں لوگ ناچ رہے تھے۔ نعیم ایک آدھ بار ہلڈا کے ساتھ اور دو تین بار فریڈا کے ساتھ ناچا۔ وہی انّا کا والٹس! اس نے نعیم کے ساتھ اس خوبی سے اور اپنے جسم کی جنبشوں کے ساتھ اس لطافت سے ناچا کہ نعیم محسوس کرنے لگا کہ ہوف براۓ ہاؤز کی بیئر کا نشہ اب کہیں جا کے محسوس ہو رہا ہے۔ اور سالیں بالکل دھندلے پس منظر میں چلی گئی۔

ایک عجیب و غریب شخص جو غالباً بہت زیادہ پی گیا تھا، ان کی میز کے قریب آیا۔ اس نے نعیم سے فرانسیسی میں کہا "یہ تمہارے پاس دو حسین جو ریاں ہیں۔ ان میں سے ایک مجھے دو میں ناچنا چاہتا ہوں۔"

فریڈا نے اسے جرمن میں تشریف لے جانے کو کہا اور وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نعیم سے فریڈا نے کہا کہ یہ شخص یہیں کا رہنے والا ہے اور کسی طرح فرانسیسی نہیں ہے لیکن آپ کو ہم سے فرانسیسی میں باتیں کرتے دیکھ کے اس نے بھی قابلیت

بگھارنی چاہئیے۔

ہلڈا نے دوسرے دن میوزیم ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا لیکن معلوم نہیں دونوں بہنوں نے آپس میں کیا طے کیا تھا کہ سامنے ہلڈا کے فریڈا آئی۔ دن کی روشنی میں اس کا حسن سی سالہ نعیم کو ذرا بھی اچھا نہیں معلوم ہوا۔ یہ رات کی سیر کا نتیجہ ہوگا کہ وہ اس وقت اتنی بھلی اور گرم معلوم ہو رہی تھی۔ اس روز دن بھر بارش ہوتی رہی۔ سارا دن میوزیم میں گذرا لیکن وہاں بھی ذرا ذرا سردی تھی۔ شام کو باہر نکل کے چائے پی۔ اب بھی بارش کا وہی حال تھا۔ کچھ وقت ایک بیئر ہاؤس میں گذار کے اس نے رات کا کھانا فریڈا کے ساتھ اسٹیشن کے ریسٹورنٹ میں کھایا۔ اب بھی بیئر کا نشہ سر چڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر گول والے کافی گھر میں گذار کے فریڈا کے اصرار پر دونوں وہاں سے بھی اٹھ گئے۔ فریڈا دن بھر میوزیم کی سیر کرانے کی وجہ سے بہت تھک گئی تھی۔ گھر جانا چاہتی تھی۔ نعیم نے گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ چلا۔ ٹرام سے اتر کے جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچی تو راستے کے لیمپ کی دھندلی روشنی میں اور برستے ہوئے پانی میں اس کا حسنِ سی سالہ اور اس کا چھریرا بدن جو برساتی میں لپٹا ہوا تھا، جسے وہ ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھی، بڑا خوبصورت معلوم ہوا۔ نعیم نے اس کا منہ اپنی طرف پھیر کے، اور آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا جن پر بارش کے قطروں کا مزہ بے نمک سا معلوم ہوا۔ فریڈا نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا "یہ شرارت مت کرو۔ سڑک کی روشنی میں نہیں۔"

چند قدم پیچھے ہٹ کے ایک اندھیری سی گلی میں نعیم نے فریڈا گارٹ کو پھر لپٹایا۔ پانی اسی طرح برس رہا تھا مسلسل اور آہستہ آہستہ۔ اس نے برساتی کے اندر فریڈا گارٹ کی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالا، انہیں سہلایا۔ پھر بوسے لئے اور اسے گھسیٹ کے اندر اپنی پاں سایں کو

چلنے کو کہا۔ فریڈا نے کہا: "بہت دیر ہو گئی ہے۔" ایک دو اور بوسوں کے بعد اس نے کہا "یہ اب جاؤ۔ نہیں تو پانی میں زکام ہو جائے گا۔"

نعیم اسے اس کے دروازے تک پہنچا کے بادلِ ناخواستہ رخصت ہوا۔ فریڈا کے ہونٹوں پر پانی کے قطروں کا بے نمک ذائقہ وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔

راستے بھر اس کا دل اسے ملامت کرتا رہا کہ ایلس سے اس نے بے وفائی کی۔

دوسرے دن گیارہ بجے وہ ٹامس کُک کے دفتر گیا۔ ایلیس کا ایک خط اور تھا۔ اس میں بھی محبت کی باتیں تھیں لیکن سستاتی اور وہاں کے دوستوں کا ذکر بہت زیادہ تھا اور نعیم نے محسوس کیا کہ "گریز" کی حالت ہمیشہ گریز کی حالت نہیں رہتی۔ وہی زندگی بن جاتی ہے۔ جب مونک کے جادو کا خود اس پر اتنا اثر ہوا تھا تو ایلیس پر جو اپنے وطن اور اپنے گھر کے ماحول میں پھر واپس گئی ہے، اس "گریز" کا، اس تبدیلی کا اور زیادہ اثر ہوا ہو گا۔

بارہ بجے فریڈا نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نہیں آئی۔ ہلڈا آ کے اس کی لکھی ہوئی چھٹی دے گئی "مجھے سخت زکام ہے" اور کسی قدر حرارت ہے، میں تمہارے ساتھ ٹیگرن زی نہیں چل سکوں گی۔ مگر تم خود جا کے ضرور دیکھ آؤ۔" نعیم نے فریڈا کے بجائے اس کی بہن اور اپنی پرانی ملاقاتی ہلڈا کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اس احساس کے ساتھ کہ ہلڈا کے جسم کی بوٹی بوٹی قطب شمالی کی یاد دلاتی ہے۔ مگر ہلڈا نے شاید اپنی بہن کے خیال سے خود ہی انکار کر دیا۔

ایک بجے ایک بڑی خوبصورت بس میں جس کے گدّے آرام دہ تھے اور جس کا شوفر انتہائی شائستہ، نعیم نے ٹیگرن زی کا سفر شروع کیا۔ سامنے کی نشست پر ایک بیاہا ہوا جوڑا تھا۔ عورت کی عمر پینتیس سال کی ہو گی اور وہ ہلکا پھُلکا ریشمی لباس اور اس پہ ایک فرکوٹ پہنے تھی۔ مرد کی عمر بیس پچیس سال ہو گی۔ مگر وہ بہت وجیہہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ

گوٹن گن یونیورسٹی میں ریاضیات کا مددگار پروفیسر تھا۔ وہ بہت دیر تک نعیم سے ہندوستان اور حیدرآباد اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ اس کی بیوی اس گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے، اس نے گفتگو کا یہ سلسلہ دفعتاً ختم کر دیا اور اپنی بیوی کی دلجوئی کرنے لگا۔

اب نعیم نے اِدھر اُدھر دوسرے مسافروں کی طرف دیکھا۔ ان میں ایک عورت تھی۔ نہایت اعلیٰ درجے کا سفید لباس پہنے۔ گلے میں سفید موتیوں کی ایک لڑی اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا اُون جیسے بالوں والا سفید کتا تھا۔ میونک سے روزن ہائیم تک ہٹلر کی بنوائی ہوئی خوبصورت اور چوڑی سڑک پر نعیم اس خاتون کی طرف دیکھتا رہا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح اس سے بات کرے۔ بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ فرانسیسی جانتی تھی نہ انگریزی۔ نعیم کی شکستہ جرمن پر وہ مسکرائی اور شائستگی اور تکلف سے اس کی باتوں کا جواب دے کے پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ بس سے جو مناظر نظر آ رہے تھے، وہ تھے بھی دلکش۔ میونک سے نکلنے کے بعد کچھ دور تک تو چوڑا میدان، پھر جنگل کے ٹکڑے، صنوبر، پہاڑ، بویریا کے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی خوبصورت جھیل تھی جس میں پہاڑ کی چوٹیوں کا عکس بڑا دلفریب معلوم ہوتا تھا۔ قریب ہی ٹیگرن زی کا گاؤں تھا جس کے مکانوں کا رنگ قرونِ وسطیٰ کی رنگسازی اور جس کے مکانوں کی وضع قرونِ وسطیٰ کے دیہی فنِ تعمیر کی یادگار تھے۔ قریب ہی جدید ترین نمونے کا کافی گھر کافی ام زی تھا جس کی ایک پوری دیوار گویا شیشے کی تھی۔ اس سے جھیل اور پہاڑوں کا منظر بڑا ہی خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ ایک میز پر تین لڑکیاں ہنس بول رہی تھیں اور ان کے سنہرے بال سر کی جنبشوں سے اِدھر اُدھر گر کے بنتے اور سنورتے تھے۔ نعیم بار بار ان کی طرف بھی دیکھتا رہا۔

گھنٹے بھر بعد وہ کافی گھر سے باہر نکلا اور جھیل قدمی کرنے چلا۔ شام کے وقت آفتاب کا اثر بڑا ہلکا سا تھا اور جھیل میں آس پاس کے پہاڑوں کی تصویروں کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ جھیل کے کنارے وہی سفید پوش عورت اپنے سفید کتے کے ساتھ اکیلی ٹہلتی ہوئی ملی اور مسکرا کے اس نے پھر اپنی راہ لی۔ اس منظر کا اثر جادو کا سا تھا۔ کچھ دیہاتی اس اصلی ہندوستانی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شام کو وہی بس اسے میونک واپس لائی۔ وہ اسٹیشن کے قریب اُترا۔ وہاں کھانا کھانے ایک بڑی سی میز پر جا بیٹھا۔

اس میز پر پہلے سے ایک اسی سال کی معمر عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا سنجیدہ صورت جرمن بیٹھا تھا۔ نعیم کے آتے ہی ان دونوں سے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی سال کی بڑھیا کو ہندوستان کے متعلق سب کچھ معلوم تھا۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات۔ ہندو مسلم فساد۔ تحریک آزادی۔ گاندھی۔ ٹیگور۔ جواہر لال نہرو۔ نعیم حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا کہ بڑھیا نے ایک بے تکا سا سوال کیا "کیا یہودی کانگریس کو انگریزوں کے خلاف لڑانے کے لئے روپیہ دیتے ہیں؟"

اس پر سنجیدہ صورت ادھیڑ عمر کے جرمن نے جو غالباً یہودی تھا کہا کہ "یہ پروپیگنڈا محض جرمنی کے لئے ہے"۔ اس کے بعد وہ نعیم سے بہت دیر تک آہستہ آہستہ انگلستان اور فرانس میں یہودیوں کی حالت کے متعلق پوچھتا رہا۔ بار بار وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھی لیتا کہ کوئی اور تو ان کی گفتگو نہیں سُن رہا ہے۔ پھر وہ نعیم سے پوچھنے لگا کہ کیا ہندوستان میں جرمنی کے باہر یہودیوں کے لئے کوئی موقع ہے؟ پھر اس بڑھیا میں اور ادھیڑ عمر کے جرمن یہودی میں کچھ بحث ہوئی اور نعیم نے بڑھیا کو زور سے یہ کہتے سُنا "یہ نازیوں میں انتہائی ہوں"۔ آس پاس کی میزوں سے دو چار جرمنوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر شاید اس بڑھیا کے الفاظ کو

ناقابلِ التفات سمجھ کر کھانے اور بیئر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نعیم نے اپنے دل میں کہا کاش مجھے بھی اتنا کہہ سکنے کی جرأت ہوتی۔

دوسرے دن صبح کو واپس ہوا۔ بارہ بجے اشتت گارٹ پہنچا۔ چار بجے اسے ڈوروتھیا لیفالیفر نے چائے پر بلایا تھا۔ اس کے یہاں پہنچا۔ اس کے کمرے میں ایک بستر تھا۔ آرٹ پر کچھ کتابیں، کچھ کرسیاں، ایک میز اور میز پر چائے کی تین پیالیاں۔ پہلے تو اس کا ارادہ تھا کہ فریڈا کی طرح یہاں ڈوروتھیا سے بھی کچھ چھیڑ چھاڑ کرے۔ معلوم ہوتا تھا، ایلس کے جانے کے بعد تفریح کے لئے بھی اس کی قسمت میں تیس سال سے کم کی کوئی عورت نہیں لکھی تھی۔ خیر یہی سہی۔ لیکن ان تین پیالیوں کو دیکھ کے یہ امید بھی جاتی رہی۔ تیسری پیالی ڈوروتھیا کے مصوّر دوست کے لئے تھی۔ ایک دُبلا پتلا، پستہ قد سا کم رُو نوجوان۔ عورتوں کو اپنی جسمانی ضد سے کیوں محبت ہو جاتی ہے۔ مصوّر کی تعریفیں ہونے لگیں۔ ڈوروتھیا اور جرمن مصوّر دونوں کو تعجب ہوا کہ انگریزی یونیورسٹیوں میں نوجوان طالب علم جنرل فرانکو کے نہیں بلکہ ہسپانوی جمہوریت کی فتح کے خواہاں تھے۔ ڈوروتھیا نے نعیم سے اس کا سیاسی مسلک پوچھا۔ نعیم نے اپنے آپ کو "اشتراکی" کہتے ہوئے سُنا۔ ڈوروتھیا نے کہا "راست اشتراکی یا چپ اشتراکی۔ قومی اشتراکیت تو ہم سب جرمنوں کا بھی مسلک ہے۔" نعیم کو ہنسی آئی۔ اسے برد شا یاد آگیا۔ ہیگل کا راست اور ہیگل کا چپ۔ اس نے پھر اپنے آپ کو "اشتمالی" کہتے ہوئے سُنا۔ اس کے کانوں کو اپنے الفاظ پر یقین نہیں آیا۔ کیا دانستہ طور پر کراکسلے اور برد شا اور گلِ سُرخ اور شرابیں پینے والے اور رقص کرنے والے ہندوستانی اشتمالی نوجوانوں کا جادو اس پہ چل چکا تھا۔ اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ اشتمالی آئی۔ سی۔ ایس۔ چاندی کے چوکھٹے میں کارل مارکس کی تصویر۔ کیا کہنے۔

اس وقت ڈوروتھیا جلدی جلدی اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر رہی تھی۔ اب اگر اس کا اجنبی مہمان کہیں اشتمالیت کی خوبیوں کا ذکر شروع کرے تو کہیں کوئی سُن لے یہ جرمنی میں کسی کا اعتبار نہیں۔ بھائی کا نہ بہن کا۔ اور یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔" ڈوروتھیا نے بھی اپنے آپ کو کہتے سُنا۔

دوسرے دن ابر چھایا ہوا تھا، اور ہوا میں سردی تھی اور ریل اشٹنٹ گارٹ سے کولون جا رہی تھی۔ رائن پر بارش کی وجہ سے دُھند چھائی ہوئی تھی۔ سفر کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس سفر سے ایلس والا زخم بھی مندمل سا ہو گیا تھا۔ باہر بارش کو دیکھ کے نعیم کو فریڈا کے ہونٹوں پر بارش کے بے نمک قطرے یاد آئے۔ معلوم نہیں اب اس کا زکام کیسا ہے! جشن سی سالہ کولون سے بروسلز، بروسلز سے اوسٹنڈ۔ پھر دوبارہ انگلستان۔ تعلیمی میقات کو شروع ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ کام کا وقت ہے۔ کام بھی تو ایک گریز ہے۔ سفر ختم ہو رہا ہے۔ ایک گریز کے بعد دوسرا گریز۔ گریز سے گریز۔

تیسرا حصّہ

عزیز احمد

گیارھواں باب

نوروز

آکسفرڈ واپس آنے کے بعد تقریباً مہینہ بھر تک ایلس نعیم کے دماغ پر سوار رہی۔ رات رات پھر اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ رات رات بھر وہ اس کے بالوں، اس کے تبسم، اس کے سرخ و سفید جسم کی عریانی یاد کرتا رہتا۔ رات کے تین بجے اٹھ کے وہ ایلس کو انتہائی والہانہ خطوط لکھتا جو اسے صبح کو ضرورت سے زیادہ شاعرانہ معلوم ہوتے۔ مگر جو ہونا تھا اس کا ہو گذرنا ضروری تھا۔ ایلس تنہائی میں اپنی دوستیوں اور دلچسپیوں کا حال بہت کم لکھتی لیکن بین السطور نعیم سب کچھ پڑھ لیتا۔ جہاں وہ لکھتی کہ "میں تمہیں ہمیشہ سے زیادہ چاہتی ہوں" یا "بہت بہت پیار اور بوسے" اس سطر کے نیچے نعیم کسی سیاہ بالوں والے (کیونکہ ایلس کو سیاہ بال پسند تھے) دراز قد ظریف اور ذہین امریکی نوجوان کی تصویر دیکھ لیتا۔ ایلس کا ہر نیا خط پہلے کے مقابلے میں ذرا سرد ہوتا اور محبت کے وہی الفاظ پرانے اور بوسیدہ معلوم ہوتے۔ یہ محبت کے زوال کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

کیونکہ جب محبت تازہ اور شگفتہ ہوتی ہے، جب وہ پھلتی پھولتی ہے تو اپنے اظہار کے لئے ہمیشہ نئے الفاظ ڈھونڈتی ہے لیکن جب وہ سرد ہونے لگتی ہے تو وہی محبت کے الفاظ اس کا کفن بننے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ پہلے فریق مخاطب اور پھر فریق متکلم محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب یہ جھوٹ ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔

اب شک کرنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی کہ سنسناٹی نے پیرس کا طلسم باطل کر دیا تھا۔ ایلیس اوسط عورت ہی تو تھی۔ اوسط عورتوں کو اوسط مرد بہت جلد مل جاتے ہیں بہت جلد وہ پھر اسی امریکی زندگی کا لطف محسوس کرنے لگی جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ بہت جلد وہ سیاہ بالوں والے دراز قد امریکی نوجوانوں کے ساتھ ناچنے لگی اور پھر ہنسی مذاق اور بوس وکنار کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسٹر کلاڈیل جو اس کی شام کی تفریحوں سے خوش تھے ۔۔۔ کیونکہ ان تفریحوں کا راستہ کسی قابلِ قبول امریکی نوجوان سے شادی پر ختم ہوتا، ایلیس کو دن کو بھی مصروف رکھنا چاہتے تھے کہ کہیں دن کو جاگتے ہوئے خوابوں میں اس کا دماغ پیرس اور نعیم کی طرف زیادہ نہ بھٹکنے پائے۔ انھوں نے اپنی فرم میں اسے کام پر لگا دیا اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ خود بھی کام میں دلچسپی لینے لگی۔

فلسفہ و بین السطور سے نعیم پر یہ سب کچھ ظاہر ہوتا گیا۔

اس تاریک مہینے میں نعیم کا سہارا دو چیزیں تھیں۔ ایک تو کراکسلے کی دوستی۔ کراکسلے جو اس زمانے میں بیلیل میں ماڈرن گریٹس کی تیاری کر رہا تھا نعیم کا بڑا رفیق تھا۔ وہ اکثر اس کے ساتھ ہفتے کے ختم پر ایک آدھ دن گذارنے لندن جاتا۔ کئی مرتبہ کراکسلے نے ہرٹ فورڈشائر میں ہفتے کے ختم کا حصہ گذارنے اسے اپنے گھر بھی بلایا۔ اپنے بیٹے کے اصرار پر مسز کراکسلے نے بھی اس "رنگ والے دیسی" سے ہمیشہ بڑا اخلاق برتا۔ اور اگرچہ وہ مارگریٹ کو ہمیشہ جتاتی

رہیں کہ اس خطرناک ہندوستانی کے پنجے میں نہ پھنسنا' پھر بھی اپنے بچوں کے خلوص کی وجہ سے وہ مجبور سی ہو جاتیں۔ دو ایک مرتبہ ملنے کے بعد بہر حال ان کو اطمینان ہو گیا کہ یہ لڑکا ان ویسیوں سے بہت مختلف ہے جو ان کے شوہر کی ججی کے زمانے میں ہندوستان میں ان کے نوکر تھے۔ رفتہ رفتہ نعیم سے ان کا سلوک "پکا میم صاحب" کا سلوک نہ رہا بلکہ انہیں بھی اپنے بیٹے کے اس دوست سے ایک طرح کا اُنس پیدا ہو گیا۔ جب نعیم کراکسلے کے یہاں مہمان ہوتا تو مارگریٹ زیادہ تر وقت ان دونوں کے ساتھ گذارتی۔ اب جو ماں نے اسے ہر ہر قدم پر روکنا ٹوکنا چھوڑ دیا تھا تو اس نے بھی اپنے بھائی کے اس دوست کو اپنا بھائی سمجھنا شروع کر دیا تھا چونکہ نعیم کے کوئی بھائی بہن نہ تھے اس لئے یہ خواہرانہ اُنس اس کے لئے ایک نئی چیز تھی اور وہ بھی مارگریٹ کے لئے ایک طرح کا برادرانہ خلوص اور شفقت محسوس کرنے لگا۔ بہت جلد وہ مارگریٹ کا رازدار بن گیا۔ وہ اسے ان نوجوانوں کے قصے سناتی جنہوں نے شام کے دھندلکے میں اسے چوما تھا یا جنہوں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ نعیم سے ان کے متعلق اس کی رائے پوچھتی اور جب وہ اس قسم کی باتیں کرتی تو نعیم کی طرف اس قدر اعتماد اور جوشِ اعتبار سے دیکھتی کہ نعیم اس نوخیز لڑکی کے سوائی حسن اور اس کے شباب سے اپنے جذبات کو قطعاً بے تعلق کر دینا چاہتا کیونکہ اندرونی طور پر نعیم مارگریٹ کے شباب کا اثر محسوس کرتا۔ اب مارگریٹ لڑکی سے زیادہ عورت تھی۔ اس کے شانوں پر گوشت بھر رہا تھا۔ اس کے لب گداز ہوتے جا رہے تھے۔

جب کبھی کراکسلے اور مارگریٹ میں بڑے مزے کی لڑائی ہوتی تو نعیم کبھی بھائی کی طرفداری کرتا کبھی بہن کی۔ اور جب کراکسلے اپنی بہن کو زیادہ ستاتا تو نعیم کھلم کھلا اپنے دوست کی مخالفت کرتا۔ کراکسلے کے سوا اس زمانے میں نعیم کا ایک اور سہارا تھا۔ اس نے میرن سن سے ایک خط میری پاول کو لکھا تھا جس میں حرتن کے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر کیا تھا میری پاول کا جواب

اسے انگلستان پہنچ کے ملا۔ اس خط کے ساتھ میری پاول کی لکھی ہوئی چھوٹی سی کتاب تھی "فرانس کے اشتراکی ادیب"۔ یہ جلد میری پاول نے اسے تحفتاً بھیجی تھی۔

اس کتاب کے متعلق اپنی تفصیلی رائے نعیم نے میری پاول کو لکھ بھیجی۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو دوستی نعیم ذاتی میل جول سے پیدا نہ کر سکا تھا، خط و کتابت سے بڑھنے لگی۔ یہ خط زیادہ تر غیر ذاتی اور غیر شخصی ہوتے۔ لیکن ان سے ایک ذہنی قرب کا منظر پیدا ہونے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خود نعیم کا رجحان اشتراکیت کی طرف دن بدن بڑھ رہا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی جامعات میں اشتراکیت ایک طرح کا فیشن بن گئی تھی اور بہت طرح ان لوگوں میں پھر سے سوائے اس کے نعیم کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی اشتراکیت پر کچھ پڑھے۔ اس نے جان اسٹریچی کی تمام کتابیں پڑھیں۔ لیفٹ بک کلب کا رکن ہو گیا شروع سے آخر تک کارل مارکس کا "سرمایہ" پڑھ ڈالا۔ کیسلے کے ساتھ وہ پابندی سے انٹرنیشنل پریس کا رسالہ اور لیبر پڑھا کرتا۔ اسی زمانے میں وہ پہلی بار پامر دت اور جان اسٹریچی سے ملا۔ پھر رفتہ رفتہ انگلستان کے نوجوان ادیبوں سے اس کی دوستی ہونے لگی۔ ان تمام حلقوں میں میری پاول کا نام اچھا خاصا مشہور تھا۔

میری پاول نے ایک ہفتہ اسپین میں محاذِ جنگ پر گزارا اور اپنے سارے تجربات ایک طویل طویل خط میں نعیم کو لکھ بھیجے۔ یہ خط کئی صفحوں کا تھا۔ راستے کی مشکلات، ہوائی جہازوں کی بمباری، بین الاقوامی بریگیڈ کی جانفشانی، ایک عزیز دوست کی ہلاکت کا سماں، اور فاشسٹوں پر لعنت۔ پھر ایک طرح کا نسوانی اطمینان کہ آخر میں حق کی فتح ہو گی۔ ان سب موضوعوں نے میری پاول کے اس خط کو ایک طرح کا ذاتی رنگ دے دیا تھا۔ ان تمام واقعات کے بیان کرنے میں میری پاول گویا اپنی شخصیت کو عیاں کر رہی تھی۔ اس خط کے

ذریعے میری پاول نے نعیم کو اپنے باطنی اعترافات" کے لئے اسی طرح انتخاب کیا تھا— جس طرح مارگرٹ نے اسے ان کم سن نوجوانوں کے متعلق اعترافات کے لئے چُنا تھا جو اسے پہلے معلوم ہوتے اور شام کے دُھندلکے میں اسے چونکتے۔

ان دونوں اثرات نے ایلس کے خطوط میں محبت کی گردان کے تصنع کو زیادہ نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ روحانی اور ذہنی حد پر نعیم اپنے آپ کو مارگرٹ اور میری پاول سے قریب محسوس کرنے لگا تھا اور ایلس کی محبت پر اوقیانوس کی موجیں حاوی ہونے لگی تھیں۔

(۴)

اور اس کے بعد اسے ایلس کا جو خط ملا اس میں محبت کا اقرار بھی نہ تھا۔ بجائے اس کے کہ ایلس صاف صاف لکھ کے نسبت توڑ دیتی۔ اس نے اپنے اس خط میں اجنبیت کی شان پیدا کر کے ہر طرح کا تعلق ختم کر دیا تھا۔ وہ خط جس میں کوئی خاص بات نہ تھی، اس میں انکار کی وہ شان تھی جو شدید ترین لفظی انکار میں نہ ہوتی۔ خط یہ تھا:

یکم فروری ۱۹۳۷ء

پیارے نعیم!

نئے سال میں سب سے پہلا کام اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ میں تمہیں خط لکھتی۔

نیا دور، نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔

مجھے اب اپنے والد کے دفتری کام میں اچھی خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ صرف یہ کہ ان دنوں صبح سویرے اُٹھنا مجھے پسند نہیں۔ شام کو پانچ بجے واپس ہوتی ہوں۔ مگر دن بھر کے کام کی وجہ سے شام بڑی اچھی گذرتی ہے، اور جب باہر جاتی ہوں

لو کھانے بانا جتنے بیں مجھے وہ لطف آتا ہے جو مزدور پیشہ لڑکیوں کو آتا ہے۔ اگر میں دن بھر گھر میں بیٹھی فیشن کے رسالے یا فرانسیسی ناول پڑھتی رہوں تو شام کا کھانا اور ناچ بھی اچھا نہ لگے۔ رات کو عموماً ایک دو بجے سے پہلے سونے کا موقعہ نہیں ملتا اور صبح سویرے اُٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ دیکھو کتنی کاہل ہوگئی ہوں۔

لیکن اگر میرے والد نے یہ تصفیہ کیا کہ میری بنس قیمت خدمات فرم کے لئے اشد ضروری نہیں ہیں تو چار پانچ مہینے کے بعد اپریل یا مئی میں میرا ارادہ اپنی والدہ اور ایک عزیز دوست کے ساتھ میکسیکو کی سیر کا ہے۔ میکسیکو آج کل امریکی سیاحوں میں بہت مقبول ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ بڑا ہی دلفریب مقام ہے۔ یورپ سے بھی زیادہ۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتی۔ مگر آج کل یورپ کی سیاسی فضا ایسی مکدر ہے کہ ادھر کا رُخ کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ آئندہ بہار یا گرما میں تم بھول اپنی لول ناک میں میکسیکو میں آوارہ گردی کرنے جاؤں۔ میں تمہیں میکسیکو کے ہر خوبصورت مقام سے ایک پوسٹ کارڈ بھیجوں گی۔

میں نے یہ خط محض سالِ نو کی مبارکباد کے لئے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس لئے شاید یہی مناسب ہے کہ میں خط کو ختم کر دوں۔ تمہارے خطوط میں بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں گی۔ جیسا تمہیں فرصت ہو مجھے خط لکھا کرنا اور یہ بھی لکھنا کہ تم کیا کر رہے ہو اور ہندوستان واپسی کے بعد بھی خط و کتابت جاری رکھنا۔ فقط

تمہاری ایلیس"

یہ خط پڑھ کے نعیم نے پہلا احساس جو اپنے ذہن پر حاوی پایا، حیرت کا تھا۔ یہ خط اس لڑکی کا تھا جس سے اس کی نسبت ہو چکی تھی اور جو محض اس لئے امریکہ گئی تھی کہ وہ

اپنے والدین پر یہ ثابت کرے کہ چھ ماہ ہوں یا چھ سال وہ نعیم کے ساتھ اپنی محبت پر قائم رہے گی۔
یہ خط اس لڑکی کا تھا جو ڈیڑھ دو مہینے دن رات پیرس میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے اپنا جسم سب سے پہلے اسی کے حوالے کیا تھا۔ اپنی دوشیزگی اسے دی تھی۔ وہ ستمبر میں گئی تھی، اب جنوری کا آغاز تھا۔ تین مہینوں میں وہ بالکل دوسری لڑکی بن گئی۔ جس طرح سانپ اپنی کینچلی بدلتا ہے۔ اب اس قدر آسانی سے اسی لڑکی نے اپنے عاشق اور اپنے نگینہ کے مقام سے گرا کر اسے اپنے معمولی سے دوست کی جگہ دے دی تھی۔ ایک ہی ہفتہ پہلے جو خط آیا تھا، اس میں عشق، عشق، عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن نعیم اس وقت بھی جانتا تھا کہ اس کے خطوط میں اب یہ لفظ بے معنی ہو گیا تھا۔ کیا اب اپنے اس جھوٹ سے ایلس خود بھی تنگ آ گئی تھی؟ یا اس کا دوسرا "عزیز دوست" جس کے ساتھ وہ میکسیکو کا سفر کرنے والی تھی، اب اس کا نیا نگینہ بن گیا تھا۔ اور نعیم کے دل میں یہ احمقانہ سوال پیدا ہوا: کس قسم کی انگوٹھی اس نئے امریکی دوست نے اسے دی ہو گی؟ ہیرے کی؟ یاقوت کی؟ نیلم کی؟

اس خط کا نعیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے جتنا تجزیہ کیا، اسے محسوس ہوا کہ محبت کی جگہ محض محبت کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ حال کی جگہ ماضی۔ ایلس کے تصور کی جگہ ایلس کی یاد جو پیرس میں سچی معلوم ہوتی تھی۔ ایلس کے پیلے بالوں اور سخت پستانوں اور شفاف جلد کی یاد۔ اس نے سچ لکھا تھا۔ نوروز سے نئی تاریخ، نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء ختم ہو چکا تھا۔ اب دیکھیے سنہ ۱۹۳۳ء کیا رنگ دکھاتا ہے۔

یہ سال بھی عجیب سال تھا۔ یہ سنہ ۱۹۳۳ عیسوی۔ اس کی مختصر زندگی میں اہم ترین سال

۱۹۳۵ء میں وہ آئی سی ایس کے انتخاب میں لیا گیا تھا اور وہ یورپ آیا تھا لیکن اس دوسرے سال یعنی ۱۹۳۶ء میں یورپ اس کی زندگی پر حاوی ہوا۔ بلقیس نقش غلطی کی طرح اس کے دل سے محو ہونے لگی۔ ایلیس سے دوستی ہوئی۔ محبت ہوئی۔ جُدائی ہوئی اور بالآخر وہ قصہ ختم بھی ہو گیا۔ اسے ہروشا اور کرا کسلے جیسے دوست ملے۔ کیا عجیب بات تھی کہ محبت اور دوستی دونوں کے لئے وہ ہندوستان میں ترسا کیا۔ وہاں اسے محبت ملی تو یک طرف اور دوستی سرے سے نہیں۔ اس قسم کی دوستی نہیں جیسی ہروشا اور کرا کسلے سے ہوئی۔ ایک طرح کی گہری ذہنی اور جذباتی رفاقت۔ ایسی دوستی جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ ہروشا جو اب چیکوسلاویکیا کے دفتر وزارت خارجہ میں اچھے سے عہدے پر مامور ہو گیا تھا، اسے اس پابندی سے اور اس اخلاص سے خطوط لکھتا تھا کہ یہ ایلیس کے لئے باعث رشک ہوتا۔ کرا کسلے کی وجہ سے اس سال کے آخری مہینوں میں اسے اجنبیت کے اس احساس سے نجات ملی جو ہندوستانی طالبعلم انگلستان میں ہمیشہ محسوس کرتا ہے اور جس کی وجہ سے جب وہ رودبار پار کر کے برِّاعظم یورپ سے انگلستان جانے لگتا ہے۔ تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی قیدخانے کو واپس جا رہا تھا۔ کرا کسلے کی وجہ سے اب اسے پروا نہ تھی کہ انگلستان کی زیادہ عمر کی عورتیں اسے ناپاک رنگ والا، بیرونی مقبوضات کا باشندہ اور معلوم نہیں کیا کچھ سمجھ کے گھورتیں۔ یا شاید محض اجنبی سمجھ کے۔ کیونکہ انگلستان میں اجنبی ہونا بھی گناہ تھا۔

ایلیس اس کے لئے اس سال کا زیادہ ناقابلِ فراموش واقعہ تھی۔ ایلیس کے ساتھ اس کا معاشقہ گویا کلاسیکی طرز کا ایک ڈرامہ تھا۔ وحدتِ مکان، وحدتِ زمان، وحدتِ عمل،

سب کچھ اس ڈرامے میں تھا۔ اس کی روئداد بھی مکمل تھی۔ ایک ہی سال کے اندر آغاز، ارتقا، اور انجام۔ روئداد کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس میں آغاز، درمیان، انجام سب ہوں۔ وہ اس سال اس کی زندگی میں آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ اس کی زندگی میں رہتی۔ مگر ایسا ہوتا تو ڈرامہ —— یا یوں کہئے کہ یہ کامیڈی، یہ طربیہ، قدرت کا یہ مذاق پورا نہ ہو پاتا۔ وہ جہاں سے آئی تھی، چلی گئی۔ پھر نعیم نے اس کے اثر سے گریز کرنا چاہا۔ اسے بھولنے کے لئے اپنے ہم وطنوں کی مجلس ڈھونڈھی۔ اور محض یہ محسوس کیا کہ اب بھی اس میں اور ہم وطنوں میں اتنا ہی بُعد ہے جتنا ہندوستان میں تھا۔ قدرت نے اسے ہندوستانی نہیں، انسان بنایا تھا۔ انسان مسافر، انسانِ گرداں جو اپنے وطن سے باہر ہی خوش رہ سکتا ہے۔ اس نے سفر کیا اور جرمنی نے اس کی اشتمالیت کی تکمیل کر دی —— لیکن ڈرائنگ روم والی آرام کرسی والی اشتمالیت۔ جرمن اسے اچھے معلوم ہوئے۔ خلیق اور مہمان نواز لیکن نازیت نے اسے اس قدر جلد اشتمالی بنا دیا کہ کراکسلے اور میری پاول اور ہروشا بھی اس قدر جلد اس میں یہ انقلاب نہ پیدا کر سکے تھے۔ پہلے زمانے میں لوگ جسمانی محنت سے گریز کر کے صوفی بنتے تھے اور اب اشتمالی۔

۱۹۳۶ء کا صرف ایک واقعہ نامکمل تھا۔ صرف ایک واقعہ تھا جس نے ابھی تک کوئی خاص شکل نہ اختیار کی تھی۔ لیکن جس میں اثر انگیزی کی انتہائی صلاحیت تھی۔ یہ واقعہ میری پاول سے واقفیت تھی۔ اگر اس سال کے ختم تک نعیم میں اور میری پاول میں خط و کتابت نہ شروع ہو جاتی تو شاید وہ بھی بلقیس اور رابلس کی طرح ماضی کا سایہ اور ان سب سے زیادہ ہلکا سایہ بن کر رہ جاتی۔ لیکن اس کی اور نعیم کی واقفیت اب اس درجے پر تھی جیسے کوئی ناول دوسرے باب کے بعد، جیسے کوئی ڈرامہ پہلے منظر

کے بعد۔

اور بلقیس؟ کیا واقعتاً وہ لوحِ دل سے محو ہو چکی ہے؟ یا محض یہ کہ وہ پس منظر میں ہے۔ پس منظر میں اور دل کی دنیا بڑے نامحسوس ہیں۔ اس دنیا میں جہاں سے ابد و یم کی مُہر تیں ابھر کے خوابوں میں راج کرتی ہیں؟ اس سوال کا قطعی جواب نعیم دے نہ سکتا تھا۔ جرعۂ مختتم اور تکمیل اور انجام کا جو تجربہ نعیم کو ایلس کی محبت ہی حاصل ہوا تھا، بلقیس کی محبت میں اس کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

(۳)

چوتھی جنوری کو نعیم لندن میں ہی تھا جہاں وہ کرسمس اور نوروز کی چھٹیاں منانے آیا تھا۔ میری پاول نے اسے پیرس کے پتے سے کرسمس اور نوروز کے کارڈ بھیجے تھے۔

چوتھی جنوری کو وہ رونز وک اسکوائر میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آتشدان میں گیس جل رہی تھی۔ قالین کا رنگ سبز تھا۔ خادمہ نے ابھی تک بستر بھی ٹھیک نہیں کیا تھا۔ گیس کی روشنی میں نعیم کا موٹا ڈریسنگ گاؤن جس کا رنگ نیلا سا تھا، چمک رہا تھا۔ باہر سخت کہر چھائی ہوئی تھی۔ نعیم کے ہاتھ میں "تاریخ انحطاط و زوال سلطنت روما" کا امریکی اڈیشن تھا، اور اس کی آنکھیں آتشدان کی طرف گھور گھور کے تھک چکی تھیں اور تھکن کے ساتھ نیند اس کے دماغ پر چھا رہی تھی۔ چوتھی جنوری کی اس صبح کو جو لندن کے سرما کی طرح سست اور سرد، خالی از واقعہ اور غیر اہم تھی، نعیم نے اپنے کمرے کے دروازے کے کھٹکھٹانے کی آواز سنی۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ خادمہ ہوگی اور بستر اور کمرہ صاف کرنے آئی ہوگی۔ اس نے بے خیالی میں "آؤ" کہا۔ دروازہ کھلا اس نے دروازے کی طرف

ما اور حیرت سے چونک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ میری پامل تھی۔

"تم!" حیرت سے اس کی زبان سے نکلا۔

"ہلو!" گل شرم نے جواب دیا۔ "میں کل ہی پیرس سے آئی۔ آج ادھر سے گذر رہی تھی۔ ما رے مکان کے نمبر پر نظر پڑی اور میں محض ہلو کہنے کے لئے چلی آئی۔ کیوں کوئی حرج ہو نہیں؟"

"مجھے بہت خوشی ہوئی۔" نعیم نے کہا اور میری نے جو ہاتھ مصافحے کے لئے

جایا تھا اسے اپنے ہاتھ میں لے کے نعیم نے کہا "بیٹھو گی نہیں؟" میری اپنا کوٹ

مارنے لگی۔ موٹا سفید خوبصورت کوٹ۔ نعیم نے اس کی مدد کی۔ ان کے لئے وہ دوسری

رسی آتشدان کے قریب کھینچی۔

"مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ لیکن نہ تم نے مجھے لکھا اور نہ کرا کسلے نے کچھ

ذکر کیا کہ تم لندن آنے والی ہو۔"

"ہاں میں ذرا دفعتاً ہی چلی آئی۔"

"گھر جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں میں لندن میں ہی رہوں گی۔ بس چار دن۔ آج کل والد یہیں ہیں۔ لندن

یونیورسٹی میں سائنس کچھ لیکچر وغیرہ دینے ہیں۔ اور والدہ سے تو میں کچھ ہی دن ہوئے

پیرس میں مل چکی ہوں۔"

نعیم نے پوچھا "کچھ پیو گی؟ کافی وغیرہ۔"

وہ کافی پینے پر تیار ہو گئی۔ گیس کے چولھے پر خود اس نے کافی کا پانی گرم کرنے

کو رکھا۔ آتشدان کے قریب سے پیالی کافی اور دودھ وغیرہ اٹھا کے برتن ٹھیک

کرنے لگی۔ یہ سب اس بے تکلفی سے، جو صرف انسانی لڑکیوں ہی کا حصہ ہے اور نعیم اس خیال سے مسکرایا کہ چند مہینے قبل کتنی مسلسل درخواستوں کے بعد کہیں اس کی نوبت آئی تھی کہ میری اس کے ساتھ چائے پیے یا کھانا کھانے کہیں جائے۔

کافی بنانے میں میری نے پوچھا: "اپنے متعلق سب کچھ مجھے بتاؤ۔ آج کل کیسے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں،" نعیم نے جواب دیا۔ "یہاں صرف کرا کسلے سے ملاقات ہوتی ہے کبھی کبھی سینٹ جونز انٹرنیشنل کلب چلا جاتا ہوں۔ اب چھٹیاں بھی ختم ہونے کے قریب ہیں۔"

کافی پیتے میں نعیم نے میری کی طرف دیکھا۔ گلِ سُرخ پر اس وقت غضب کا جوبن تھا۔ اس کے سنہرے بال ایک شانِ بے نیازی سے اس کے سر پہ چھپے ہوئے تھے، جو اس کے سر کی ہر جنبش کے ساتھ دلآویز طریقے پر ہلتے، سمٹتے، لہراتے اور پھر لیمپ کے تمتماتی روشنی میں چمکنے لگتے۔ اس کے گالوں کو سردی نے وہ قدرتی سُرخی عطا کی تھی جو کسی عطار کی بنائی ہوئی سُرخی سے کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کے نرم اور گلابی ہونٹ شگفتہ، سادہ اور مطمئن تھے۔ انہیں کسی مصنوعی لالی کی ضرورت نہیں تھی تو وہ سفید سے ترچھے ہوتی تھی۔ جب وہ سانس لیتی اس کا سینہ آہستہ سے اُبھرتا۔ جب وہ سانس چھوڑتی تو سانس سردی سے دھواں بن جاتی۔

نعیم نے بکلخت اس سے کہا: "میرے نام پیس کا خط آیا ہے۔" اور اس کے ہونٹ خم کھا کر ہو گئے۔ میری کافی پیتے پیتے ٹھہر گئی۔ اس کی نیلی آنکھیں جن میں بحرِ ابیض کے پانی کا سارا حسن تھا، نعیم کے چہرے پر گہری ہمدردی کے انداز میں جم گئیں۔ گویا وہ اس کا انتظار کر رہی تھی کہ نعیم اور کچھ کہے۔ لیکن اس وقت نعیم اس طرح اپنے جذبے کو پوری قوت سے کچل رہا تھا

کہ اس کی قوتِ گویائی گویا سلب ہوگئی تھی۔ وہ میری کی نظر کی اس ہمدردی کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس ہمدردی میں حقارت کا عنصر شریک تھا جس سے اسے تکلیف ہوئی پھر بھی، پھر بھی اس کی خودداری اندرونی گہرائیوں سے احتجاج کر رہی تھی کہ اسے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔

آخر اس خاموشی کو میری ہی نے توڑا "یہ میرے نام بھی ایلیس کا خط آیا ہے میرے خیال میں جو کچھ ہوا تم دونوں کے لئے اچھا ہے۔" میری کی آواز میں ہمدردی کے ساتھ اخلاص بھی تھا۔ نعیم نے پھر اُن گہری نیلی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اخلاص میں کوئی شک نہ تھا۔ میری کہہ رہی تھی "مجھے ہمیشہ سے۔ اندیشہ تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہ رہ سکتے۔ نہ تم نہ ایلیس۔ نہ امریکہ میں نہ ہندوستان میں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہی نہیں ہو۔ بہت اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے تم دونوں پر یہ ظاہر ہوگیا۔ مگر۔ کیا تمہیں اس کا بہت رنج ہے؟"

"نہیں" نعیم نے کہا "میں ایک خلا سا ضرور محسوس کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ جیسے میرے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا۔"

"بہت جلد خلا کا احساس بھی جاتا رہے گا۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ اور زندگی میں ہر قدم پر عجیب موڑ ہیں۔ میری رائے میں نعیم تم اپنی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ڈھونڈھ لو۔ پھر خلا کو پُر کرنے کے لئے تم کسی اور انسان کے محتاج نہ رہو گے۔"

"جیسے ہروشا" نعیم نے کہا۔

"جیسے ہروشا" میری نے دُہرایا۔ "اسے عورتوں کی ضرورت اس لئے نہیں رہی کہ اس کی زندگی وقف ہو چکی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی عورت ضرور آئے گی۔ مگر وہ اسے محبت الفت سے نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔"

کافی ختم کر کے میری اٹھ کھڑی ہوئی۔ نعیم نے اسے کوٹ پہنایا۔ میری نے کہا کہ وہ کرا کسلے کے ساتھ تھیٹر جا رہی ہے، اگر نعیم کو فرصت ہو تو وہ بھی آئے۔ وہ جاتے جاتے ٹکٹ دے دے گی۔ نعیم نے آنے کا وعدہ کیا۔ میری نے اس کے سر کے بالوں میں آہستہ سے انگلیاں پھیر کے کہا، "ہمیشہ ہمت سے کام لو۔ اور ایلس کا خیال چھوڑ دو۔"

اس وقت کوئی طاقت بار بار نعیم کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی کہ اگر اس وقت تم میری کو لپٹا کے اس کا بوسہ لو گے تو وہ کوئی مزاحمت نہ کرے گی لیکن دوسرے کان میں یہ حرف سرگوشی کر رہا تھا کہ مجھے اس وقت دوستی کی ضرورت ہے۔ سچی بے جنس نسوانی دوستی کی۔ دروازے کے قریب پہنچ کے میری کے چہرے پر بھی نعیم نے وہی کش مکش کے آثار دیکھے۔ بہت زمانے کے بعد میری نے نعیم سے ذکر کیا کہ اس دن وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ چلتے وقت اس کا بوسہ لے یا نہ لے۔ اور چونکہ وہ اس وقت کچھ طے نہ کر سکی، خالص دوستی اور نسوانی رجحان کے درمیان اس لئے اور کئی ماہ تک نعیم کو اس بوسے کا انتظار کرنا پڑا۔

(۴)

تھیٹر میں نعیم نے محسوس کیا کہ کرا کسلے اور میری میں جو دوستی ہے اس کی نوعیت بہت گہری ہے۔ کرا کسلے سے نعیم کو توقع تھی کہ اگر اسے میری سے محبت ہوتی تو وہ نعیم سے اس کا ذکر ضرور کرتا۔ مگر کرا کسلے نے کبھی اس انداز سے میری کا ذکر نہ کیا تھا۔ اس کی رازداری پر اسے غصہ سا معلوم ہوا۔ پھر اس نے درمیانی وقفے میں یہ غور کیا کہ میری کی آنکھیں جب کرا کسلے سے ملتیں تو ان میں ایک نشیلا پن سا آ جاتا۔ وہ نشیلا پن جو جسمانی مناسبت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ محسوس کرنے لگا کہ تھیٹر میں ان دونوں کے ساتھ اس کی موجودگی غیر ضروری ہے۔ محض ان دونوں کی مہربانی، ہمدردی ہے کہ وہ اس وقت جب اس کا دل آزردہ ہے، [illegible]

ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔

آخری حصے میں وہ بجائے اسٹیج کی طرف دیکھتے رہنے کے یہی سوچتا رہا کہ کراکسلے نے مجھ سے چھپایا۔

اور یہ سب ہوا کیسے؟

دفعتاً ان تمام سوالات کے دھندلکے میں نعیم کے دماغ میں روشنی کی پہلی کرن پہنچی۔ جو کچھ ہوا کل ہی ہوا۔ کل ہی میری پیرس سے آئی۔ کل شام کو۔ اور سیدھی اپنے والد کے فلیٹ کو گئی ہوگی۔ کراکسلے عموماً پروفیسر پاول کے پاس جایا کرتا تھا۔ کل کی رات دونوں نے کہیں ساتھ گذاری۔ دفعتاً دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے ہوں گے۔ دونوں خوبصورت ہیں۔ دونوں میں غالباً ایک دوسرے کے لئے کشش تھی۔ نعیم مسکرایا۔ سب ہی بس اس نے یہ شعر پڑھا۔

یاراں تیز گام نے محمل کو جالیا   ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اور پھر اس کی دلچسپی غیر ذاتی ہو گئی۔ غیر ذاتی اور غیر شخصی۔ وہ اپنے آپ کو ان دونوں کے درمیان "محمل" سمجھنے لگا۔ لیکن تھیٹر کے بعد کراکسلے اور میری کے انتہائی اصرار پر وہ ان کے ساتھ پروفیسر پاول کے فلیٹ تک گیا۔ وہاں میری کو چھوڑ کے دونوں واپس ہوئے۔ رخصت ہوتے وقت کراکسلے نے میری کا بوسہ نہیں لیا۔

کراکسلے کی اس انگریزی رازداری پر پھر نعیم کو غصہ آنے لگا۔ بالآخر نعیم سے رہا نہ گیا۔ اور اس نے کہا "میرے خیال میں میری کو تم سے محبت ہے؟"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو" کراکسلے نے غیر متوقع طور پر ذرا ترش روئی سے جواب دیا۔ "اسے اپنے اور اپنے کام کے سوا کسی سے محبت نہیں۔"

نعیم خاموش ہو گیا۔ دونوں کچھ دیر تک اسی طرح خاموش چلتے رہے۔ دفعتاً کراکسلے نے

نعیم کا بازو زور سے پکڑ کر کہا "مجھے البتہ اس سے محبت ہے۔ بے حد۔ بہت زیادہ لیکن وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ کل رات اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔ عزیز لڑکے تمہاری طرح مجھ پر بھی یہی مصیبت ٹوٹی ہے۔ کاش میں اس سے واقف ہی نہ ہوا ہوتا یا کم سے کم کل وہ نہ آئی ہوتی۔ مگر وہ اپنے کام کے لئے بنی ہے۔ کام کے لئے۔ میرے لئے نہیں، جمہوریت اسپین کے لئے۔"

نعیم نے جواب میں کہا "میں نے اس کی آنکھوں میں یہ دیکھ لیا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو" کراکسلے نے پھر جھنجلا کے کہا "محبت وہ کر ہی نہیں سکتی کسی مرد سے نہیں۔ تمام انسانوں سے اسے اتنی محبت ہے کہ وہ کسی ایک مرد کی نہیں ہو سکتی۔"

(۵)

دوسرے دن نبری پاول نے بھی نعیم سے کہا کہ وہ جنسی تشنگی کی قائل نہیں۔ لیکن اب تک کسی مرد سے اسے محبت نہیں ہوئی اور نہ اس میں اس کی صلاحیت ہے اور بہر حال پرسوں تو اسے بھر محاذِ ہسپانیہ کا ایک چکر لگانا ہے۔ یہ وقت بھلا عشق اور عاشقی کا ہے؟

۱

بارھواں باب

رقابت

جب نعیم اور کرا کسلے نوروز کی چھٹیوں کے بعد لندن سے واپس ہوئے تو میری پاول کے متعلق ایک دوسرے سے بہت کم باتیں کرتے۔ کرا کسلے کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جس ڈاک سے میری کا کوئی خط اس کے نام آتا اسی ڈاک سے ایک خط نعیم کے نام بھی آتا۔ اگر اسے نعیم کے مقابل مجھ کامیابی ہوئی تھی تو یہ محض اتفاق تھا لیکن اسے اب یہ شک ہونے لگا اور شک تقویت ہی پکڑتا گیا کہ ایک بڑی گہری مفاہمت، ایک بڑی ہی گہری دوستی اس خط و کتابت کے ذریعے نعیم اور میری میں نشوونما پا رہی تھی۔ نعیم خطوط میں اپنے جذبات کا اظہار اس خوبی سے کرتا تھا جتنا وہ رُوبرو نہ کر سکتا۔

نعیم اپنی کل کمزوریوں کی وجہ ہی سے کرا کسلے کو عزیز تھا۔ کرا کسلے اکثر کہا کرتا تھا کہ محبت کی طرح دوستی میں بھی ایک کا حصہ عملی ہوتا ہے اور دوسرے کا جامد۔ جس شخص کا حصہ عملی دوستی ہوتا ہے، اس کا فرض ہوتا ہے کہ اپنے مجہول دوست کی ہر طرح دستگیری کرے۔ میری سے نعیم کی دوستی

ی ایک طرح سے نعیم کی کمزوری ہی تھی۔ گلِ سُرخ کو حاصل کرنے کی تمنا بجائے خود ایک کمزوری
ے۔ کراکس کیلئے اس کی صرف اتنی مدد کر سکتا تھا کہ میری پاول کا ذکر اس کے سامنے نہ کرے۔
ی پاول کے اور اپنے تعلقات کا ذکر نہ کرے۔ کیونکہ اس سے نعیم کو تکلیف ہوگی۔ اور
ی تو اپنا کھیل کھیل رہی ہے۔

ایک قانونِ بے تحریر کی طرح رفتہ رفتہ میری کا نام ان دوستوں کی باہمی گفتگو میں ممنوع ہو گیا۔

(۲)

میری اور نعیم کی خط و کتابت میں ذاتی عنصر بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ نعیم نے اپنے خطوط میں
ت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو میری اسے ٹالتی رہی، مذاق کرتی رہی، چھیڑتی
ی۔ اس کا جواب عموماً یہ ہوتا "اور کتنی لڑکیوں سے تم اسی طرح روزانہ اپنے خطوط میں محبت
نے ہو؟ ۔۔۔ تم نے کسی اور کا خط تو میرے نام کے لفافے میں غلطی سے نہیں رکھ دیا؟"
بجائے کامریڈ رہنے کے، رومیو بننے کا شوق نہیں کیوں ہو گیا ہے؟"

پھر اس کا لہجہ سنجیدہ ہونے لگا۔ وہ اپنے خطوط میں نعیم کو سمجھانے لگی کہ "اس قسم کی
یِ دلی محبت جیسے مشرقی لوگ کرتے ہیں، ناقابلِ عمل اور مضرت رساں ہے۔" یہ کہ "اور
وں لڑکیاں ایسی ہیں جو نعیم کی محبت کی قدر کر سکیں گی۔" مگر اس زمانے میں جہاں وہ یہ
ے کچھ لکھتی وہاں نعیم کی فرمائش پر اپنی تصویریں بھی بھیجتی۔ روز نعیم کے نام خط لکھتی۔ پیرس
ہوتی تو پیرس سے، سفر میں ہوتی تو سفر کے عالم میں۔

ایک خط میں اس نے فلسفۂ محبت پر بحث کی تھی۔ اس کا سب سے دلچسپ حصہ یہ ہے:
"محبت کے متعلق جن قلبی خیالات کا تم نے اظہار کیا ہے وہ میرے خیالات سے زیادہ
ف نہیں۔ اگر اب سے تین چار سال پہلے تم پوچھتے تو میں بالکل دوسری رائے کا اظہار کرتی۔

جب میں نے اپنے ذہنی خیالات میں انقلاب محسوس کیا تو ایک جذباتی انقلاب بھی ساتھ ہی ساتھ ہوا۔ اب مجھے حیرت ہے کہ شروع ہی سے مجھے یہ کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ مسرت اور اطمینان کو ہر شخص کے باطن سے ظہور میں آنا چاہیئے۔ مسرت اور اطمینان کسی دوسرے شخص ——— محبوب ——— سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ میرے لئے اس "باطنی مسرت" کے حصول کا ذریعہ میرا کام ہے۔

"تمہاری دوسری رائے ——— یورپی محبت کے تصور ——— سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ یورپی محبت کا تصور تمہارے نزدیک خود بینی، خود غرضی اور حیاتی کشش پر مشتمل ہے۔ میں یہ ضرور مانتی ہوں کہ حیاتی کشش یا تم اگر چاہو تو اسے حیوانی کشش کہہ لو، ضرور اس میں شامل ہے لیکن محبت اگر حیاتی اور حیوانی نہیں تو اور ہے کیا؟ کیا مرد اور عورتیں حیاتی ہستیاں، حیوان نہیں؟ ممکن ہے کہ سچی محبت روحانی بھی ہو سکتی ہو ——— اس کا مجھے تجربہ نہیں لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سچی محبت حیاتی اور حیوانی اور جنسی سیری کے بغیر ممکن ہے۔ یورپی محبت کو تم خود غرضی کی محبت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عورت ہو یا مرد، جو فریق جو جتنا اسے دوسرے سے ملتا ہے اتنا وہ خود بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر روحانی کشش ——— ذہنی کشش جذباتی مفاہمت، ہمدردی ہو ——— تو محبت مکمل ہو سکتی ہے۔"

"تم نے اپنے متعلق جو لکھا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ تو اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ مشرق کا تخیل ہے۔"

"تمہاری دوستی البتہ میرے لئے ایک بڑا ہی غیر معمولی تجربہ ہے۔ میں کبھی کبھی چاہتی ہوں کہ کاش تم میرے پاس ہوتے اور میں تم سے باتیں کر سکتی۔ میں اپنے آپ کو تم سے دور محسوس نہیں کرتی۔ شاید یہ تمہارا مشرقی پن ہے کہ تم سے دوستی ہی میں اس طرح کا اکھڑا پن محسوس کرتی

ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ایک طرح کی قربت جو محض انسانی قربت ہے۔"

رفتہ رفتہ خطوط میں شخصی اور ذاتی عنصر بڑھتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے متعلق زیادہ لکھنے لگے۔ زبان اور جسمانی قربت شاید میری پاول اور نعیم کو ذہنی طور پر اور پھر جذباتی طور پر اتنا قریب نہ کر سکتے جتنا قریب انہیں خطوط نے کر دیا۔ خطوط میں صرف کشش کا سامان تھا اور جسمانی قرب میں محبت سے پہلے طرفین کو ایک دوسرے کی ناگوار نفسی اور جسمانی باریکیوں کو گوارا کر کے ان کا عادی ہونا ہوتا ہے۔

نعیم کے خطوط اور زیادہ والہانہ ہوتے گئے اور ان میں مشرقی انداز سے اظہار محبت بڑھتا گیا۔ اکثر وہ رات کے تین بجے اٹھ کے خط لکھنا شروع کرتا اور رات کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک خط لکھتا رہتا۔ خطوں میں اتنا اخلاص پیدا ہو گیا کہ میری کو بھی یقین آ گیا کہ یہ ہندوستانی لڑکا بری طرح اس سے محبت میں مبتلا ہے۔

میری کا ایک خط یہ تھا:۔

"پیارے نعیم

تمہارے خطوط میں بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ جب میں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کاش تمہارا کوئی خط میرے پاس ہوتا اور میں بیٹھ کے اسے پڑھتی اور پھر تازہ دم ہو کے کام شروع کرتی۔ مگر تمہارے آخری خط نے مجھے عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں تم سے اس کی معافی چاہتی ہوں کہ میں نے معاملات کو اس حد تک بڑھ جانے دیا۔ میں شروع ہی سے اپنے خطوط میں تمہیں زیادہ موقع نہ دیتی تو تمہارا تخیل تمہیں اس طرح اسیر نہ کر سکتا۔ معاف کرنا میں تمہارے خطوط میں اظہار محبت کو زیادہ تر رسمی اور تفریحی سمجھتی تھی۔

"لیکن مجھے بتاؤ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس تمام عرصے میں تم مجھ سے محبت کرتے رہے

اور مجھے اس کا یقین نہ آیا؟ اب میں آئندہ سے اور اک نسوانی پر کبھی یقین نہ کروں گی۔

"نعیم کاش اس وقت ہم ایک دوسرے سے مل سکتے۔ اگر ہم بیٹھ کے باتیں کرتے اور صورت حال پر غور کرتے تو خط وکتابت کے مقابل یہ اچھا ہوتا۔ ممکن تھا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی۔ تمہیں کچھ دے سکتی جس سے تمہاری تھوڑی بہت تسلی ہو جاتی۔

"میری اور تمہاری دوستی میرے لئے بہت اہم ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ تمہارے اس محبت کے جذبے کا اثر کہیں ہماری دوستی پر نہ پڑے۔ تمہیں تکلیف دیتے ہوئے مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں تم سے یہی کہتی ہوں کہ سب سے بڑا تحفہ جو میں تمہیں دے سکتی ہوں، وہ دوستی ہے۔ تم اپنے خط میں محبت کا اقرار کر چکے ہو اور میں وہی دوستی، دوستی کی رٹ لگائے ہوں۔ اس سے مجھے شرم آتی ہے۔

"ایک لحاظ سے مجھے اس کی خوشی بھی ہے کہ میں شروع ہی سے تمہاری محبت سے آگاہ نہ ہو سکی۔ تم نے اب کہیں جا کے مجھ سے اقبال کیا ہے کہ ایلس سے تمہیں اس لئے محبت ہوئی کہ اس زمانے میں میں تمہیں مل نہ سکی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ایلس سے تمہاری محبت کی وجہ سے، جو بقول تمہارے میری کشش کے درمیان ایک وقفہ تھا —— مجھے تم سے دوستانہ اُنس ہوا۔ اور میں کہہ چکی ہوں کہ یہ خالص انسانی دوستی جو میں تمہارے لئے محسوس کرتی ہوں میری تصوریت کا جذباتی نصف ثانی ہے۔ اگر میں تمہیں جنسی طور پر مل جاتی تو میں دوستی کے اس احساس سے محروم رہتی۔ اس زمانے میں میری مصروفیت نے مجھے بچا لیا۔

"جب طرفین میں سے کوئی ایک محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو دوستی کی شان میں فرق آجاتا ہے۔ میں تم سے اس کا وعدہ چاہتی ہوں کہ تم میرے اور اپنے تعلقات کا مسئلہ میرے سپرد کر دو۔ تم کہتے ہو کہ مشرق میں محبت کا تصور روحانی ہوتا ہے۔ تب تو تمہیں جذباتی تشنگی

کو برداشت کرنا چاہئے اور جب میں دیکھوں گی کہ بغیر جنسی سیری کے ہماری دوستی بھی باقی نہ رہ سکے گی تب میرے لئے فیصلے کا وقت آجائے گا۔

تم نے ذکر کیا ہے کہ فوروز کے زمانے میں جب میں تمہارے کمرے میں آئی تھی تو تم میرا بوسہ دینا چاہتے تھے اور شرما کے نہ لے سکے۔ اس بوسے کا جو تم کو نہ مل سکا مجھے بھی افسوس ہے۔ اب میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ اُس وقت میرا بھی دل چاہا تھا کہ خدا حافظ کہتے ہوئے بوسہ لوں لیکن میں نے خیال کیا کہ معلوم نہیں تم اس کے کیا معنی سمجھو اور اس وقت تمہیں ایلیس کا غم بھی تھا۔

کاش مجھے بھی تحریر پر اتنی قدرت ہوتی جتنی تم کو ہے، تاکہ میں تمہارے جذبات کا، اور خصوصیت سے تمہارے اس وعدہ کا کہ تمہارے عشق سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہ آئے گا شکریہ ادا کرتی۔ شکریہ نعیم۔

تمہاری دوست

میری

(۲)

اپریل میں نعیم لندن آگیا اور برونزوک اسکوائر میں ایک اچھا سا فلیٹ لے کے رہنے لگا۔ اسے لندن یونیورسٹی کے مدرسۂ علوم مشرقیہ میں کچھ درس لینے تھے۔ اس زمانے میں کراکسلے سے اس کی بہت کم ملاقات ہوتی۔ کراکسلے کبھی کبھی ہفتے کے ختم پر ایک دن کے لئے لندن آتا اور نعیم ہی کے ساتھ ٹھہرتا۔

ہروشا کا تبادلہ اسی زمانے میں انگلستان کے چیک سفارت خانے میں ہوا اور وہ بھی لندن آگیا۔ اس کا اور نعیم کا پھر ساتھ رہنے لگا۔ اسی سے نعیم کو معلوم ہوا کہ کراکسلے کچھ دن کے لئے پیرس گیا تھا۔

(۳)

اس زمانے میں لندن میں ملک بار (جہاں دودھ کی بنی ہوئی پینے کی چیزیں اور دیگر خورد و نوش

کی چیزیں ہوتی ہیں جن میں الکحل نہیں ہوتا) کثرت سے کھل گئے تھے۔ ٹاٹن ہم کورٹ روڈ پر ایک چھوٹے سے ملک بار میں نعیم اکثر جایا کرتا۔ وہاں کی ایک خادمہ اسے بہت پسند تھی۔ عجیب بات ہے کہ اعلیٰ وادنیٰ عشق دونوں کس طرح ایک ہی زمانے میں اور مختلف عورتوں سے ممکن ہیں۔ ہروشا بھی کبھی کبھی اس کے ساتھ جاتا۔

ایک دن ہروشا نے بیٹھے بیٹھے ذکر کیا۔

"تم کون سا اخبار پڑھتے ہو؟"

"ڈیلی ہیرلڈ۔ نیوز کرانیکل۔ کیوں ہروشا؟"

"کبھی کبھی ٹائمز بھی پڑھا کرو۔"

"کیوں؟"

"بورژوا شادیوں اور منگنیوں کا اس میں ذکر ہوتا ہے۔" ہروشا نے چاکلیٹ آئس کریم کے گلاس کو ہلا کے جواب دیا۔

"مثلاً؟" نعیم نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"مثلاً آج کے ٹائمز کا یہ ٹکڑا۔" ہروشا نے اپنے کورٹ کی جیب سے کاغذ کا ایک مسلا ہوا ٹکڑا نکالا۔ یہ پورا ایک کالم تھا۔

ہروشا نے چاکلیٹ آئس کریم پیتے ہوئے پڑھنا شروع کیا۔ "عنوان ہے 'ہونے والی شادیاں'۔ جن لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہوتا، وہ اپنے بچوں کے پیدا ہونے، اپنے بزرگوں کے مرنے اور اپنی شادیوں کی خبریں اخبارات میں شائع کرتے ہیں، اور جو لوگ ان سے بھی زیادہ بیکار ہوتے ہیں وہ بجائے ہسپانیہ کی جنگ کی خبروں یا شاہِ انگلستان کی تاجپوشی کی تیاریوں کی خبروں کے ان ہی خبروں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔"

"خیر پھر کیا ہوا ؟"

"اس کالم میں بہت سی شادیوں یا ہونے والی شادیوں کے اعلانات ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔

مسٹر جی۔ ایچ۔ کراکسلے اور مس ایم۔ پاول

مسٹر جیمز گیون کراکسلے، جو آنجہانی آنریبل ہربرٹ کراکسلے اور مسز ہربرٹ کراکسلے ساکنان ہرٹ فورڈ شائر کے صاحبزادے ہیں۔ اور مس میری پاول جو پروفیسر پاول اور مسز پاول کی صاحبزادی ہیں۔ ان دونوں کی نسبت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مس میری پاول یورپ بھر میں "گلِ سرخ" کے نام سے مشہور ہیں اور جمہوریتِ ہسپانیہ کے لئے بہت سی ہمدردانہ خدمات انجام دے چکی ہیں۔ شادی کلیسائے سینٹ مارٹن اِن دی فیلڈز ٹرافالگر اسکوائر میں ۲۸ مئی کو ہوگی۔"

سانس روک کے نعیم یہ خبر سُناتا رہا۔ عنوان سُنتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگا تھا ـــــ ہروشا اس خبر کو صبر آزما ڈرامائی اطمینان سے سُنا رہا تھا اور نعیم کے چہرے کو گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا۔ نعیم کے چہرے کا رنگ سُرخ سے سُرخ تر ہو رہا تھا۔

ہروشا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "مجھے افسوس ہے۔"

نعیم نے بمشکل اتنا کہا "وہ کم سے کم مجھے لکھ تو دیتی۔ مجھ سے اس کا ذکر تو کرتی۔"

ہروشا نے کہا "میرے دوست تم اسے بھی بھول جاؤ گے، جیسے اوروں کو بھول گئے۔ اس ہندوستانی لڑکی کو ـــــ تم نے اس کا کیا نام بتایا تھا۔ بِل کیس ؟ یا جیسے تم ایلس کو بھول گئے۔ لیکن میری نے بڑی غلطی کی ہے۔ میری اور جیمز دراصل ایک دوسرے کے لئے بنے ہی نہیں۔"

"مگر جیمز بہت خوبصورت نوجوان ہے۔ اگر دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تو

ب کی کیا بات ہے؟" نعیم نے قابلِ رحم طور پر ایک غیر شخصی انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

میرے دوست!" ہروشا نے اپنا پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جوشِ تخلیق کبھی کبھی بھٹک
ن جاتا ہے۔ ابھی اسپین کو میری کی ضرورت تھی۔ وہ ہمدردی کی تخلیق کرنا جانتی تھی جب عالمگیر
ک چھڑتی تو دنیا کو اس کی ضرورت ہوتی۔ ایسی ہی عورتوں میں فلارنس نائیٹنگیل بھی تھی۔
ب چیز کی بیوی ہو کے وہ کیا رہ جائے گی۔ محض ڈھلکتے ہوئے پستانوں والی ماں۔ اور اسے
ی سکون نہ ملے گا، نہ چیز کو راحت ملے گی۔"

ملک بار کی حسین خادمہ کو بل ادا کرتے ہوئے ہروشا نے موضوعِ سخن بدلنے کے لئے کہا۔
کل اتوار ہے۔ برائٹن چلو۔ وہاں تمہارا دل بہل جائے گا اور ہاں میں تم سے کہنا بھول گیا۔
ہفتے بھر کے بعد مجھے پراگ واپس جانا ہے۔ یہاں کسی قابل تر آدمی کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ معلوم
ہیں مجھے کہاں بھیجا جائے گا۔"

(۴)

اس رات کو کھانے کے بعد نعیم نے دو خطوط لکھے۔ ایک میری کے نام۔ مختصر سا مبارکباد
خط، دوسرا خط کراکسلے کے نام۔ یہ بھی مبارکباد کا خط۔ کراکسلے کے نام کا خط اس نے ابھی
ختم ہی کیا تھا اور لفافے میں رکھ رہا تھا کہ کراکسلے خود آ پہنچا۔ اسے اس وقت اپنے دروازے
پر دیکھ کے نعیم کو حیرت ہوئی۔ اس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ نعیم کے ہاتھ سرد تھے۔
کراکسلے نے کہا "بھئی اپریل میں بھی تمہارے ہاتھ اس قدر سرد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ خون کی روانی ٹھیک نہیں۔"

نعیم نے اپنے دل میں غور کرنا شروع کیا۔ شاید یہ سب خون کی روانی ہی کا قصور تھا۔
ایک ناقابلِ بیان اور ناقابلِ برداشت غیریت کراکسلے اور نعیم کے درمیان حائل تھی۔

نعیم نے اس کے نام کے لفافے کی طرف اشارہ کرکے کہا "میں ابھی تم کو مبارکباد کا خط لکھ رہا تھا۔ مبارک ـــــ مجھے امید ہے کہ تم دونوں بہت خوش رہوگے"

اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں میں بھی اتنا بُعد تھا کہ اب کرا کسلے کے سلئے دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ اپنے ہندوستانی دوست سے اسی طرح رخصت ہوتا اور یہ بُعد بڑھتا ہی جاتا۔ یا شخصی مصالحت کی ایک آخری کوشش کرتا۔ چنانچہ اس نے کہا "نعیم تم کو بھی میری سے بہت محبت ہو گئی تھی؟"

نعیم نے کہا "ہاں!" اور آتشدان میں گیس جلانے لگا کیونکہ باہر پانی برس رہا تھا اور سردی اچھی خاصی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" کرا کسلے نے کہا۔

"شکریہ۔" نعیم نے خشکی سے جواب دیا "بہرحال مجھے خوشی ہے کہ اس نے تمہیں انتخاب کیا۔ انتخاب اس کے ہاتھ میں تھا۔"

کچھ دیر تک دونوں دوست خاموش دہکتی ہوئی آگ کی طرف دیکھتے رہے۔

پھر کرا کسلے نے دفعتاً جیب سے دونوں ہاتھ نکال لئے اور آتشدان کے سہارے کھڑا ہو کے کہنے لگا "نعیم میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ تمہاری خوبیوں سے زیادہ تمہاری کمزوریوں کی وجہ سے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو یہ صدمہ پہنچا۔ اس سے ہماری دوستی پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟"

دوستی۔ دوستی۔ دوستی۔ نعیم کو اس لفظ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ کیا وہ اسی لئے بنایا گیا تھا کہ ہر درجۂ اوّل کا انسان اسے رحم اور عنایت کی نظر سے دیکھے۔ اسے اپنا دوست بنائے اور دوست رکھنا چاہے۔ جیسے کسی شریف کتے کو۔

اپنے غصّے کو پی کے اس نے جواب دیا۔ "نہیں اس سے ہماری دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

اس کے الفاظ کے جھوٹ کو کرا کسلے نے محسوس کیا کیونکہ اس نے کہا۔ "کیا عجیب بات ہے کہ جب کوئی بنیادی، کوئی انتہائی بنیادی معاملہ درمیان میں آجاتا ہے تو دوستی اور رفاقت سب دھری رہ جاتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ دو مخلص دوستوں کے درمیان اس طرح کا کوئی بنیادی معاملہ آئے جیسے جائداد —— یا عورت۔"

نعیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر نعیم نے پوچھا "سگرٹ پیو گے؟"

"شکریہ۔ عزیز لڑکے۔" کرا کسلے نے خود سگرٹ کا ڈبہ کھولا۔ سگرٹ نکالا۔ جلایا۔ نعیم جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسی طرح خاموش کھڑا تھا۔ چھوٹے بھائی کی طرح جس کا حق بڑے بھائی نے چھین لیا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد کرا کسلے رخصت ہوا۔ اگر وہ نہ آیا ہوتا تو نعیم کو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ اور وہ بھی تسلی دینے کے لئے۔ بڑے بھائی کی طرح جسے چھوٹے بھائی سے ہمدردی بھی ہو۔ جس کے حصّے کی جائداد وہ غصب کر چکا ہو۔

نعیم نے کھڑکی کھولی۔ باہر طوفان سا تھا اور سردی کی ایک ناگوار لہر باہر سے آ کے کمرے کی ہر چیز پر چھا گئی۔ پھر بھی نعیم نے کھڑکی بند نہیں کی۔ گویا اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے۔ اور اسی عالم میں سوچنا شروع کیا۔

میری پر اس کا حق ہی کیا تھا۔ میری کا بوسہ تک تو اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ صرف

چند خطوں سے اسے کراکسلے کی رقابت کا حق کیونکر پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ کراکسلے سے اس کی توقع کر سکتا تھا کہ وہ اس کے حق میں میریؔ کی محبت سے دستبردار ہو جائے۔ ایلس کے معاملے میں دیکھ چکا تھا کہ اس قسم کی شادیوں میں کتنی عملی دشواریاں تھیں۔ ایلس کا گذارا تو پھر بھی شاید ہندوستان میں ہو جاتا۔ مگر میریؔ کی شخصیت تو اتنی اعلیٰ تھی کہ اسے نعیم ہندوستان میں اپنی بیوی کی حیثیت سے تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور پھر وہ خود کب اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میریؔ کے کراکسلے سے تعلقات رہ چکے ہیں۔ اور بیسیوں سے۔ اس کا جنسی رجحان اکثر جنسی بسری پر ختم ہوتا۔

تو پھر آخر وہ میری سے کیا چاہتا تھا؟ ... تعلقاتِ جنسی؟ ان کا تو اب بھی امکان تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی دوست کی بیوی کو پھسلانا قرونِ وسطیٰ میں ہنر سمجھا جاتا تھا ـــ اور زمانۂ حال میں یہ جرم قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے لیکن کیا وہ اب کراکسلے اور میری کے درمیان آئے گا؟ کیا وہ اپنی محبوبہ اور اپنے عزیز ترین دوست کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کرنے کا باعث بنے گا اور یہ سب کس لئے؟ کیا وہ جسمانی راحت اور کہیں حاصل نہیں ہو سکتی؟ مثلاً ملک بار کی وہ حسین خادمہ۔ یا ہمپرا سمتھ پیلیس کی ہزاروں ناچنے والی لڑکیاں جہاں ہندوستانی طالب علم اکثر لڑکیاں "پکڑنے" جاتے ہیں۔ گویا لڑکیاں نہ ہوئیں مچھلیاں ہوئیں۔

لیکن وہ تو میریؔ کو چاہنے لگا تھا۔ گلِ سرخ 'کو'، میریؔ کو جو اب ایک جنسی تصوریت بن چکی تھی، قرونِ وسطیٰ میں جنوبی فرانس کے نائٹ، اپنے دوستوں کی غیر موجودگی میں کس طرح ان کی بیویوں کے کمروں کے نزدیک فصیل کے قریب کھڑے ہو ہو کے اظہارِ محبت کرتے تھے۔

ںعانس کی شاعری۔ پیرووال جس نے اپنی محبوبہ کو مادہ گرگ سے تشبیہ دی ہے۔ اس
نے کے شوہر، شعرائے اپنی بیویوں کی تعریف سُن سُن کے خوش ہوتے تھے۔ نظامِ عشق
ں شوہر کچھ نہ تھا۔ اسے 'رقیب' ہونے کا مرتبہ بھی حاصل نہ تھا۔ عاشق کا رقیب شوہر کے سوا
ئی اور عاشق ہی ہوتا۔ جفا قرونِ وسطیٰ کی ان خواتین اور نازنینانِ ایران کا یکساں حصہ تھا لیکن
ے وفائی کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ عاشق جنوں بھی تھا اور بندۂ بے دام بھی۔ اور رازداری
ق کا اصل اصول تھا۔ رازداں عاشق کا پیغام معشوق کو، اور معشوق کا عاشق کو پہنچاتے۔
ن وسطیٰ کی پروونسال شاعری اور فارسی شاعری میں کتنی چیزیں مشترک ہیں۔ کتنی شاعرانہ
ایات، جفا، وفا، بے وفائی، رازداری، جنون، عاشق کی سرگشتگی، عاشق کی بیچارگی، معشوق
دل آزاری، معشوق کی دلجوئی، رازداری اور احترامِ راز، رقیب اور رقیب کا شر کاش یہ
ی زمانہ ہوتا۔ یہ زمانہ کیا کم ہے؟
کیا اسے فی الحقیقت میری سے محبت تھی یعنی میری کے جسم سے۔ میری کے بال بڑے
بصورت تھے۔ گچھے دار، ریشمی سنہرے بال، سراپا بھی مشرق اور مغرب کی شاعری میں یکساں
بول رہا ہے۔ بالوں کے بعد پیشانی کا ذکر ہوتا ہے۔ میری کی پیشانی اوسط انگریزی پیشانی
ں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس کی آنکھیں کتنی گہری، کتنی نیلی تھیں۔ اور ناک، چھوٹی سی تیکھی
ں، تناسب اور سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ کتنا سفید تھا۔ گُرخ سے
رہ سفید اور اس کے لب کتنے سُرخ تھے اور اس کے دانت . . . .
اس کے دانت بہت زیادہ سفید نہ تھے۔ ایلس کے دانتوں کے مقابل وہ کچھ نہ تھے
ے ٹیالے رنگ کے مگر متناسب دانت، جو اس کے چھوٹے سے دہانے کے اندر ہی
ہنے تو اچھا تھا۔ صرف مسکراہٹ کے وقت نہ دانت۔ اسے مجھے معلوم ہوتے ہنسی کے وقت نہیں۔

اور اس کے شانے نعیم کو اس وقت یاد نہیں رہا کہ اس کے شانے بھرے ہوئے تھے یا نہیں بلقیس کے شانے کتنے بھرے ہوئے تھے اور میری کے پستان ڈھلکے ہوئے تھے۔ دانت اور پستان، اگر ان دونوں میں بھی وہی کمال ہوتا جو میری کے جسم کے اور ہر حصے میں تھا تو وہ شہزادی نہیں دیوی معلوم ہوتی۔

اکثر وہ سفید ٹوپی اوڑھتی تھی جو اس کے سنہرے بالوں اور اس کی ہاتھی دانت کی سی رنگت پر بہت ہی موزوں معلوم ہوتا۔

کیا وہ اس عورت کو چاہتا تھا۔

اس عورت کو جو خوبصورت ہونے کے علاوہ ایسی کشش رکھتی تھی جو محض نسوانیت کا حصہ نہیں۔ وہ کشش جو ان شعاعوں کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی جو اس کی ذہنی شخصیت سے نکلتی تھیں ہر ایک کو وہ مسحور کر دیتی تھی۔ اپنے حسن سے نہیں اپنی شخصیت سے بھی اپنے دماغ سے بھی۔

کھڑکی سے ٹھنڈک کی لہریں برابر آ رہی تھیں۔ آتشدان میں پینی بھر کی گیس کی آگ ختم ہو چکی تھی۔ اور سوراخ میں ایک اور پینی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ سردی کا ایک جھونکا اور آیا اور نعیم کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے جسم کے آر پار سا ہو گیا۔ اسے زور کی چھینک آئی اور اسے معلوم ہو گیا کہ زکام زیادہ دور نہیں۔

عشق میں ناکامی ہی کیا کم مصیبت تھی کہ یہ زکام بلا کی طرح نازل ہوا۔

دوسرے دن ہروشا کے ساتھ گیارہ بجے نعیم نے اسی ملک بار میں امریکن سینڈوچ کھائے۔ یہاں ڈاکٹر راجندر سے ملاقات ہوئی جن کے ساتھ ایک جرمن یہودن تھی۔ ڈاکٹر راجندر کو ہروشا نے بہت پسند کیا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ان میں نعیم سے زیادہ ہندوستانیت تھی۔ کچھ اس وجہ سے کہ انہوں نے اسے ہندوستانی ریکارڈ سنانے کا وعدہ کیا۔

بارہ بجے ہروشا اور نعیم برائٹن روانہ ہوئے۔ راستہ بھرا ہوا تھا اور برائٹن میں خاصی بارش ہو رہی تھی۔ مشہور و معروف برائٹن۔ یہاں ایک مشرقی وضع کا، انتہا درجے کی بدمذاقی کے ساتھ بنا مشرقی طرز کا گنبد اور اس کی عمارت نہ ہوتی تو مقام ایسا برا نہ تھا۔ مگر دھوپ کا کہیں نام نہ تھا۔ سمندر کی موجیں بے چین اور کف بہ لب تھیں اور سمندر سے تیز ہوائیں آ رہی تھیں۔ سمندر کے کنارے کی سڑک پر دونوں بہت دیر تک ٹہلتے رہے۔ پھر ایک گرم چھوٹے سے ریستوران میں چائے پی۔ ہروشا اسے عاشقی کے خلاف لکچر دیتا رہا اور زکام بڑھتا گیا۔

ہروشا سمجھا رہا تھا "عورت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اسے شرم آتی ہے۔ مثلاً نظریہ پرستی، سطحیت، اس کا اسٹائی پن، اس کا برخود غلط انداز، اس کا بے لگام پن، اس کی بے احتیاطی، محض مرد کے خوف سے وہ محتاط رہتی ہے۔۔۔"

نعیم دل میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے خط میں صرف اتنا لکھ دیتی کہ وہ کراکسلے کو چاہتی ہے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

اور اس کا زکام بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ابتدائے بہار کا زمانہ تھا مگر موسم کی یہ حالت تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابھی جاڑے کی گہرائیاں باقی ہیں یا سچ مچ بہار آ گئی۔

عشق اور زکام اور بہار میں اس قدر سردی۔۔

اے وائے بہارے اگر ایں است بہارے

تیرھواں باب

تاجپوشی

نعیم ملکِ معظم جارج پنجم کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا تھا۔ اسی کے دورِ حکومت میں ہوش سنبھالا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دورِ حکومت کبھی ختم نہ ہوگا۔ گویا اس میں بھی سلطنتِ برطانیہ کا سا استحکام ہے لیکن کہن سال بادشاہ کو بھی بالآخر ملک الموت نے اپنا شکار بنا لیا۔ شاہزادۂ ویلز ایڈورڈ ہشتم کے نام سے بادشاہ بنا اور چند ماہ حکومت کی۔ پھر مسز سمپسن کا قصہ شروع ہوا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ویلز میں بادشاہ نے کان کنوں سے جو اخلاق برتا اس سے اس کے اشتراکی رجحان کا پتہ چلتا ہے اور اسی لئے بالڈون اس کا مخالف ہے۔ اس زمانے میں نچلے طبقے اور مزدور طبقے کے انگریزوں کے نعرے لگنے کے قائل ہو لئے۔ پروفیسر اور طالب علم کالج کے ہواسیوں کے گرد جمع ہو جاتے اور حبز سیوں کی رائیں اور بیہودہ گوٹیاں سنتے۔ مسٹر چرچل نے اس سال بادشاہ کی حمایت بھی کی۔ لیکن نوآبادیات نے مخالفت کی۔ مسز سمپسن دو بار

طلاق لے چکی تھی۔ بھلا انگریزی اخلاقِ عالیہ — جو در پردہ سب کچھ گوارا کر لیتے — یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایسی خاتون ان کی ملکہ بنے۔ نعیم نے بہت سے انگریز دوستوں کے ساتھ ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کی تقریر سنی۔ دوسرے دن ایک آدھ قدامت پسند اخبار نے اسے مسٹر ایڈورڈ ونڈسر لکھا۔ نیا بادشاہ اگر البرٹ کے نام سے تخت نشین ہوتا تو کتنا اچھا تھا مگر ملکۂ وکٹوریہ نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ کیونکہ اس کے شوہر کا نام البرٹ تھا اور اپنی زندگی میں اس نے اس کی مفارقت کا داغ اٹھایا تھا۔ چنانچہ نئے بادشاہ کو جارج ششم کا لقب ملا۔ اس نے اپنے بھائی کو ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب دیا۔ ڈیوک آف ونڈسر نے مسز سمپسن سے شادی کی اور ہٹلر سے ملاقات کی۔ جارج ششم نے شہر اور ملک کے غریب حصوں کے دورے کئے۔ بادشاہ کی ہر دلعزیزی بہت ضروری ہے۔ اسی زمانے میں انگلستان نے دفعتاً اس امر کو دریافت کر لیا کہ ملکۂ معظمہ ملکہ الزبتھ بہت خوبصورت ہے۔ اشتراکی بادشاہ شکنی اور بادشاہ گری کے اس کھیل پر تالیاں بجاتے رہے اور ہائیڈ پارک میں تقریریں کرتے رہے۔ اقبال نے ایک نظم لکھی۔

شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت — جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش
ہے یہ مشک آمیز افیوں ہم غلاموں کے لئے — ساحرِ انگلیس! مارا خواجۂ دیگر تراش

ساحرِ انگلیس کا خواجۂ دیگر تراش جلد مقبول ہونے لگا۔ تاجپوشی کی تیاریاں بدستور جاری رہیں مگر تاج بخشنے والا بدل گیا۔ براعظم یورپ میں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر شاہِ انگلستان کی تاجپوشی دیکھنے انگلستان آؤ کے اشتہار مہینوں پہلے سے لگ گئے۔ شہر لندن تاجپوشی کے زمانے میں جھنڈیوں سے آراستہ ہونے لگا۔ ربع مسکون سے کئی بادشاہ سرِ اطاعت خم کرنے اور ادائے اطاعت نبھانے آئے۔

ہوٹل اس قدر بھر گئے کہ چھ گنے پانچ گنے کرائے پر بھی جگہ ملنی ناممکن تھی۔ ہندوستانی راجے مہاراجے آئے۔ نائیجیریا اور مشرقی افریقہ کے حبشی سردار آئے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹ پہنے ہوئے۔

ان میں سے ایک آدھ اپنا تعارف چٹکی بجا کے یوں کراتا "میں پرنس آیا ہوں" اور اس کے سیاہ اور موٹے حبشی چہرے پر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔ راجاؤں کے ساتھی افسروں اور خادموں کی وجہ سے لندن کے ہوٹل اور قہوہ خانے ہندوستانیوں سے بارونق ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ہوٹل نے ایک نیا سوپ (شوربہ) ایجاد کیا اور اس کا نام "مہتر چترال کے تاج کے موتیوں کا سوپ" رکھا۔

(۲)

۵ مئی ۱۹۳۷ء کی سہ پہر کو، یعنی جشنِ تخت پوشی سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے سینٹ جوزف انٹرنیشنل کلب میں نعیم برتھا سے ملا۔ وہ اسی دن آئی تھی اور اس کا سامان کلب کے تہ خانے میں پڑا تھا۔ کہیں جگہ کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے پھر قاضی ہاشم صاحب کے ساتھ نہ رہنا پڑے جن سے اس نے پیرس میں پیچھا چھڑا لیا تھا۔ نعیم نے اسے تین بجے سینما چلنے کو کہا۔ ایک جرمن فلم اکادمی سینما میں ہو رہا تھا۔ "برگ تھیاٹر" سینما میں اس کے اور نعیم کے شانے ایک دوسرے سے مس کر رہے تھے۔ مگر نعیم کی طبیعت دست درازی کرنے کو نہ چاہی۔ سینما سے نکل کے چھ بجے کے قریب دونوں نے ایک چھوٹے سے مگر خوبصورت چینی ریستوران میں چائے پی۔ اور چائے پینے میں برتھا نے کہا "معلوم نہیں میں آج کی رات کہاں گذاروں گی۔ جتنی لڑکیوں سے میری دوستی ہے ان میں سے کسی کے یہاں مجھے جگہ نہیں ملی۔"

نعیم نے کہا کہ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ اگر وہ گوارا کرے تو اس کا فلیٹ حاضر ہے۔

برتھا نے بہت شکریہ ادا کر کے انکار کیا۔ نعیم نے اسے رات کے کھانے پر مدعو کیا تو اس نے کہا کہ وہ اپنے ایک ولندیزی دوست کے ساتھ کھانا کھانے کا وعدہ کر چکی ہے۔

دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر راجندر سے ملنے ہیمپ اسٹڈ گیا۔ دونوں ہیمپ اسٹڈ ہیتھ پر ٹہل رہے تھے۔ مئی کی صبح کی لطیف دھوپ میں اس سبزہ زار پر بڑی رونق تھی۔ درختوں کے درمیان ہلکی ہلکی دھند تھی۔ جہاں کہیں پانی جمع ہو گیا تھا وہاں بھی کہر اور سبزہ کے رنگ ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ سامنے مکانوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں بڑا ہی پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں ڈاکٹر راجندر نے ان دونوں ہندوستانی لڑکیوں کو نعیم سے ملایا جن سے پہلے اس دن پیرس میں راجکمار کی پارٹی میں ملا تھا۔ ان میں سے بڑی بہن کوکب زماں اب بھی اسی طرح بدشکل معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی آنکھیں لانبی اور خوبصورت تھیں۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو کے باتیں کرنے لگی۔ دوسری بہن خورشید زماں کا ناک نقشہ اچھا تھا اور جسم چھریرا سا۔ یہ دونوں لڑکیاں بل سائز اوے نیو میں ٹھہری تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر راجندر نے ان کے قصے سنانا شروع کئے۔

دوپہر کا کھانا کھانے جب نعیم پرمیننٹ جوزف انٹرنیشنل کلب پہنچا تو ربِتا وہاں ملی۔ وہ ولندیزی نوجوان اس کے ساتھ تھا۔ نعیم اس سے پہلے مل چکا تھا۔ اس کا نام تھا وان مائن سائمن، چھ فٹ کے قریب قد، ہونٹ نہایت سرخ، بال راکھ کے رنگ کے اور ذرا گھونگھر والے۔

ربِتا موقع پا کر ہاتھ پکڑ کے نعیم کو ایک طرف لے گئی "کیا میں وہ دعوت اب بھی قبول کر سکتی ہوں جو تم نے کل دی تھی؟ میں تمہارے فلیٹ میں آ کے ٹھہر سکتی ہوں؟"

"بے شک۔ ضرور۔ خوشی سے" اور رات کی امید سے نعیم نے اپنے بدن میں خون کی گرمی محسوس کی۔

"وان مائن نے میرے ساتھ بڑا کمینہ پن کیا۔ مجھ سے کھانے کے اور کمرے کے کرائے کے پانچ شلنگ لئے اور پھر رات کو ـــــ رات کو میں اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔ آخر یہ بدی ہے نا؟"

کیا عجیب بات ہے۔ یہ یورپی لڑکیاں بدی کو پسند بھی کرتی ہیں اور جب دھوکا

کھاتی ہیں تو ہٹلر کی طرح انہیں برا بھلا بھی کہتی ہیں۔ پھر بھی نعیم کو یقین تھا کہ برتھا کو افسوس اس کا نہیں کہ اس نے وان مان کے ساتھ رات گذاری، بلکہ اس کا کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کی خاطر کرتا اُلٹا اس سے پانچ شلنگ لے مرا۔

نعیم نے ایک ٹیکسی منگوا کے برتھا اکسل سن کا سامان اپنے فلیٹ پر پہنچایا۔ وہیں برتھا نے چائے بنائی اور نعیم کی گود میں بیٹھ کے پی۔ ہروشا آگیا اور یہ دیکھ کے کہ اس قدر جلد نعیم اس نئی سویڈی حسینہ سے میری کے فراق کا غم غلط کر رہا ہے، مسکرایا۔ ابھی سہ پہر کا کافی حصہ باقی تھا۔ نعیم کے اصرار پر اس کے اور برتھا کے ساتھ ہروشا بھی سینما چلنے کو تیار ہوگیا۔ کل ہروشا چیکوسلاویکیا واپس ہو رہا تھا۔

سینما سے واپسی پر نعیم نے کہا کہ اس کا ارادہ یورپ کے ایک بڑے طویل سفر کا ہے اور اس سفر کے ختم پر وہ ہندوستان واپس ہوگا۔ ہروشا نے اسے چیکوسلاویکیا آنے کی اور برتھا نے اسٹاک ہولم آنے کی دعوت دی۔

رات کا کھانا "چو بولی" میں کھا کے ہروشا تو رخصت ہوا اور برتھا اور نعیم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے برونزک اسکوائر چلے۔

راستے ہی میں اس نے غور کرنا شروع کیا۔ میری بھی آج کل لندن ہی میں تھی۔ اس نے ٹیلیفون بھی کیا تھا کہ وہ ملنے آئے پھر بھی نہیں آئی۔ وہ کراکسلے کے ساتھ ٹھہری تھی۔ کراکسلے سے بھی چار پانچ دن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سچ ہے کہ انگریزوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کراکسلے ہی تو کہتا تھا کہ کوئی بنیادی مسئلہ درمیان میں آ جائے تو ہماری دوستی رکھی رہ جاتی ہے۔

ہروشا نے کہا تھا کہ کراکسلے اور میری ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں جیسے میاں بیوی۔ ابھی سے پھر نعیم کا خون کھولنے لگا۔ اور پھر وہ بول ابھی ہی تو زمانے میں ہیپا ہونا

"گلِ سُرخ" اب برطانوی تاج پر کوہِ نور کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر ممکن ہے اس کا خیال غلط ہو۔ ممکن ہے میری اس لئے نہ آئی ہو۔ محض کرا کسلے کے لئے آئی ہو۔ بہر حال کرا کسلے یا کوہِ نور، اس سے تو وہ بہت دور ہو چکی تھی۔

اور اس سلسلۂ خیالات سے اکتا کے اس نے برتھا سے کہا "مجھے اسٹاک ہولم کے اور حالات سناؤ؟"

برتھا نے کہا "اب تم خود آ کے دیکھ لینا۔ میں اپنے ساتھ پھرا کے تمہیں سارا شہر دکھاؤں گی"

اس کے بعد وہ سویڈی زبان کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ صدیوں تک سویڈی میں "تم" کے لئے کوئی لفظ نہ تھا۔ اور اب لفظ "دے" مقبول ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر بے تکلف گفتگو ناممکن تھی۔ اس سے پہلے دو دوست جو زیادہ بے تکلف نہ ہوتے ایک دوسرے کو یوں مخاطب کرتے "طالب علم صاحب کا اس معاملے میں کیا خیال ہے؟" "میں تو جوان خاتون کی رائے سے متفق ہوں۔" برتھا نے کہا کہ "اگر ہم تم اس وقت سویڈی میں باتیں کرتے ہوتے تو قاعدہ زبان کے متعلق اسی طرح باتیں کرتے ہوتے۔"

اپنے فلیٹ میں پہنچ کے اس نے دو گلاسوں میں کیانتی بھری۔ وقت بے وقت کیانتی سے خاطر کرنا اس کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ایک گلاس اس نے برتھا کو دیا۔ برتھا کو پھر اپنی گود میں کھینچ کے بٹھایا۔ برتھا کے پستان بڑے بڑے تھے اور نرم نہیں تھے۔۔

برتھا نیم دراز حالت میں اس کی گود میں لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سنہرے بالوں سے بھرا ہوا سر نعیم کے شانے کا سہارا لگائے ہوئے بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ نعیم نے اس کا بوسہ لینا چاہا تو اس نے اپنے لب اوپر اٹھا لئے۔ نعیم نے اسی حالت میں اسے اور اچھی طرح اپنی آغوش کی گرفت میں لے کے اور اس کے سینے پر پنجہ گاڑ کے اس کا بوسہ لیا۔ نعیم کے دانت اس کے دانتوں سے

ٹکرائے اور وہ نعیم کی زبان کو چوسنے لگی۔ پل اور سکے نیچے وہ ریشمی زیر جامہ پہنے تھی۔ بے دردی سے گویا میری کا انتقام لینے کے لئے نعیم نے اپنے دانتوں سے اس کے ہونٹوں کو کاٹا لیکن برتھا اس کو انتقام کہاں سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ استوائی جوش محبت تھا۔ برتھا کا تنفس تیز اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔

دوسرے دن نو بجے برتھا نے اٹھ کے چائے بنائی اور ایک ہی پیالی سے ایک گھونٹ خود پیتی دوسرا نعیم کو پلاتی رہی۔

باہر مطلع ابر آلود تھا مالکہ مکان سے کہہ کے نعیم نے دوپہر کا کھانا وہیں منگوایا۔ چونکہ دن بھر دونوں باہر نہیں نکلے تھے اس لئے ذرا ذرا سردی معلوم ہو رہی تھی۔ نعیم نے گیس جلایا۔

کھانا کھانے میں برتھا نے پوچھا۔

"تم افلاطونی محبت کے قائل ہو؟"

نعیم نے کانٹا رکھ کے مسکرا کے جواب دیا "یہ تو تم دیکھ چکی ہو۔"

برتھا کھلکھلا کے ہنسی، اس کے سنہرے بال ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور اس کے لبوں پر ایک عجیب طرح کا حسن اور انتہا درجے کی شگفتگی جھلکنے لگی۔

"تو تم اس کے قائل ہو کہ مرد اور عورت میں ایسی دوستی بھی ممکن ہے جس میں جنسی تعلق نہ ہو؟"

"ممکن ہے ایسا ہوتا ہو" نعیم نے کہا "مگر میرے خیال میں جنسی تعلق کے بغیر مرد اور عورت کی زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ بغیر محسوس طور پر تو جنس کا احساس موجود ہی رہتا ہے۔"

برتھا مسکرائی۔ پھر اس نے کہا "وان مانن سے مجھے بڑی نفرت معلوم ہوتی ہے۔"

دو تین لمحے کے بعد نعیم نے ہنس کے کہا "قاضی ہاشم تمہیں پسند ہے؟"

"اس کا نام بھی میرے سامنے مت لو۔" برتھا نے بے صبری سے کہا۔ "ایسا ناقابلِ برداشت آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔"

"اور راجہ ہمت نواز ونت؟"

"ہاں ان سے بالکل سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پیرس میں اس دن تم بھی ملے تھے نا؟"

"ان کے ساتھ رہ چکی ہو؟"

وہ شوخی سے مسکرائی "پیارے تم بڑے شریر ہو۔ تمہیں یقین کرنا چاہیئے کہ تمہارے سوا مجھے شاید ایک آدھ مرد کے ساتھ محبت ہوئی ہو۔ تم مجھے آخر کیا سمجھتے ہو؟"

"میں تمہیں شمالی یورپ کی سب سے زیادہ حسین لڑکی سمجھتا ہوں۔"

شاورمہ آ کے برتن لے گئی۔ برتھا نے ریڈیو کا بٹن گھمایا۔ لکسم برگ سے موتسارٹ کا انتخاب بج رہا تھا۔

نعیم نے برتھا کے ہونٹوں کا بوسہ لے کے ان میں ایک سگریٹ پکڑایا اور پھر سگریٹ جلا کے اپنے لئے بھی سگریٹ سلگایا۔ خود فرش پر برتھا کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کے اس کے گداز سفید جسم کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

"نعیم ڈارلنگ!" برتھا نے اس طرح کہا گویا کچھ سوچ رہی ہو۔

"مجھے ذرا خوف معلوم ہونے لگا ہے۔ اگر مجھے کوئی سانولا سا بچہ ہو جائے تو میں کیا کروں گی؟"

"پیاری تمہاری مرضی کے خلاف تو میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔" نعیم نے کہا۔

"آج میں اور تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مگر کل اگر کوئی اور مقام مجھے مل جاتا تو اچھا تھا۔ کسی ہوٹل میں، کسی بورڈنگ ہاؤس میں، یا کسی سہیلی کے یہاں۔"

نعیم کو یک لخت یاد آ گیا۔ اس نے کہا "کل مجھ سے دو ہندوستانی لڑکیوں سے
ملاقات ہوئی تھی۔ تم بھی انہیں جانتی ہو، کوکب زماں اور خورشید زماں۔ وہ بھی پیرس میں
راجکمار کے ناچ میں آئی تھیں۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"ان میں سے کسی ایک کے ساتھ میں تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کرا سکتا ہوں ورنہ
اگر اجتناب نہ کرنا چاہو تو یہ دوسرا پلنگ تو موجود ہی ہے۔" نعیم نے کہا۔

"نہیں — تمہارے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ کے تو میں اپنی طبیعت پر قابو
نہیں رکھ سکتی۔"

"تو پھر ان دونوں ہندوستانی لڑکیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تمہارے ٹھہرنے
کا انتظام کر دوں گا۔"

(۳)

مئی کی سہ پہر کو نعیم نے برتھا کو بل سائز ایونیو پہنچایا، اور اسے کوکب زماں بیگم کے
سپرد کیا۔ ان سب لڑکیوں کو آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کے وہ مسکرا کے
اٹھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں برتھا نے اس کا بوسہ لیا اور نعیم نے بھی اسے چھیڑنے کو آنکھ
مار کے کوکب زماں کی طرف اشارہ کیا جس کی عفت سیمیں کے متعلق وہ ڈاکٹر راجندر
کی زبانی سن چکا تھا۔

اس دن رات کے کھانے پر اسے کراکسلے نے بلایا تھا۔

میری کے بالوں میں اب وہ پہلے کی سی بے ترتیبی نہ تھی۔ اس کے بال بنے ہوئے
تھے۔ چھوٹے چھوٹے سنہری حلقوں پر سرخ رنگ کی چٹیاں تھیں۔ اس نسبت سے اس کے

مسے

بالوں کے قدرتی حسن تک کو نہ چھوا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت قیامت کا بھولا پن تھا اور جسم پر ہاتھی دانت کی سی سفیدی تھی۔ وہ نعیم سے بڑے اخلاق سے ملی۔ کرا کسلے بھی بہت تپاک سے ملا۔

میری نے اپنے ہاتھ سے اسپاگیٹی بنائی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے وہ میز پر کھانا لائی۔ وہ بالکل گھریلو بیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اسی وجہ سے نعیم اپنے آپ کو اور بھی زیادہ اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ اجنبی اور خود آگاہ۔ ایک طرح کی غیریت اس کے اور ان دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔

اور اس غیریت کی وجہ سے میری اور زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

باتیں بھی ہو رہی تھیں تو ادھر ادھر کی۔ موسم کے متعلق، پھولوں کے متعلق، سیاسیات کے متعلق۔ جشن تاجپوشی وغیرہ کی نسبت۔

نعیم نے ہنس کے کہا "شادی کے بعد تو میری کی سیاسی سرگرمی ذرا کم ہو جائے گی۔ کیوں؟"

میری نے کہا "ہرگز نہیں۔ نہیں معلوم ہے کہ بلباؤ جو جہاز بچوں کے لئے غذا وغیرہ لے کے جا رہا ہے اس کے لئے میں نے یہاں کتنے پاؤنڈ جمع کئے ہیں۔ صرف میں نے چار سو پاؤنڈ جمع کئے ہیں۔ ہم دونوں سوچ رہے ہیں کہ شادی کے بعد کچھ عرصے کے لئے چین جائیں۔ ہسپانیہ کی وجہ سے ہمیں چین کو نہ بھولنا چاہئے۔"

"یہ تو بڑا دلچسپ سفر ہوگا۔" نعیم نے کہا۔

"میں چین کے متعلق عرصے سے ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔" میری نے کہا۔

نعیم نے کہا "تم دونوں ہندوستان ضرور آنا۔ اس وقت تک تو میں واپس پہنچ

چکا ہوں گا۔"

"تم کب واپس جاؤ گے؟" کرا کسلے نے پوچھا۔

"غالباً آئندہ ستمبر میں۔ لیکن امتحان کے بعد ہی جون میں میں یورپ کے سفر کا ارادہ کر رہا ہوں۔"

کرا کسلے کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نعیم کا دوسرا گریز ہے۔ اب نعیم میری کے اثر سے گریز کر کے سیاحت کے تجربے میں پناہ لینا چاہتا تھا۔

میری نے کہا "یورپ بھر کے سفر کا؟"

"تقریباً" نعیم نے جواب دیا "پہلے ناروے اور سویڈن۔ پھر ڈنمارک۔ پھر فرانس۔"

"نمائش دیکھنے؟"

"ہاں نمائش دیکھنے" نعیم نے جواب دیا "اس کے بعد میرا اور میرے ایک ہندوستانی دوست ڈاکٹر راجندر کا ساتھ ہو جائے گا۔ انہوں نے ایک نئی موٹر لی ہے۔ ہل مَن۔ وہ اسی پر برِّ اعظم کی سیاحت کرنا چاہتے ہیں۔"

"بہت دلچسپ۔"

"ان کے ساتھ جرمنی، چیکوسلاویکیا، آسٹریا اور اٹلی کے سفر کا ارادہ ہے۔"

"بہت دلچسپ سفر ہوگا" میری نے کہا "ہم لوگ ماہِ عسل کے لئے آسٹریا اور چیکوسلاویکیا جا رہے ہیں۔ پراگ میں ہیں ہروشا نے دعوت دی ہے۔"

"مجھے بھی ہروشا نے بلایا ہے۔"

الغرض اسی قسم کی باتیں ہوا کیں۔ معلوم ہوا کہ کرا کسلے کل آکسفرڈ واپس جا رہا ہے اور میری اس کے ساتھ ہی جائے گی۔

(۴)

تاجپوشی سے ایک شام پہلے یعنی ۱۱ مئی کی شام کو مغربی لندن میں عجب بہار تھی۔ رات کو تو بہت سے راستوں پر موٹر کا گذر موقوف ہو گیا۔ خلقت دریا کی طرح اُمڈی پڑتی تھی۔ بہت سے لوگ تیس چالیس گھنٹے اپنی نشستوں سے ہٹے نہیں کہ جلوس دیکھنے کے لئے پھر جگہ ملے نہ ملے۔

شام کو پانچ بجے کے قریب اسے کلاکسلے کی چٹھی ملی۔ مارگرٹ چند گھنٹوں کے لئے لندن میں ٹھہرنے والی تھی۔ رات کے نو بجے وہ وکٹوریا اسٹیشن سے برّ اعظم جانے والی یعنی ڈنکرک والی ٹرین پر سوار ہونے والی تھی، جو رات بھر جہاز پر رہتی ہے اور صبح کو پیرس پہنچاتی ہے۔ وہاں سے وہ گرے نوبل جا رہی تھی۔ اب وہ بھی اتنی پکّی اشتراکی بن چکی تھی کہ جشنِ تاجپوشی دیکھنے کا اسے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ ورنہ ایک دن کے لئے وہ لندن میں ٹھہر جاتی۔

چنانچہ شام کو ساڑھے چھ بجے کے قریب مارگرٹ آئی۔ نعیم کے گال کو اس طرح چوما جیسے انگریز بہنیں اپنے بھائیوں کو چومتی ہیں۔

"اچھا ہوا مجھے جیمز کی چٹھی مل گئی۔ ورنہ میں کہیں چلا جاتا۔"

"صرف تم سے نہ ملنے کا افسوس ہوتا نعیم" مارگرٹ نے کہا "مگر میں وکٹوریہ اسٹیشن تو بہر حال پہنچ ہی جاتی"۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

"اپنا سامان تو میں نے اسٹیشن پر رکھ دیا ہے"۔ مارگرٹ نے کہا "چلو پہلے تو ذرا پکاڈلی میں مجمع کو دیکھیں، پھر کہیں کھانا کھائیں، پھر تم مجھے وکٹوریہ پہنچا دینا"۔

ساڑھے سات بجے کھانا کھانے نعیم مارگرٹ کو لے کے میکسم کے چینی ریستوران

کی طرف چلا۔ راستے میں ایک جرمن فلم "آلمن کہ سے بگ" کا اشتہار دیکھ کے مارگرٹ ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ابتدائے شباب کی تازگی تھی۔

"میں ایک مدت سے یہ فلم دیکھنا چاہتی تھی۔" مارگرٹ نے کہا۔

"بہرحال اب تو وقت نہیں" نعیم نے کہا۔ "نو بجے تمہاری گاڑی جاتی ہے۔"

"اس لمبے چوڑے سفر سے مجھے نفرت ہے۔ چلو یہ فلم تو دیکھ لیں۔ ریل کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے میں نکل آؤں گی۔"

"اور کھانا؟"

"ریل میں کھالوں گی۔ تم کو البتہ تکلیف ہو گی۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ لیکن یہ سوچ لو کہ اگر ریل چھوٹ گئی تو لندن میں آج کہیں رات گزارنے کو بھی جگہ نہ ملے گی۔ کل ہی ناچ پارٹی کا دن ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ اس مجمع کی طرح میں بھی ٹہل ٹہل کے ساری رات گزار دوں گی۔ اور پانی تو برسے گا نہیں۔ موسم کے ماہرین اس کی پیشین گوئی کر چکے ہیں۔"

"جیسی تمہاری خوشی۔"

لیکن فلم ختم ہوتے ہوتے ساڑھے نو بج گئے۔ فلم بہت دلچسپ تھا۔ نو کے قریب نعیم نے یاد بھی دلایا تو مارگرٹ نے کہا "اس منحوس گاڑی سے مجھے نفرت ہے۔ کل صبح پیرس چلی جاؤں گی۔"

سنیما سے باہر نکلے تو مارگرٹ کو بڑی بھوک لگی تھی۔ اس نے نعیم سے کہا "کسی چھوٹے سے اچھے ریستوران میں چلو۔ بڑے ریستوران میں تو مجھ سے پیٹ بھر کے کھایا بھی نہیں جاتا۔"

رسل اسکوائر میں ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ بمشکل نعیم مارگرٹ کو وہاں تک لایا۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ رسل اسکوائر میں تازہ تازہ کٹ لٹ کھا کے اور گرم کافی پی کے دونوں ذرا تازہ دم ہوئے۔

"چلو اب تمہارے لئے کوئی کمرہ وغیرہ ڈھونڈھا جائے۔" نعیم نے کہا۔

ہر بڑا چھوٹا ہوٹل، ہر بورڈنگ ہاؤس، ہر گھر بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اگر لندن کی آبادی دگنی ہو گئی ہو تو تعجب کا مقام نہیں۔ تقریباً سارا انگلستان اپنے بادشاہ کی تاج پوشی دیکھنے کے لئے اُلٹ پڑا تھا اور دنیا کے ہر حصے سے لوگ آئے تھے۔ لندن کی شان تھی جو نہ اس سے پہلے کبھی بغداد کو نصیب ہوئی نہ قاہرہ کو، نہ روم الکبریٰ کو اور نہ عینٹ پیٹرس برگ کو۔ بھلا کوئی کمرہ کیا ملتا۔

اسی تلاش میں ساڑھے بارہ بج گئے ... مارگرٹ تھک کے بالکل چور ہو گئی۔ ایک مکان کے کٹہرے کا سہارا لگا کے وہ یوں کھڑی ہو گئی گویا اب نیند کے مارے گرنے ہی والی تھی۔

"کاش کراکسلے کا فلیٹ ہی خالی ہوتا۔ مگر وہ تو اسے بالکل ہی چھوڑ گیا۔" نعیم نے کہا "اب ایک ہی صورت ہے۔ تم میرے یہاں چلو۔ میرا فلیٹ تمہاری نذر ہے۔"

"اور تم؟"

"میں رات بھر باہر پھرتا رہوں گا۔"

"بس چپ رہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تو پھر اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔" نعیم نے پوچھا۔

"تم بھی اپنے فلیٹ میں ٹھہر سکتے ہو۔" مارگرٹ نے ہنس کے کہا "میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی ... ڈیئر سے کہوں گی کہ نعیم مجھ سے اس قدر ڈرتے تھے گویا میں انہیں خراب کر دوں گی۔"

نعیم کو مارگرٹ کی یہ چھیڑ اچھی معلوم ہوئی۔ وہ ہنسا اور کہا یہ میرے کمرے میں دو پلنگ ہیں۔ ان کے علاوہ میں ڈریسنگ روم میں بھی رات گزار سکتا ہوں۔"

"ایک لمحے کے بعد میں نیند کے مارے گر ہی پڑوں گی۔" مارگرٹ نے کہا اور اس کا شباب سے دمکتا ہوا چہرہ رات کے دھندلکے میں بڑا ہی دلکش معلوم ہوا۔ "چلو!"

اپنا ایک سلیپنگ سوٹ اور ایک ڈریسنگ گون اس نے مارگرٹ کے حوالے کیا اور خود ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ جب وہ دروازہ کھٹکھٹا کے دوبارہ اندر آیا تو مارگرٹ عجب مضحکہ خیز انداز سے اپنے آپ کو ڈریسنگ گون میں لپیٹے آتشدان کے قریب دراز تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کے نعیم کو دکھایا۔ قمیص کی آستینیں اس کی انگلیوں سے بھی دو چار انگل بڑی تھیں اور لٹک رہی تھیں۔ ہنستے میں اس کے دانتوں کی چمک، اس کے سیاہ بالوں کی آب و تاب اور اس کے چہرے کی تازگی سے اس مضحکہ خیز لباس کا سارا اثر زائل ہو جاتا تھا۔

"کیوں تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے؟" نعیم نے مسکرا کے کہا۔

"تھوڑی دیر بیٹھ کے باتیں کریں۔" مارگرٹ نے جواب دیا۔ "یہ عجیب و غریب احساس ہے۔ ایک رنگ والے نوجوان کے ساتھ، ایک سفید لڑکی ساری رات گزار رہی ہے۔ کرنل بلیپ کو معلوم ہو جائے تو کیا غضب ہو۔"

"تم کو بھی کبھی ہم کالے رنگ والوں سے نفرت رہی ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

"والدہ کو بہت تھی اور انھوں نے مجھے بھی یہی سکھایا تھا۔ سفید آدمی کا بوجھ وغیرہ وغیرہ مگر جیمز ہمیشہ ان سے لڑتا رہا۔ جیمز کی بین الاقوامیت قدرتی ہے۔ ہم لوگوں کی حاصل کی ہوئی۔ اور والدہ تو باوجود اس کے کہ تمہارا اتنا خیال کرتی ہیں، اب بھی اپنے تعصب پر غالب نہیں آ سکتیں۔"

"بیچاری مسز کراکسلے۔" نعیم نے کہا۔

دفعتاً مارگرٹ نے سنجیدہ ہو کے کہا "کسی رنگت والے آدمی اور سفید لڑکی کی اگر شادی ہو تو یہ حیاتی لحاظ سے مضر ہے نا؟"

"قطعاً نہیں تم نے جولین ہکسلے کی کتابیں پڑھی ہیں؟ ... تم کو معلوم ہے کہ کوئی نسل خالص نہیں۔"

"اور تم ہندوستانی تو ہم لوگوں سے بہت قریب ہو۔ ہاں چینی اور حبشی ذرا مختلف ہیں۔"

"یہ بھی تمہاری جہالت ہے مارگرٹ چینی اور حبشی بھی تمہارے ہی جیسے انسان ہیں۔ پال روبسن کی رگوں میں بھی شاید تھوڑا بہت سفید خون ہے۔"

مارگرٹ نے چند سیکنڈ کے بعد پھر اسی سنجیدگی سے پوچھا "تم کو بیری سے محبت تھی؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھ سے جیمز نے کہا تھا۔"

"ہاں کسی قدر محبت تھی تو سہی۔"

"مگر تم کو ایلس سے محبت تھی میں تو سمجھتی تھی کہ ایک سے زیادہ مرتبہ سچی محبت ممکن نہیں۔"

نعیم نے مسکرا کے کہا "میری پیاری لڑکی یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ مجھے سچی محبت کسی کے ساتھ ہوئی بھی یا نہیں۔ شاید مجھ میں سچی محبت کی صلاحیت ہی نہیں۔ مگر اب تک اپنی زندگی میں جن لڑکیاں مجھے ایسی ملیں جن کی وجہ سے میں کئی راتوں نہیں سویا۔ کئی دن پریشان رہا اور سمجھتا رہا کہ ان کا حاصل کر لینا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔"

"ایک ایلس، دوسری بیری اور تیسری کون تھی؟"

"تیسری ایک ہندوستانی لڑکی تھی۔ میری چچا زاد بہن۔ اس کا نام بلقیس تھا۔"

"اسے بھی تم سے محبت تھی؟"

"غالباً نہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"تو اب ہندوستان واپس ہو کے تم پھر اس سے محبت کر سکتے ہو۔ یا اب تمہیں صرف سفید عورتیں پسند ہیں؟"

"اس کا تو مجھے اقبال کرنا پڑے گا۔ مجھے سفید عورتیں زیادہ پسند ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں اور کوئی نہ کوئی مل جائے گی۔ مگر میری کی وجہ سے تمہیں بہت رنج ہوا۔"

"بہت زیادہ تو نہیں۔ ایلیس کی مرتبہ مجھے بہت رنج ہوا تھا۔ اس کے بعد میں اپنی زندگی کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ بے مقصد زندگی جیسے متوسط طبقے کے تمام نوجوانوں کی ہوتی ہے محنت روپیہ کے لئے، محبت کسی لڑکی کو بیوی بنانے کے لئے۔ اور روپیہ اور بیوی مل جانے کے بعد گھریلو زندگی۔ ہم متوسط طبقے والے وہی کام کس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں جیسے کیڑے مکوڑے، کتے، گائے، بھینس سب کرتے ہیں۔ افزائش نسل۔ اب میں اپنی گذشتہ چند سال کی زندگی دیکھتا ہوں اور پھر اپنے استقبال کو دیکھتا ہوں تو بجز احساس محرومی، احساس شکست، بجز رکاوٹ کے احساس کے اور کچھ نہیں۔"

"لیکن تم اپنی زندگی میں تو کامیاب رہے ہو۔"

"اسی کامیابی نے تو زندگی کو اس قدر بے مقصد اور بے مصرف بنا دیا ہے لیکن میری پیاری بچی تم میری بک بک سے تھک گئی ہو گی۔"

"خدا کے لیے مجھے پیاری بچی مت کہو۔ گویا میری عمر سال بھر کی ہے۔ جیرنگ تو مجھے عورت سمجھتا ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ابھی تک ننھی سی بچی ہوں۔"

"مارگرٹ خفا کیوں ہوتی ہو۔ تم بے شک بڑی خوبصورت نوجوان لڑکی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی۔ پھر اس نے پوچھا "کیا تمہارے خیال میں میں سچ مچ خوبصورت ہوں؟"

"یقیناً" نعیم نے ہنس کے کہا۔

"کیسے ؟"

"کیسے کیا ؟"

"یعنی میری کیا چیز خوبصورت ہے ؟"

"ٹھہرو۔ میں بتاؤں۔ تمہارے بال سیاہ چمکتے ہوئے ہیں اور تمہاری شفاف جلد پر کھلتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بھوری ہیں، تمہارے دانت ہموار، شفاف اور چمکدار ہیں تم ابھی کم سن ہو اور تمہارے چہرے پر بڑی شگفتگی ہے۔ تمہارا لہجہ بڑا شیریں ہے۔ بس کہ اور تعریف کروں ؟ اب جاؤ اس پلنگ پر سو جاؤ۔ یہ دوسرا پلنگ میرے سے ہے اور ڈرنا نہیں، دونوں پلنگوں کے درمیان آٹھ فٹ کا راستہ حائل ہے۔"

"شب بخیر نعیم" کہتی ہوئی مارگرٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ شب خوابی کے لباس میں الجھی نعیم نے اسے سنبھال لیا۔

"ٹھہرو" اس نے ہنس کے نعیم سے کہا۔ اس کی نوجوان آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "مجھے شب بخیر کہنے کا بوسہ تو دو۔"

نعیم نے اس کی پیشانی کو چومنا چاہا۔ مگر سرکشی کر کے اس کے لب نعیم کے سامنے آگئے۔ سُرخ نوجوان لب نعیم کی سراسیگی پر مارگرٹ کی نوجوان آنکھیں شوخی سے مسکرانے لگیں اور اس کے لب نعیم کے اور قریب آگئے۔ اس قدر قریب کہ ایک لحظہ کے اندر دونوں کے لب ایک طلسمی قوت سے ایک دوسرے کے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ لحظہ بھر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ مارگرٹ اس کی آغوش میں ہے۔ اس کے سینے کے مقابل مارگرٹ کا جوان رسال سینہ تھا اور مارگرٹ کی گرم گرم سانس اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔

دفعتاً اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ "مارگرٹ! معاف کرنا۔ تم میرے دوست کی

بہن ہو۔ تمہارا جسم میرے لئے مقدس ہے۔"
"مگر کیوں۔ کیا تمہارے ملک میں دوستوں کی بہنیں حرام ہوتی ہیں؟"
"لیکن مجھ پر اعتبار کر کے کراکسلے نے تمہیں یہاں بھیجا۔"
"تمہاری انہی باتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔ گویا میں بچہ ہوں اور اپنے بھائی کی ولایت میں ہوں۔"
"تم خفا کیوں ہوتی ہو مگر مارگرٹ تمہیں کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ ابھی تم بہت کم سن ہو۔"
"میں سترہ سال کی ہوں۔ معاف کرنا میں نہیں سمجھتی تھی کہ جسمانی حیثیت سے میں اتنی قابلِ نفرت ہوں۔ شب بخیر۔"
اس کا ہاتھ پکڑ کے نعیم نے کہا۔ "مارگرٹ! بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ تم انتہا درجے خوبصورت ہو۔ اگر تم کراکسلے کی بہن نہ ہوتیں تو میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا۔"
"اچھا خیر۔ خدا حافظ۔"
وہ اپنے پلنگ پر جا کے لیٹ رہی۔ نعیم نے اسے احتیاط سے کمبل اُڑھایا اور شب بخیر کہہ کے اس کا ہاتھ دبایا۔ پھر اپنے پلنگ کے قریب آ کے روشنی گل کی۔
آدھے گھنٹے کے قریب کروٹیں بدلتے بدلتے گذر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعیم کے سارے جسم میں کسی نے خون کے بجائے جلتا ہوا سیسہ پگھلا کے بہا دیا ہے۔ اس کی کنپٹیاں خون کی گرمی سے پھٹی جا رہی تھیں۔
بالآخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ وہ مارگرٹ کے پلنگ کی طرف بڑھا اور جھک کے مارگرٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں بھی اس نے دیکھا کہ مارگرٹ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ خوف سے؟

حیرت سے ؟ کشش سے ؟

اس نے آہستہ سے کہا "مارگرٹ !"

مارگرٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیوار کی طرف کھسک گئی اور نعیم کے لیے جگہ کر دی۔ نعیم بلانکٹ کے اندر آ گیا۔ بے تابی سے اس نے مارگرٹ کا بوسہ لیا۔ اس نے اپنے جسم کو مارگرٹ کے جسم سے لپٹتے محسوس کیا۔ مارگرٹ کے پستان چھوٹی چھوٹی اور فولاد کی سی سخت ناشپاتیوں کے سے تھے۔ اس کا ہاتھ اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر بھی مارگرٹ کی انگلیوں اور لانبے نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔

اور جب مارگرٹ کا سانس زور زور سے چل رہا تھا تو اس نے کہا "مارگرٹ ہم دونوں بوس و کنار سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ میں تمہارا کنوارپن اگر تم سے چھینوں گا تو ہمیشہ میرا دل مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے جیمز اور میری کا بدلہ تم سے لیا۔"

مارگرٹ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی شاید حد سے زیادہ نہ بڑھنا چاہتی تھی۔ انگریز لڑکی ہمیشہ ڈرتی ہے کہ کہیں سانولا بچہ پیدا ہوا تو کیا ہوگا ؟

اسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں رات گذر گئی اور صبح کی روشنی میں نعیم نے مارگرٹ کا عریاں جسم دیکھا جو کسی یونانی مجسّمے کی طرح خوبصورت تھا۔ رات بھر کے ضبط سے نعیم کے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے مگر اسے اس کی خوشی تھی کہ وہ اس امتحان سے کامیاب گذر چکا۔ اب اسے کرا کسلے سے یا اپنے ضمیر سے شرمانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

(۵)

جشنِ تاجپوشی کے دن صبح کو نہ مارگرٹ جلوس دیکھنے گئی نہ نعیم۔ بادشاہوں اور فوجوں کے

قطار در قطار جلوس کا حال دوسرے دن اخبارات میں شائع ہوا۔ صبح کو ناشتے کے بعد مارگرٹ نعیم کو بودلیر کے "بدی کے پھول" سناتی رہی اور پھر کلاودل اور لافورژ وغیرہ کا کلام۔ اسی بحث مباحثے میں کھانے کا وقت آگیا۔ بحث و مباحثہ اور شاعری اور بوس و کنار سے دونوں تھک گئے تھے اور شام کو نو بجے تک مارگرٹ کو کسی کوئی کام نہ تھا۔ لنچ ان دونوں نے برسل اسکوائر کے ایک زمین دوز تہ خانے والے ریستوران میں کھایا۔ ان کے علاوہ دو چار نیم اشترا کی خطرۂ اشتمالیت اور بھی وہاں تھے۔ ورنہ ہر طرف سناٹا تھا۔

اپنے فلیٹ میں واپس آکے نعیم نے مارگرٹ کے لئے بستر آراستہ کیا اور لے بلا محنت اٹھا کے اور شفقت سے اس کے لبوں کو چوم کے گھومنے کے لئے باہر چلا گیا۔ مارگرٹ کو نیند کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ریل میں اسے نیند نہیں آئی تھی اور آج کی رات ریل میں گذارنی تھی۔

لسٹر اسکوائر اور چیرنگ کراس روڈ پر مجمع کو دیکھتا ہوا نعیم ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس نے انگلستان کی اشتمالی جماعت کا اخبار "ڈیلی ورکر" خریدا اور تاجپوشی کے متعلق دست چپ کے ادیبوں کا لکھا ہوا ایک رسالہ۔ مجمع سے ہٹ کے وہ پھر خاموش گلیوں سے ہوتا ہوا، برنرڈ شا، تھمے لیرس، ہال ڈین، ہیری پالٹ کی رائیں ڈیلی ورکر میں پڑھتا ہوا "تاجپوشی کے متعلق ان سب کے خیالات سے متاثر ہوتا ہوا گھر پہنچا۔

— مارگرٹ منہ ہاتھ دھو کے چائے بنا رہی تھی۔ اس نے ایک گرم پیالی ایک بوسے کے ساتھ نعیم کے حوالے کی شام کو نعیم مارگرٹ کو وکٹوریہ اسٹیشن پہنچا آیا۔ بادشاہ کی تاجپوشی کی تقریب کی اور ڈیلی ورکر میں برنرڈ شا اور ہال ڈین کے بیانات پڑھتا ہوا سو گیا۔

(۶)

تمام امتحانات سے فارغ ہو کے نعیم اسکاٹ لینڈ چلا گیا۔ ۲۰ مئی کو میری اور جیمز کر اکیلے کی

شادی تھی۔ دونوں نے نعیم کو اس شادی میں بڑی گرم جوشی سے مدعو کیا تھا لیکن وہ اس میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لندن کے قیام کے دوران میں ایک بار سینٹ جیمز پیلیس میں اس نے ایک شادی کا کچھ منظر دیکھا تھا۔ وہ سڑک پر ٹیلیفون کے ڈبے کے پاس کھڑا تھا۔ صبح کا کوٹ پہنے لوگ شادی کی دعوتِ استقبال میں شریک ہو کے واپس آ رہے تھے اور بالآخر ایک موٹر پر دولہا دلہن تیزی سے نکلے ہنستے ہوئے۔ دلہن سفید لباس میں بڑی ہی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ موٹر کے پیچھے نیک شگون کے لئے ایک جوتا بندھا تھا۔ وہ "گل رخ" کو اس سفید ملبوسِ عروسی میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کسی اکیلے کے ساتھ اسی طرح موٹر میں ماہِ عسل کے لئے روانہ ہو اور موٹر کے پیچھے جوتا بندھا ہو۔

(۷)

۲۸ مئی کا لکھا ہوا ہروشا کا ایک خط اسے اڈنبرا میں ملا۔

"بخارسٹ۔ رومانیا ۲۸ مئی

محبی نعیم!

جس مقام سے میں یہ خط لکھ رہا ہوں اس کا نام پڑھ کے زیادہ متحیر نہ ہونا۔ میں برطانیہ عظمیٰ سے ذرا زیادہ فاصلے پر ہوں اور تمہارے ملک سے ذرا زیادہ نزدیک، مجھے افسوس ہے کہ میں چیکوسلاویکیا میں خود تمہارا استقبال نہ کر سکوں گا مگر اپنے دوستوں کو میں نے لکھ دیا ہے۔ یورپ کا سفر ضرور کرو۔ شاید تم یہاں بھی آسکو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں کی عورتیں بڑی لاجواب ہوتی ہیں۔ سیاہ بالوں والی اور گرم۔ مگر تم جانتے ہو کہ میرے لئے تو یہ بالکل بے کار ہیں۔ امید ہے کہ تم اپنے امتحانات میں کامیاب ہو گے۔

تمہارا مخلص دوست

نیدناک ہروشا"

چودھواں باب

آوارہ گردی

یولی سیز نے پھر سفر کا پرچم کھولا۔ جادوگرنیوں کے جزیروں کا رُخ کیا اور متلاطم سمندروں میں اپنی کشتی بڑھاتا چلا گیا۔ بڑلیپے کے ماحول سے گریز کرنے کے لئے پسندیدہ بادبانی کے بادبان پھر ہوا میں لہرائے۔ نئی اقدار کی تلاش کے لئے مارکو پولو کو پھر سیاحت کی تڑپ بیقرار کرنے لگی۔ یہ یورپ جو دیا سلائی کی طرح سُلگ اُٹھنے کو تھا ذرا دیکھا تو جانے کہ یہ ہے کیا۔ یہ کرا کیسلے اور ہیروشا کا یورپ۔ یہ یہ تھا اکسل سن اور میری باول کا یورپ۔ جس میں خودی موج بھی بن سکتی تھی، چٹان بھی، ابر بھی، طوفاں بھی۔

وہیلوں کی شاہراہ بیوولف کی آزمائی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کو روندتی ہوئی وائکنگ کشتیاں سر اٹھائے ہوئے کولمبس سے پہلے نئی دنیا کے ساحلوں تک پہنچیں۔ ناروے کا ساحل بڑا خوبصورت ہے۔ کہیں بھوری چٹانیں سمندر میں جزیرے اور جزیرہ نما اور خاکنائے بناتیں، کبھی سمندر اندر گھس کے

نہر یا جھیل یا دریا بن جاتا۔ زمین اور پانی کی ہزار ہا سال کی لڑائی کا اس سے اچھا نقشہ شاید ہی کہیں کھینچا گیا ہو۔

اور ناروے کے شہر بڑے خوبصورت ہیں۔ برگن پہاڑوں کی آغوش میں سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کی عمارتوں کا حسن، اس کی عورتوں کا ہاتھی دانت کا سا رنگ اور سنہرے بال، اس کے مردوں کے دراز قد پھر ناروے کا سفر ناروے کے پہاڑ جیسے ریڑھ کی ہڈی ہر قلوی میں ایک چھوٹی سی جھیل۔ پہاڑ بحر کھورے سرد ہیبت ناک اور خوبصورت۔

اور ایک جھیل میں نعیم نے آنکھیں مل کے دیکھا تو اسے ملفقس کی تصویر نظر آئی۔ معلوم نہیں کیسے دنوں سے یہ تصویر عشق کے شعور نامحسوس میں چھپی ہوئی تھی۔ اسے خود حیرت ہوئی۔ کہاں روس کی اس جھیل کا شفاف پانی اور کہاں ملفقس کی تصویر۔

اوسلو۔ اور سب شہروں کی طرح جدید اور پاک صاف اور با رونق، پاجامے پہنے ہنستی اور دوڑتی ہوئی لڑکیاں۔ اس قدر نسوانی حسن، نیلی آنکھیں اور سنہری بال۔

اور دراَمن۔ پہاڑ سے اس ندی کا نظارہ جو قصبے سے ہو کر گذرتی ہے فیورڈ گستاخ سمندر کا بحرہ جو خشکی میں اتنی دور گھس آیا ہے۔ اور دراَمن ہی میں اسی پہاڑ پر جنوبی افریقہ کے رہنے والے اگر بزلاٹ کے نے ہمدردی کے لہجے میں کہا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے سخت تعصب برتا جاتا ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ مگر رات نہیں آئی تھی۔ صرف شام کا دھندلکا تھا۔ ناروے کے بہت سے حصوں میں دن رخصت ہی نہیں ہوتا۔ یہاں دن تو رخصت ہو گیا تھا۔ شام آئی بھی مگر رات نہ آنے پائی۔ جب قطب شمالی سے برف کی سانس بڑھتے بڑھتے یہاں آئے گی تو شاید دن کے بارہ بجے بھی شام ہی رہے گی۔

اور اسٹوک ہولم۔ یہ تھا اکسل سن کا وطن۔ لوسوں کے وقت اس کے سنہرے بال نعیم کی

پیشانی اور کانوں کو ریشم کی طرح نرم معلوم ہوتے تھے۔ یہ استنبول ہوٹل، یہ سات جزیروں والا شہر دنیا کے حسین ترین شہروں کا تاجدار۔ جہاں جھیلیں سمندر سے ملتی ہیں۔ جہاں پل جزیروں کو جزیرہ نما بناتے ہیں جہاں انوکھے طور پر بجے ہوئے قہوہ خانوں میں حسین لڑکیاں خادماؤں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہتی ہیں اور اجنبیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتیں۔ اس قہوہ خانے میں فرنیچر بھی سرخ تھا اور دیواریں بھی سرخ اور خادماؤں کا لباس بھی سرخ تھا۔

اسی استنبول ہوٹل میں ایک پناہ گزین یہودی تھا جو جرمنی، آسٹریا، چیکوسلاویکیا کا رہنے والا۔ مسلمان کے متعلق اقبال نے لکھا ہے۔ گھر برانہ دلی نہ بخارا نہ سمرقند۔ کاش مسلمان بھی اسی طرح ہر شہر میں کچھ جائداد پیدا کر لیتا۔

ساتھ ٹہلتے ٹہلتے اس ساٹھ سال کے تجربہ کار عالم، سیاس یہودی نے کہا "یہ دنیا سمندر کی تہہ میں جا بیٹھے گی۔" استنبول ہوٹل پر بڑی آب و تاب سے سورج چمک رہا تھا۔ اسکالسن سے نہر کے پلوں کا نظارہ دلفریب تھا۔ بوڑھے یہودی نے پھر وہی رٹ لگائی "یہ دنیا سمندر کی تہہ میں جا بیٹھے گی۔" کیا جب آفتاب گرم ہو جائے گا تو استنبول ہوٹل کو بھی آگ لگ جائے گی، فاشزم، نوجی اشتراکیت، جمہوریت، بین الاقوامیت، ایٹم، ہوائی جہاز، آئس سپال۔ یہ کیا لطیفہ ہے کہ مغرب میں آئس سپال شراب کو کہتے ہیں۔ "ہم ہندوستان میں رہنے والے ہم لوگ اس قدر زیادہ متاثر ہو گئے مگر ہم لوگ تو یورپ میں ہیں۔ سمندر کے قلب میں۔" کیا فلک کی حرکت بند ہو جائے گی؟ خدا کرے ایسا ہو۔ مگر کیا اس کے بعد ماسکو اور حیدرآباد کی بس چلتی رہے گی؟ نعیم اپنے دل میں سوچنے لگا اور پھر بوڑھے یہودی نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا "یہ دنیا سمندر کی تہہ میں جا بیٹھے گی۔"

پھر استنبول ہوٹل میں آدھی رات کو ایک ایکٹرس کے چھوٹے چھوٹے پستان اور بے لطف بوسے۔ اور ایک نرگس جس نے جھیلوں کی سیر تو کرائی مگر ایک بوسہ تک نہ دیا۔ وہ دکان جہاں

کسی زمانے میں گریٹا گاربو نے کہا تھی ہندوستانی بادشاہوں کی قبریں۔ گستاف ثانی کا بنایا ہوا ایک تھیٹر۔ اس بادشاہ کو بجوکی رعایا نے مار ڈالا تھا۔ جھیل کے کنارے اب بھی یہ تھیٹر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں حسن ہمیشہ سرمایہ داری کی طرفداری کیوں کرتا ہے۔

کوپن ہیگن یا کاس ہاون جہاں سمندر کے کنارے ایک سیاہ جل پری بیٹھی دور دراز کے سمندباز بانوں کو دیکھتی رہتی ہے۔

(۲)

بلجیم جیسے ایک جنگ سے تباہ کردیا تھا اسٹراسبرگ یا آلندرس۔ ایک دو سٹرکوں کے سوا کچھ نہیں۔ لڑکیوں کے ہلکے زرد بال، ایک نائٹ کلب، ایک عکس مانندی مزدور لڑکی نفلی فلش اسیل سائے میں، ناچتے ہوئے اس نے نعیم سے کہا جو خاموشی اور لاپروائی سے اس کے ساتھ ناچ رہا تھا یہ واہ سیرا کیا شان استغنا ہے۔"

(۳)

هربل۔ اور عروس البلاد پیرس بین الاقوامی نمائش جس میں قداروں کی پھلجھڑیاں۔ ہر ملک کا نمائش خانہ۔ اس ملک کی سیاحت کے لئے ایک اشتہار روس اور جرمنی کے نمائش خانے آمنے سامنے، ملند اور شاندار روس کی نمائش گاہ پر ایک مرد اور ایک عورت درانتی اور ہتھوڑا لئے ہوئے۔ مقابل کے جرمن نمائش خانے پر جرمن عقاب ایک شان بے نیازی سے گردن موڑے ہوئے اور جرمن نمائش خانے کے اندر گویا در و دیوار سے ابلتی ہوئی فوجی موسیقی۔ لوڑھے کھوری نے تو کہا ہی تھا کہ "یہ دنیا سمندر کی تہ میں جا بیٹھے گی۔"

(۴)

ڈاکٹر راجندر کے ساتھ سفر۔ وہ اپنی موٹر یورپ بھر پھرا کے ہندوستان لے جانا چاہتے تھے۔

پہلے دن پیرس سے سواسون۔ فوجی قبرستان اور الگزنڈر ڈوما کا مکان۔

صبح سے لے کے ڈیڑھ بجے تک بروسلز کی سیر۔ سوائے عجائب خانوں، تصویروں اور مجسموں کے اس شہر میں ہے ہی کیا۔ غلیظ سڑکیں، ناخوشگوار صورتیں اور لاٹریاں۔ پھر انٹورپ۔ ولندیزی سرحد۔ ہالینڈ کے میدان، پانی، پھول، سڑکیں اور یورپ بھر میں سب سے زیادہ خوشنما مکانات، دلاویزی مناظر۔ ہوا سے چلنے والی چکیاں۔ سمندر پر پل۔ ایشیائیوں سے کچھ کچھ تعصب۔ بوزخت اور جرمن سرحد۔

(۵)

ڈوسل دورف۔ بون۔ بیتھوون کی پیدائش گاہ۔ اور بون کا مشہور و معروف منظر، اواخر جولائی میں دریائے رائن کا جوبن، کوبلنتس، جہاں دو ندیاں ملتی ہیں، جہاں کا قلعہ رائن کے تمام قلعوں کا سرتاج ہے اور جہاں کے کشتیوں کے پل کے منظر کو آنکھ ایک بار دیکھ لے تو دل کبھی نہیں بھول سکتا۔ رات سینٹ گوار میں۔ پھر اسی لڑکی سے ملاقات جس نے اس سے پہلے سفر میں کراکسلے کے لئے بڑا ماجرمن گیت گایا تھا۔

ہیڈل برگ۔ روزا۔ روزا کے ساتھ ہٹلر کی بنائی ہوئی ورزش گاہ پہاڑوں اور آہستہ خرام نیکر کے اس پس منظر میں کتنی ٹھنڈی معلوم ہوتی ہے لیکن روزا کی کمر میں ہاتھ حائل کر کے کسی پہاڑی راستے پر اسے اپنی طرف کھینچو تو اس کی گرم سانس میں اور پہاڑ کے صنوبروں کی ٹھنڈی سانس میں کتنا فرق معلوم ہوتا ہے۔

بادن بادن میں امیر مریضوں کا ہجوم۔ گھوڑوں پر خوبصورت فیشن ایبل لڑکیاں۔ ایک گھوڑا لڑکھڑایا تو نعیم نے مسکرا کے کہا "ہاں سیاں رہو ہشیار، مدموزیل" وہ مسکرا کے آگے بڑھ گئی۔

سیاہ جنگل۔ شوارتس والڈ۔ صنوبروں اور پہاڑی درختوں میں بل کھاتی ہوئی خطرناک موڑوں سے گذرتی ہوئی سڑک۔ فرائی برگ کی یونیورسٹی میں تعطیلات کے کورس کے لئے انگریز طالب علموں کی کثرت۔ ٹی ٹی ندی کے کنارے چائے۔ لڈوگس ہافن سے بوڈن ندی کا نظارہ۔ یہ بڑی سی پہاڑوں سے بھری نیم خوبصورت جھیل، جہاں تین ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ فریڈرِش ہافن میں زیپلن کا کارخانہ۔ لنڈاؤ کی گلیاں اُلم سے بھی زیادہ نم اور سرد۔

ہوہن شاون کا قلعہ اور ششی ندی کے کنارے دوپہر کا کھانا۔ یوبربامیں پہاڑوں سے میدان کی طرف اتار۔ میونشن سے پہلے اشتارن برگر ندی جس کو نعیم محض اس لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے "خراب آباد" میں اس کا ذکر کیا ہے کہ لڑکیاں اس جھیل میں نہا رہی تھیں۔

میونشن۔ انگولشٹاٹ میں نیلی ڈینیوب کا رنگ مٹیالا ہے۔ نیورن برگ قرونِ وسطیٰ کی محفوظ یادگار۔ قرونِ وسطیٰ کے جیسے مکانات، کلیسا اور بازار۔ نازی جرمنی کی رہنمائیت کا مرکز۔

رات۔ بارش۔ کہر۔ کہر سیمنٹ کی سڑک پر اُمنڈ اُمنڈ کر آتی تھی اور موٹر کی روشنی میں چمکنے لگتی۔ اس طرح واگنر کے مولود و مسکن بے رایت پہنچے۔

چھوٹا سا خوبصورت بویریائی قصبہ۔ مکان، سڑک، مجسمے سب بویریائی تمدن کی یادگار اور ان میں سب سے ممتاز واگنر کا مکان۔

ہٹلر کی بنائی ہوئی سڑکیں۔ راشٹس آٹو بان۔ سیمنٹ کی سفید، عریض، مسطح فوجی سڑکیں، میدانوں، غیر دلچسپ منظروں سے گذرتی ہوئی۔ مگر آنے کی سڑک، الگ، جانے کی الگ، ساٹھ میل سے کم رفتار سے جانے میں کوئی لطف نہیں۔ ڈاکٹر راجندر، لائپزگ پہنچے پہنچے چور چور ہو گئے۔

اور لائپزگ۔ معلوم نہیں امریکہ کا یہ چھوٹا سا شہر کس نے جرمنی میں لاکے رکھ دیا۔ جدید اور

غیر دلچسپ۔

برلن میں ایک ہفتہ۔

پوٹس دام میں قصر سان سوسی۔ والٹیر کا کمرہ۔ فریڈرک اعظم اور والٹیر کی دوستی کی یادگار۔ اس کمرہ کی دیواروں کی نقاشی۔ پوٹس دام کے باغ خوب صورت ہیں اور دوشیزائیں ان سے زیادہ خوبصورت۔

(۶)

لیکن برلن سے وریسیدن جاتے ہوئے سڑک پر ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔

ڈاکٹر راجندر موٹر چلاتے چلاتے تھک گئے تھے۔ ایک گاؤں سے کوئی دو میل آگے انہوں نے موٹر روکی۔ قریب ہی سڑک کا ایک بڑا موڑ تھا۔ ایک کھیت میں جو بالکل ویران سا تھا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے ڈاکٹر راجندر اور نعیم باتیں کرنے لگے۔ قریب ہی ایک گھوڑے کی لید پڑی تھی۔ راجندر نے سمجھانا شروع کیا۔ ٹائی ٹنس کے جراثیم اکثر گھوڑے کی لید میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک قصہ بیان کیا کہ لکھنؤ میں ایک لڑکے کی ٹائی ٹنس سے بری حالت تھی اور انہوں نے کس طرح اس کا علاج کیا۔ پیچھے سڑک پر سے موٹریں گذر رہی تھیں۔ زیادہ تر جرمنی کی موٹریں لیکن گاہے گاہے چیکوسلاویکیا کی، پولینڈ کی، آسٹریا کی، برطانیہ عظمیٰ کی اور فرانس کی موٹریں بھی۔

وہ کھیت سے اپنی موٹر کی طرف آ ہی رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی بائی موٹر سائیکل پر سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ موڑ پر تیزی کی وجہ سے وہ اپنے موٹر سائیکل کو سنبھال نہ سکی۔ موٹر سائیکل پہلے ایک درخت سے ٹکرائی، پھر دوسرے درخت سے، اور پھر لڑکی اس میں الجھ کے گر پڑی۔ راجندر اور نعیم دوڑ کے قریب گئے تو عجیب منظر

دیکھا۔ موٹر سائیکل اس لڑکی کی دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ راجندر نے اسے ہٹایا تو ایک ٹانگ بالکل قیمہ تھی۔ لڑکی بے ہوش پڑی تھی اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

انگریز سیاحوں کی ایک گاڑی پیچھے آرہی تھی انھوں نے گاڑی روک لی۔ ان کے پاس فوری طبی امداد کا کچھ سامان تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر راجندر کی مدد بھی کی۔ لیکن لڑکی کا سانس اکھڑ چکا تھا۔

ایک موٹر جو اس موٹر سائیکل کے آگے آگے جا رہی تھی۔ اب واپس پلٹی۔ اس میں سے ایک نوجوان جرمن اترا جو موٹر سائیکل چلانے کے لباس میں تھا۔ راجندر نے نعیم سے کہا۔
"دیکھو اس لڑکی کے ہاتھ میں نسبت کی انگوٹھی ہے۔ غالباً وہ اس نوجوان سے منسوب تھی۔ ضد کر کے موٹر سائیکل پر سوار ہوئی۔ حالانکہ وہ معمولی ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔"

اس سے پہلے نعیم نے کسی عورت کو اس طرح خاک اور خون میں آلودہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس درمیان میں اس جرمن نوجوان کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دو بار اس درد سے کراہا کہ نعیم نے پلٹ کے اسے سمجھایا کہ ڈاکٹر راجندر اچھے خاصے ڈاکٹر ہیں۔ جو امکان میں ہوگا کریں گے۔

مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اس اثنا میں لڑکی پر موت کی زردی چھا گئی۔ گاؤں سے پولیس کا آدمی اور ایک ڈاکٹر بھی آگیا۔ جرمن ڈاکٹر نے اس لڑکی کے قلب کا معائنہ کیا۔ وہ مر چکی تھی۔

جرمن نوجوان کی حالت کچھ عجیب مجنونوں کی سی ہو گئی۔ وہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ ممکن ہے وہ اور یہ لڑکی دونوں ویسڈن شادی کرنے کے لئے جا رہے تھے۔

لوگ اسے سنبھالنے لگے۔ راجندر نے نعیم سے کہا "یہ معلوم نہیں اب ہمیں کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے"۔ لیکن پولیس کا آدمی اس عرصے میں حادثے کی تمام کیفیت کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر راجندر کا شکریہ ادا کرکے کہا "اب آپ لوگوں کو ٹھہرنے کی ضرورت نہیں"۔

اس حادثے کی ہیبت نعیم پر دن بھر، رات بھر طاری رہی۔ زندگی کا ایک اصلی، غیر معمولی واقعہ، اور تمام افسانوی نقوش باطل معلوم ہونے لگے۔ یہ زندگی کا ڈرامہ تھا۔ ایک منٹ کے اندر انسانی جسم کی شکست، چند لمحوں میں موت۔ یہ تھا اکسل سن کی ہرجائی نگاہوں، ایلیس کی وفا اور بے وفائی، بلقیس کے متعلق شاعرانہ تخیلات، پیری پاول کے عشق، کراکسلے اور ہیروشا کی دوستی، خانم کی دنیا۔ اری سب کھیل تھے۔ مگر قدرت کے اس معمولی کھیل کے سامنے ہیچ۔ ایک سواری سنبھل نہ سکی، اور جوشِ حرکتِ حیات ہمیشہ کے لئے خاموش۔ اور زندگی کی ساری دلچسپیاں کیا ہیں؟ اس خاموشی اور اس خاتمے کو بھول جانے کی ناکام کوششیں۔ تمام عشق محض افزائشِ نسل اور افزائشِ نسل بالانجام فنا۔ انسان جب اپنے آپ کو حیوان سمجھنے سے انکار کرتا ہے موت اسے سمجھا دیتی ہے۔

وریسدن کا حسنِ فراواں بھی اس ہیبت کو زیادہ نہ گھٹا سکا جو اس حادثے کو اپنے سامنے پیش آتے دیکھ کے نعیم کے دل پر طاری ہوگئی تھی۔ رات بے چینی سے گذری۔

(۷)

دریائے ایلب سے وریسدن بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ تعمیر میں بڑی خوش مذاقی اور تناسب سے کام لیا گیا ہے۔ تسوینگر گیلری میں امریکنوں کا ہجوم تھا۔ رافائیل کی وریسدن

میڈونا (مریم) اتنی ہی خوبصورت نکلی، جتنی نعیم کو امید تھی۔ اس میں اندریا دل سارتو کی کچھ تصویریں نعیم کو بہت پسند آئیں۔

دوپہر کا کھانا کھا کے دونوں دوست پراگ روانہ ہوئے چیکوسلاویکیا کی سرحد پر کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ سرحد کی سودتیان پہاڑیوں پر سڑک بہت خراب تھی۔ اس کی وجہ نعیم کو پراگ پہنچ کے معلوم ہوئی۔ چیکوسلاویکیا کو جرمنی کے حملے کا سخت اندیشہ تھا۔ اسی لئے سرحد کے قریب سڑکیں اس حالت میں رکھی گئی تھیں کہ دشمن کو نقل وحمل میں دقت ہو۔

پراگ کا پہلا منظر ذرا مایوس کن تھا۔ ایک عامیانہ سا شہر۔ صرف ایک سڑک ذرا خوبصورت تھی۔ لوگ جرمنی کے مقابل بھُوکے معلوم ہوتے تھے۔

ہروشا کے پراگ میں نہ ہونے کا نعیم کو بڑا احساس تھا۔ لیکن ہروشا کی ایک دوست اولگا ہرے بک، جس کے نام کا تلفظ صحیح طور پر ادا کرنے میں نعیم کو کبھی کامیابی نہ ہو سکی۔ دوسرے دن صبح کے نو بجے نعیم کو شہر کی سیر کرانے لگی۔ ندی کا پل خوبصورت تھا۔ قلعے کے قریب ایک چھوٹا سا کلیسا ہے۔ جس کے متعلق یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسےٰ کے مکان کی نقل ہے۔ قلعہ بھی اچھا خاصا خوبصورت ہے اور واپسی میں اولگا نے پراگ کی گلیاں اور چھوٹے چھوٹے مکانات دکھائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بڑے شہروں کی بڑی بڑی سڑکوں اور عمارتوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ لیکن ہر گلی میں بڑی انفرادیت، بڑا انوکھا پن ہوتا ہے۔

دوپہر کا کھانا نعیم نے ہروشا کے والد کے یہاں کھایا۔

کھانے پر اور بھی مہمان تھے۔ کون؟ میری پاول جو اب مسز کرا کسلے بن چکی تھی، اور جیمز کرا کسلے۔ یہ دونوں ماہ عسل گذارنے یہاں آئے تھے اور ہروشا کے گھر مہمان تھے۔

نعیم پر ایک جنون سا طاری ہونے لگا۔ باوجود میری اور جیمز کے انتہائی التفات کے وہ ان سے دُور، بہت دُور بھاگنا چاہتا تھا۔ گویا انہوں نے اسے دھوکا دیا تھا۔
چائے اس نے اولگا کے ساتھ ایک ایسے قہوہ خانے میں پی جو ایک بہت بلند چٹان پر ندی کے کنارے واقع ہے۔ اور جہاں سے ندی کا منظر بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اولگا چیکوسلاویکیا کے سیاسی حالات سمجھانے لگی۔ وہ خود سلوواک تھی لیکن ایک سوڈے تن جرمن سے اسے عشق تھا۔ اس نے کہا "اس لئے میں جرمنوں کے خلاف زیادہ نہیں کہہ سکتی"۔ لیکن اسے بھی جرمن حملے کا اندیشہ تھا۔ سوڈے تن جرمن ابھی سے آہستہ آہستہ منظم ہو رہے تھے، اور اگرچہ ابھی تک ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ لیکن جرمنی برابر چیکوسلاویکیا کی جرمن آبادیوں میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا۔ اولگا نے برسبیل تذکرہ کہا کہ پراگ کو دراصل جرمنوں ہی نے فروغ دیا ہے۔ اور یہاں کی جرمن بولی بڑی خالص سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ اب سب لوگ چیک زبان ہی میں بات کرتے ہیں اور جرمن زبان کو پسند نہیں کرتے۔

پراگ میں ڈاکٹر راجندر کو گرٹروڈ بیم سن مل گئی۔ غازی الدین کی پسندیدہ دوست۔ وہ رات کو اسے کسی رقص گاہ میں لے گئے۔ صبح کو نعیم کو معلوم ہوا کہ وہ بھی ان دونوں کے ساتھ وی آنا چل رہی ہے۔

سفر بڑا دلچسپ رہا۔ گرٹروڈ سامنے کی نشست پر راجندر اور نعیم کے درمیان بیٹھی۔ راستے میں کئی جگہ رک رک کے ان لوگوں نے تصویریں لیں۔ گرٹروڈ کبھی راجندر کی طرف زیادہ ملتفت ہوتی کبھی نعیم کی طرف۔ کبھی ایک کی کمر میں ہاتھ حمائل کرتی کبھی دوسرے کے ہاتھ میں۔ شام کو آسٹریا کی سرحد آئی۔ اور وی آنا پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ لیکن اس شہر کا پہلا منظر

ہی ایسا تھا کہ راجندر جن کو اس سفر نے شل کر دیا تھا، باغ باغ ہو گئے۔ وسط یورپ کی یہ ملکہ روشنیوں میں نہا رہی تھی۔

ایک چھوٹے سے ہوٹل میں یہ لوگ ٹھہرے کھانا کھایا۔ نعیم اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے باہر قدموں کی چاپ سُنی اور دیکھا کہ راجندر گرٹروڈ کے کمرے کی طرف جا رہا ہے۔ دروازہ کھلا اور وہ کمرے کے اندر غائب ہو گیا۔

(۸)

ڈاکٹر راہنبد نے اپنی راہ لی اور نعیم وی آنا میں ٹھہر رہا۔ یہ رقص اور موسیقی کا شہر۔ یہ عمارتوں اور عورتوں کے جمال و شباب کا شہر۔ نعیم کو ایک لحاظ سے یہ پیرس سے بھی زیادہ پسند آیا۔ اس کی نیم دائرے اور دائرے کی سی وسیع سڑکیں۔ اس کا کلیسا، اس کے کنارے پہاڑ، اس کے اطراف جنگل، اس کے متصل نیلی ڈینیوب۔ یہ شہر جہاں صدیوں تک ہاپس برگ شہنشاہوں نے اس شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کی جس کی فصیلوں تک دو بار ترکی فتوحات کا سیلاب آیا اور اُتر گیا۔ یہ وسط یورپ کا پیرس۔ یہ پیرس اور شیراز کا مجموعہ۔ یہاں کے باشندے خلیق۔ یہاں کی عورتیں حسین۔ یہاں کی موسیقی سحر آگیں اور لطیف۔

اب اس شہر پر زوال کا عالم تھا۔ ہاپس برگ خاندان کے ساتھ ساتھ اس کا شباب بھی چھن چکا تھا۔ نوجوانوں میں نازی رجحانات زور پکڑ رہے تھے۔ شادش ینگ کی حکومت نے نازی اور اشتراکی جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دیا تھا۔ مگر یونیورسٹی میں، فوج میں، ہر جگہ جتنے نوجوانوں سے نعیم ملا، زیادہ تر نازی تھے اور جرمنی سے اتحاد کے خواہاں۔

ایک مصوّر سے وہ ایک قہوہ خانہ میں ملا اور مصوّر نے نازی فلسفۂ حیات کی تائید میں اس

زور و شور سے بحث کی کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ اس پر بھی نعیم نانسی عقیدے کی مخالفت کرتا رہا تو اس نے کہا "اب میں آپ سے ایک بات کہوں۔ ہم لوگ بھی ہندوستانیوں کو بیچ اور کم اصل سمجھتے ہیں" اس پر دوسروں نے اسے روکا اور وہ معافی مانگ کے چلا گیا۔

شہر میں غربت کافی تھی۔ اس لئے رومان کی تلاش میں بھی نعیم کو ناکامی نہیں ہوئی۔ ایک حسین لڑکی اسے ایک رقص کے مدرسے میں مل گئی، جس کے اس نے ویئزوالڈ روی آنا کے جنگل) میں بوسے لئے اور جس کے ساتھ وہ رات کی تاریکی میں نام نہاد نیلی ڈینیوب کے کنارے ریت پر ٹہلتا رہا۔ ایک اچھے خاندان کی جرمن لڑکی سے وہ کارتنر اشتراسے کے ایک ہوٹل میں ملا۔ اسے ہمل اشتراسے (آسمان کا راستہ) اور کالن برگ لے گیا۔ دن بھر اس کے ساتھ گذارا۔ پھر وہ نہیں آئی۔

ایک دن وہ کالن برگ گیا تھا، جہاں سے وی آنا اور ڈینیوب دونوں نشیب میں بڑے خوبصورت معلوم ہوتے۔ واپسی میں ایک دوسری بس میں اس نے ایک اور لڑکی کو سوار ہوتے دیکھا، جو سفید پگڑی کی سی نہایت فیشن ایبل ٹوپی اور سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے غور کیا تو دیکھا کہ یہ میری پاول تھی۔

وینس سے اس کے جہاز کے جانے میں تین دن باقی رہ گئے تو اس نے سفر کا ارادہ کیا۔ اسٹیشن پر اس نے پھر میری پاول کو دیکھا۔ وہ اکیلی تھی۔

اس نے نام لے کے میری کو زور سے پکارا۔ وہ ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی۔

"تم یہاں کہاں؟" اس نے میری سے پوچھا۔

"جیمز ابھی ابھی سالتس برگ گیا ہے۔ میں اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ تم کہاں

جا رہے ہو؟" میری نے پوچھا۔

"ہندوستان!" نعیم نے جواب دیا۔ نعیم نے غور سے دیکھا تو میری کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

"اچھا ہوا تم سے یہاں ملاقات ہو گئی۔ یورپ سے واپس ہونے کا تمہیں افسوس ہے؟" میری نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جلد واپس آؤں گا۔" نعیم نے جواب دیا۔

"بشرطیکہ جنگ جلد نہ چھڑ گئی۔ مگر میں تو یہ محسوس کر رہی ہوں کہ ہم بہت تیز جا رہے ہیں اور ٹکر ہونے ہی والی ہے۔"

اور نعیم کو ورسیمن کے قریب موٹر سائیکل والی نوجوان عورت کا حادثہ یاد آ گیا۔

اس نے میری پاول اور اس مردہ عورت میں ایک طرح کی وحدت محسوس کی۔ تمدن کی وحدت۔ اور پھر اس نے اپنے آپ کو دفعتاً یہ غیر محتاط سوال کرتے سُنا:

"میری تم زیادہ خوش نہیں معلوم ہو رہی ہو۔ کیا تم سے اور جیمز سے نہیں بنی؟"

میری نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہم دونوں شادی کے اہل نہیں تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری سے نہیں رہ سکتے۔ بہت دیر بعد مجھے اس کا احساس ہوا۔"

"کیا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا؟"

"نہیں کوئی واقعہ نہیں۔" میری نے جواب دیا۔ "مگر یہ احساس پیدا ہو چکا ہے مجھ کو بھی اور جیمز کو بھی۔" میری کے لہجے میں تلخی نہیں بلکہ ایک طرح کی آزردگی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" نعیم نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔

"شکریہ نعیم! مگر اب تمہاری گاڑی جانے ہی والی ہوگی"

وہ نعیم کے ساتھ ساتھ اس کے ڈبے تک آئی سیکنڈ کلاس کے اس حصے میں صرف دو نشستیں تھیں۔ میری اس کے ساتھ اوپر چڑھ آئی۔ "اچھی خاصی آرام دہ جگہ مل گئی" اس نے کہا۔

نعیم نے میری کا ہاتھ اٹھا کے چوما اور کہا "خدا حافظ۔ خدا تمہیں خوش رکھے"

اور ایک ثانیہ کے اندر ایک ہی خیال دونوں کے ذہن میں پیدا ہوا۔ دونوں کے لب ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور نعیم نے جب میری کا بوسہ لیا تو محسوس کیا کہ اس کے لب بھی سچائی سے جواب دے رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ نے محسوس کیا کہ میری کا سینہ ڈھلک رہا ہے۔

ریل اسٹیشن ہی پر تو تھی۔ میری جلدی سے ہٹ گئی۔ ریل نے سیٹی دی۔ میری نیچے اتر گئی اور نعیم دیر تک پلیٹ فارم پر اس کے سفید رومال اور اس کے ہلتے لہراتے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔

چوتھا حصّہ

اقبال احمد

پندرھواں باب

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب

صبح سویرے جہاز بمبئی پہنچا۔ نیم برہنہ مزدور ساحل پر اور کشتیوں پر کوئلے سے صاف مانجھ رہے تھے اور ان کے منہ سے کوئلے کے رنگ کا پانی اس طرح نکل رہا تھا گویا ان کے جسم کی سیاہی جو جسم کے اندر بھی موجود ہے، بہہ بہہ کر باہر نکل رہی ہے۔ جہاز سے اُترتے ہی چنگی کے محکمے نے کتابوں کی ایسی سخت جانچ پڑتال کی گویا نعیم سے زیادہ اسٹالن کا کوئی محرمِ راز نہ تھا۔ لفٹ بک کلب کی تمام کتابیں ضبط کرلیں، پھر آگے بڑھنے کی نوبت آئی۔ نعیم ایک آدھ دن بمبئی میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ ایک گھنی داڑھی والے کوچوان نے اپنی وکٹوریہ پیش کی اور کہا "آپ بھی مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ صاحب میری گاڑی میں چلیئے۔" معلوم نہیں اسے نعیم کے مسلمان ہونے کا حال کیسے معلوم ہو گیا۔ نعیم نے پوچھا تو اس نے کہا "مسلمان کی صورت کہیں چھپتی ہے؟"

(۲)

۱ کلکتہ میل کے آنے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ وہ وکٹوریہ ٹرمنس کے بڑے اور کشادہ ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک مانوس آواز نے پکار کے اسے مخاطب کیا۔

"میاں نعیم!"

یہ داؤد تھا۔

گلے ملنے کے بعد داؤد نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی "یہ کیسی گذری؟ اس وقت کلکتے جا رہے ہو؟ کہاں تقرر ہوا ہے؟ گیتانگر میں؟ ولایت میں شادی کی؟ نہیں؟ کیوں نہیں؟ یہاں بلقیس کی شادی ہو گئی ہے راحت خاں جاگیردار سے۔ مگر تم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہم سمجھے تھے تم یورپ میں موٹے ہو کے آؤ گے۔ حیدرآباد میں کب آؤ گے؟ آنا تو مجھے پہلے سے لکھ دینا۔ میں بھی بنگلور سے وہاں آ جاؤں گا۔ تمہاری ریل کب جا رہی ہے؟"

بلقیس کی شادی کی خبر سن کر نعیم کے دل پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ایک دریا بہتا ہوا ریگستان میں غائب ہو گیا تھا۔ دفعتاً ریت سے پھر پانی ابلنے لگا۔

"بلقیس کی شادی کب ہوئی؟" اس نے یہ جان بوجھ کے سوال کیا کہ داؤد دل میں ضرور اس پر ہنسے گا۔

"کوئی دو تین مہینے ہوتے ہیں۔ خانم آخری وقت تک امید لگائے بیٹھی تھیں کہ تم آؤ گے تو تمہیں سے ہو گی۔ مگر بلقیس تم سے شادی کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوئی۔ اب پچھتاتی ہو گی۔ خیر جس بلقیس کا منہ دیکھنے میں تمہیں ناکامی ہوئی اس کی شادی ایک ایسے موٹے تازے کالے جاگیردار سے ہوئی ہے کہ یاد ہی کرتی ہو گی۔ مگر ہم تو سنتے تھے کہ

تم وہاں شادی وادی کر چکے ہو؟"

"نہیں ابھی تک تو نہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ میاں عادل کا کیا حال ہے؟" !

"حال ہے۔"

"میں تو سمجھتا تھا کہ بلقیس سے ان کی شادی ہو جائے گی۔" نعیم نے کہا۔

"نصیبِ دشمناں محترم نے خواہد ماند۔" داؤد نے ہنس کر کہا "کم سے کم تمہارے لئے یہ تسلی تو ہے۔"

"نہیں مجھے اب بلقیس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"خیر وہ بھی خوش، تم بھی خوش۔ چلو اچھا ہوا۔"

"مگر میاں عادل کا کیا قصہ ہے؟"

داؤد نے کہا "بھئی وہ پہلے تو بلقیس کو تمہارے خلاف بھڑکاتے رہے۔ ایسے ایسے دلچسپ قصے تمہارے متعلق تصنیف کرتے تھے کہ ہنسی آتی تھی۔ ہنسی کی حد تک تو میں بھی گنہگار ہوں۔ یوں بھی میرے خیال میں تمہاری اور بلقیس کی طبیعت ذرا مختلف ہے۔ اور بلقیس کا دماغ شروع ہی سے خراب تھا۔ تمہارے خلاف تو بلقیس کو انہوں نے اتنا بھڑکایا کہ باوجود عاقل چچا اور خانم کی کوشش کے اس نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھ سے اور عاقل چچا سے لڑائی بھی ہوئی۔ لیکن اس کا ذکر ضروری نہیں۔"

"اب بھی لڑائی ہے؟"

"نہیں اب تو نہیں۔ البتہ میاں عادل اب بھی مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ ایک دن مجھے ذرا جوتے کاری بھی کرنا پڑی۔"

"وہ کیسے ؟"

"پہلے ان سے ایک بار لڑائی ہو چکی تھی۔ انہوں نے میرے اور بلقیس کے متعلق تہمت تراشی تھی۔ خیر جب وہ قصہ رفع دفع ہوا اور میں عاقل چچا کے یہاں آنے جانے لگا تو ایک دن میں نے میاں عادل کے ہاتھ میں ایک فراست الید کی، یعنی ہاتھ دیکھنے کی کتاب دیکھی۔ اس کے آخر میں ایک باب میں پیدائش کے مہینوں کی خصوصیات کا ذکر تھا۔ بلقیس کی پیدائش کا جو دن تھا۔ اس دن کی پیدائش کی خصوصیتوں میں یہ تھا کہ جو لوگ اس تاریخ کو پیدا ہوتے ہیں وہ اظہار محبت سے نہیں بلکہ دوستی بڑھانے کے بعد قابو میں آتے ہیں اور اسی قسم کی اور بہت سی مہمل باتیں تھیں۔ لیکن ان سب کے مقابل حاشیے پر عادل صاحب نے بلقیس کا نام لکھا تھا۔ میں نے وہ کتاب اس سے چھین کے ان سب باتوں کی خانم اور بلقیس کے سامنے ہنسی اُڑائی۔ وہ بگڑے تو میں نے کالج میں ان کے بے وقوف بنائے جانے کا تذکرہ کیا اور کچھ واقعات سنائے بلقیس ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئی۔"

"پھر کیا ہوا ؟"

"پھر انہیں غصہ آیا۔" داؤد نے جواب دیا۔ "جب تک ہو سکا میں طرح دیتا رہا لیکن جب ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہی رہی تو میں نے جوتا سنبھالا۔"

"مگر بلقیس سے ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی ؟"

"کوشش تو بیچارے نے بہت کی۔ بلقیس کو خطوط لکھے جو اس نے خانم کے حوالے کر دیئے۔ ہر ایک سے کہلوایا۔ باقاعدہ پیام دلوایا لیکن بلقیس جب تم کو خاطر میں نہیں لاتی تھی تو انہیں کیوں پوچھتی۔ وہ انہیں آلۂ تفریح سمجھ کر بناتی رہی اور یہ اُلّو داس

سمجھتے رہے کہ وہ ان پر جان دیتی ہے۔ جب اس نے کھلم کھلا انکار کر دیا تو ان بچارے کو اتنا صدمہ ہوا کہ امتحان میں فیل ہو گئے اور کچھ بلقیس کے رنج میں، کچھ بیماری کے بہانے دو تین مہینے فریش بھی رہے۔ اسی اثنا میں بلقیس کے دوسرے پیام آتے رہے۔ یہاں تک کہ راحت خاں جاگیردار سے بات ٹھہری۔"

"مگر بلقیس کو اس جاگیردار میں کیا پسند آیا؟" نعیم نے پوچھا۔

"پیسہ، میاں پیسہ، ہزارہا روپے کی ان کی ماہانہ آمدنی ہے۔ پھر یہ کہ میں نے ان نئی روشن خیال لڑکیوں میں ایک عجیب بات دیکھی ہے۔ اپنے خاندان کا اچھے سے اچھا لڑکا انہیں پسند نہیں آتا اور باہر کسی کالے کلوٹے سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ خیر میاں عادل نے بڑی کوشش کی کہ نسبت ٹوٹ جائے۔ ایک دن گرمیوں کے موسم میں مجھے سائیکل پر ننگے سر جاتے بھی نظر آئے۔ میں نے دل میں کہا۔ دو تین ہفتے میں پاگل ہونا ضروری ہے۔ مگر کچھ ہوا ہوا یا نہیں، شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔"

"عادل شادی میں شریک ہوئے؟"

"نکاح کے وقت تو تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ہر ایک نے محسوس کیا کہ ان کی غیر موجودگی خالی از علت نہیں۔ میں نے تو خانم سے یہاں تک عرض کرنے کی جرأت کی کہ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق خودکشی کر لی ہوگی۔ مگر دو تین گھنٹے کے بعد آنسو وغیرہ پونچھ پانچھ کر میاں عادل آپہنچے .... مگر تمہاری ریل کا وقت ہو رہا ہوگا؟"

"چلئے پلیٹ فارم تک تو میرے ساتھ چلئے۔" نعیم نے کہا۔

"ضرور، ورنہ کتابیں نہ چلتا؟"

"اب میاں عادل کا کیا حال ہے؟"

"نوکر ہوگئے ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ اقبال کا بڑا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ اب تمہاری بُرائیاں نہیں کرتے۔ عہد کر لیا ہے کہ عروسِ علم کے سوا عمر بھر کسی سے شادی نہ کریں گے۔"

(۳)

گپتا نگر کے قریب برہم پتر کا پاٹ اتنا چوڑا ہے کہ وہ جھیل معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ریل کوئی سڑک اس مقام پر اس وسعت کو عبور نہیں کر سکتی۔ اس لئے لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے جاتے ہیں۔ ندی کے کنارے ایک ٹیلے پر صاحب ڈپٹی کمشنر کی سرکاری کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی سے اس دریا کا منظر نعیم نے اتنے مہینوں تک دیکھا تھا کہ اب یہ اس کی زندگی کا ایک جزو سا بن گیا تھا۔ اس کے خیالات کا ایک جغرافیائی پس منظر۔

برہم پتر کی زندگی اس کی اپنی زندگی سے کچھ ملتی جُلتی تھی، کچھ مختلف۔ وہ اکثر شام کے وقت کچہری سے واپس آکر برہم پتر کو دیکھ دیکھ کے یہی سوچا کرتا۔ اس کی زندگی کی روانی بھی اس ندی ہی کی سی تھی۔ جہاں نشیب آیا، پانی ڈھل گیا۔ بارش زیادہ ہوئی، برف زیادہ گری تو پانی زیادہ آگیا۔ کبھی کبھی سیلاب آگیا اور غریبوں کے گھر تباہ ہوگئے۔ برہم پتر کا سیلاب اور ڈپٹی کمشنر صاحب کا غصہ۔ دونوں کی اپیل نہ سرکار کے پاس تھی نہ خدا کے پاس۔ دونوں میں رعونت یکساں تھی مگر رعونت کی وجہیں مختلف تھیں۔ برہم پتر کی رعونت اس کی وسعت، اس کے بہاؤ کے

زور اس کی گہرائی میں تھی۔ اور نعیم کی رعونت کا باعث نہ کوئی وسعت تھی نہ گہرائی اور نہ کوئی زورِ حیات۔ یہ رعونت نیاز مندی سے پیدا ہوئی تھی۔ برہم پتر کی روانی تو خیر صدیوں سے جغرافیائی حدود کی حد تک کم و بیش متعین ہے لیکن نعیم کی زندگی کی رَو میں زورِ حیات اتنا معدوم تھا کہ مستقبل کی تشکیل اس کے بس سے باہر تھی۔

وہ یہی سب باتیں سوچا کرتا اور ایک احساسِ ناکامیابی اسی عمر سے اس پر حاوی ہونے لگا۔ یہ احساس کہ اس کی اپنی زندگی کچھ بے مصرف سی ہو گئی ہے۔ طالب علمی کے زمانے تک وہ پھر بھی زندگی کی تخلیق کے کچھ نہ کچھ خواب دیکھتا رہا مگر اس ملازمت میں وہ مشین کا ایک پرزہ تھا اور بس۔ سرکار اور رعایا کے نزدیک بیش قیمت پرزہ — لیکن محض پرزہ ہی پرزہ تھا۔

یہ بے مصرف زندگی، یہ آرام کی، دوروں کی اور شکار کی زندگی۔ کرسمس میں کلکتہ کا سفر اور چورنگی کے ہوٹلوں میں ناچ، گرمیوں میں دارجلنگ۔ یہ زندگی جس میں ایک پورے ضلع کی رعایا اس کے نام سے کانپ جاتی تھی۔ ہزاروں کا سلام، سیکڑوں کو سلام، یہ خوشامد پسند، خوشامد کرنے والی زندگی جو آہستہ آہستہ عمر کا ایک ایک سال کاٹتی جاتی ہے۔ ہر سال پہاڑ پر بھی ہے۔ انگریزوں سے دوستیاں کراتی ہے اور ان دوستیوں میں ذلت سی محسوس کراتی ہے۔ یہاں تک کہ پنشن کا زمانہ آ جاتا ہے اور اس وقت اس زندگی میں مقام کی تبدیلی ہوتی ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے لیکن زمان و مکان دونوں انسان کی گرفت سے باہر رہتے ہیں۔ یہ عزت کی زندگی یہ ناکامی کی زندگی یوں ہی گذر جاتی ہے۔ اور سینکڑوں نوجوان جو آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں فیل ہوتے ہیں، عمر بھر اس کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔

گنپا نگر میں برہم پتر کے کنارے یہی احساس نعیم پر حاوی ہونے لگا تھا۔ کیا اس کی ساری زندگی یونہی گذر جائے گی کچھ تخلیق کئے بغیر۔ کیا آرام کے معنی محض اعلےٰ درجے کی حیوانی آسائش ہے۔ کیا یہی اس کا منتہائے نظر ہے۔ وہ جذباتی اضطراب اور کاوش جو یورپ میں تھی وہ یہاں مفقود تھی۔ اس نوکری میں جنس بھی ایک خوراک کی سی چیز تھی۔ پیسے سے اچھی اچھی دیہاتی لڑکیاں آجاتیں۔ تیرہ چودہ سال کی کچھ میں کلکتہ یا دارجلنگ میں مل جاتیں۔ ذہنی اضطراب اور کاوش کہاں اور گنپا نگر کہاں۔

نعیم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی شخصیت ٹوٹ رہی ہے۔ انفرادیت مُندمل ہو رہی ہے۔ سیاسیات میں اس کا نقطۂ نظر محض ایک تماشائی کا سا رہ گیا تھا۔ ہندوستان آنے کے کچھ ہی دنوں بعد کانگریس اور لیگ کی جنگ میں اس کی نام نہاد اشتمالیت ختم ہوئی۔ سرکار سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس لئے سرکار کا آدمی بن کے چمکنے کا بھی اسے کوئی موقع نہ تھا۔ اسی طرح خارجی سیاسیات میں بھی اس کی ہمدردی طاقت اور سیاسی ہنر کا ساتھ دیتی اور تمام اعلیٰ الصفات بُت لگے تھے۔ یہ غلامانہ ذہن کی خاص علامت ہے۔ یورپ میں جو سلطنت سیاسی اور فوجی طاقت کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتی ہے، ہندوستانی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ کھلم کھلا نہیں تو در پردہ۔ پھر جب یہ سلطنت دوسروں سے زک کھاتی ہے تو دوسروں کی تعریف ہونے لگتی ہے۔ گویا سیاسیاتِ عالم اور عالمگیر لڑائیاں گھوڑ دوڑ ہیں۔

یہ نعیم کی بدقسمتی تھی کہ اس کی شخصیت ملازمت کے وقت تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھی یعنی کوئی امتزاج نہ پیدا ہو سکا تھا۔ ذہنی تفکرات میں امتزاج کے فقدان کی وجہ سے وہ کوئی فلسفۂ حیات نہ بنا سکا تھا اور نہ اچھا بھی تھا۔ سرکاری ملازمین کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیاسیات میں اشتمالیت اور اسلام کے درمیان وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ پہلے اشتمالیت کی طرف جھکا ہوا تھا۔

اب پان اسلامزم اور پاکستان کی طرف مائل ہو گیا۔ پہلے بھی خیالات بے ارادہ، بے عمل تھے، اب بھی رہے۔ جذباتی امتزاج کے بجائے اب انتہا درجے کا انتشار تھا۔ بلقیس، الیس اور میری تینوں اس کی زندگی میں آکے غائب ہو چکی تھیں۔ تینوں کا خیال ایک ساتھ آنا ہی جذباتی انتشار کی نشانی ہے۔ اب یہاں بھی خلا ہی خلا تھا۔

(۲)

۱۹۳۸ء کے آخر میں وہ حیدرآباد آیا۔ محض بلقیس کو ایک بار پھر دیکھنے کے لئے شہر کے مضافات میں ایک جدید مکعب وضع کے سامنے وہ گاڑی سے اترا۔ مکان کا باغ بہت اچھا تھا۔ سرخ جاپانی پھولوں کا ایک جھاڑ دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ دوسری دیواروں پر بیلیں تھیں۔ مگر پھولوں کا موسم گذر چکا تھا۔

اسے بلایا گیا۔ ڈرائنگ روم میں بلقیس بیٹھی تھی۔ دیواروں پر نشاۃِ ثانیہ کی چار تصویروں کے عکس تھے۔ جن میں نہ کوئی مذاق تھا نہ کوئی ہم آہنگی۔ فرنیچر میں بھی کوئی خاص سلیقہ، کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ نعیم نے اپنے دل میں کہا "میں نہیں سمجھتا تھا کہ بلقیس ایسی بے سلیقہ بیوی نکلے گی۔"

بلقیس نے سلام کا جواب دے کر وہ بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بلقیس کپتانگر کے متعلق، یورپ کے متعلق اور ایسی ہی روزمرّہ کی باتوں کے متعلق پوچھتی رہی۔ پھر خانم آ گئیں۔ ان کی لچھے دار باتیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ نعیم سے اصرار کرنے لگیں کہ شادی کر لو۔ جس سے کہو تمہاری شادی کرا دوں۔ کوئی درجن بھر لڑکیوں کے نام انہوں نے لے ڈالے۔ سب کا حلیہ بتایا، شجرۂ نسب سمجھایا۔ اور نعیم برابر مذاق میں اڑاتا رہا۔ بلقیس اٹھ کے چلی گئی تو خانم نے قریب آکے نعیم کے کان میں کہا۔ "تم نے بلقیس کو دیکھا؟

پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی ۔ رنگت کیسی زرد پڑ گئی ہے ۔ اس موذی سے خدا سمجھے ۔ وہ ایسی ایسی اذیتیں دیتا ہے کہ میری بچّی کی زندگی جہنم بن گئی ہے ۔"

نعیم نے ذرا پریشان ہو کے پوچھا "کیوں کیا بلقیس خوش نہیں ہے ؟"

خانم نے جواب میں ٹھنڈی سانس لی۔

"آخر بات کیا ہے ؟" نعیم نے ذرا ہچکچا کے پوچھا۔

"بھئی شروع میں تو راحت خاں پردے کے بڑا خلاف تھا۔ خود ہی تمام دوستوں سے ملایا ، ساتھ ساتھ لئے پھرتا تھا۔ کئی دفعہ ڈانس میں لے گیا تھا۔ میں اور تمہارے چچا اُلٹے کہتے تھے کہ حیدرآباد میں اتنی آزادی ٹھیک نہیں۔ مگر یہ دونوں کب مانتے تھے۔ اور میاں حیدرآباد کا حال تو تم جانتے ہو، چیل اُڑے تو لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بھینس اُڑی۔ مگر راحت خاں کو عقل ہوتی تو اتنا تو سوچتا کہ میں نے ہی اتنی آزادی دی ہے ۔ وہ اُلٹا جلنے لگا ۔ یہاں مت آؤ ، وہاں مت جاؤ۔ اس کے سامنے مت نکلو۔ اس سے پردہ کرو۔ اور بلقیس کچھ کرے یا نہ کرے وہ لڑائیاں ہوتی تھیں کہ الٰہی توبہ۔"

"مجھے بلقیس کی حالت دیکھ کے پہلے ہی یہ شک ہوا تھا کہ وہ زیادہ خوش نہیں۔"

"خیر بلقیس نے پردہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کا کہا ماننے لگی۔ گھر سے باہر جانا چھوڑا تو خود راحت خاں نے عیاشی شروع کی۔ اب سکندرآباد میں ایک اینگلو انڈین عورت کو گھر ڈال لیا ہے ۔ اس کے لئے سو روپیہ مہینے کرائے کا ایک مکان لیا ہے اور اسے موٹر میں لئے لئے پھرتا ہے ۔ میں تو بلقیس سے کہہ رہی ہوں خلع کر لو۔"

"بلقیس نے اس سے شادی کیوں کی ؟"

"قسمت۔" خانم نے جواب دیا۔ "میں نے کتنا سر مارا مگر تمہارے چچا نے ایک نہ مانی۔"

آخر میری لڑکی کی قسمت پھوڑ دی۔ مجھے تو ڈر ہے وہ زیادہ دن جئے گی نہیں۔" اور خانم رونے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد راحت خاں بھی آئے۔ سانولے سے آدمی تھے۔ بات چیت انہوں نے اس قدر اخلاق سے کی کہ نعیم کو شک ہونے لگا کہ ان لڑائی جھگڑوں اور بدمزگیوں میں بلقیس کی بھی اچھی خاصی خطا ہے۔

کھانے پر تابعداری کا اچھا خاصا سلسلہ رہا اور نعیم کو اگر خانم نے سمجھا نہ دیا ہوتا تو اسے محسوس نہ ہو سکتا کہ یہ گھر جیتا جاگتا خوش و خرم معلوم ہو رہا ہے۔ دراصل جہنم ہے۔

کھانے کے بعد راحت خاں اس کی گاڑی منگوانے باہر گئے۔ بلقیس سے رخصت ہوتے وقت نعیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بلقیس! ہرگز ہمت نہ ہارنا!"

اظہارِ تشکر میں اس کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ثانیے کے لئے اس نے نعیم کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے پیچھے ایک عجیب روشنی کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ گویا وہ اپنی غلطی کی معافی چاہ رہی تھیں۔ اپنے غلط انتخاب کی۔ ان میں صدیوں کے تجربے کے برابر تاسف تھا اور وہ اس نوجوان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر رہی تھیں جو لاکھ یورپ کی لڑکیوں میں آوارگی کرتا رہے۔ بالآخر ان کا غلام تھا۔ اور ان آنکھوں کو اس کا یقین تھا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت گذر چکا تھا

اور یہ سب باتیں ایک ثانیے کے اندر کہہ گئے جو زبان سالہا سال میں اچھی طرح ادا نہ کر سکتی، وہ نگاہیں پھر جھک گئیں۔ ہاتھ ہٹ گیا۔ راحت خاں آئے اور نعیم کو ساتھ لے کر باہر چلے گئے۔

سولھواں باب

کوہکن گرسنہ مزدور طربِ گاہِ رقیب

پراہا
چیکوسلاویکیہ
۲۷ر نومبر ۱۹۳۸ء

محبی نعیم!

تمہارا خط پڑھ کے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ تمہاری ہمدردی سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے علم ہے کہ تمہاری طرح اور بھی بہت سے انسان ہیں جن کو اگر پورے حالات معلوم ہوں تو وہ بھی "وسط یورپ کے اس ملک سے جس کا ہم نے کبھی ذکر بھی نہیں سنا" (یہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے ایک وزیر اعظم کے الفاظ ہیں ـــ ہمارے اس ملک سے ہمدردی محسوس کریں گے۔ جب گذشتہ گرما میں پراگ میر

بہت سے اجنبیوں سے ملا۔ سب ہمارے دوست تھے۔ سب نے اپنے اپنے ملکوں کی ہمدردی کا یقین دلایا۔ ہمارے سیاسی دوستوں نے بہت غلو سے اپنے وعدوں کی سچائی کے دعوے کئے ــــ اور نتیجہ؟ ــــ نتیجہ تم نے دیکھ ہی لیا۔ لوہے کے ہتھیاروں والے ہسائے جن کی اصلی جگہ باورچی خانے ہیں ہمارے ملک کے ٹکڑے کاٹ لے گئے اور کیا اچنبھا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے ان صدیوں کے دشمنوں نے ہمارے اپنے پولستانی بھائیوں اور لالچی ہنگرویوں کی طمع سے ہمیں بچانے کا ذمہ لیا ہے۔

لیکن ایک بات اور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ معاشی طبقوں کی جنگ کا زمانہ ہے ــــ مگر نہیں میں اسے ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکتا۔ یہاں کچھ ایسا دستورِ زباں بندی ہے۔ پھر کبھی ملے تو ترکی قہوے کی پیالیاں پیتے ہیں ہم اس مسئلے پر بحث کریں گے۔

تم نے یہ جو لکھا ہے کہ اب بھی تم مجھے ویسا ہی گہرا اور اولیں دوست سمجھتے ہو اس سے مجھے بڑی ہی دلی مسرت ہوئی اور میں نے ایک عزت سی محسوس کی۔
بقول تمہارے ہماری دوستی زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہے۔ تم اگر کوئی دس ہزار میل دور ہو تو کیا پروا، مجھے وہ زمانہ ہمیشہ یاد رہے گا جو پیرس میں ہم دونوں نے ساتھ گذارا ہے۔ وہ میری زندگی کے انتہائی خوشگوار زمانوں میں سے ایک تھا۔
ایک بار پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا تم میرے پاس ہو۔ یہ اس وقت جب گذشتہ ستمبر میں میں پراگ میں جواہر لال نہرو سے ملا۔ میرے ایک رومانوی دوست کی جو نامہ نگار ہے، مسٹر نہرو سے بڑی دلچسپ ملاقات رہی۔

میں ابھی تک وزارتِ خارجہ کے دفتر میں ہوں۔ مگر مستقبل کی بات کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جرمن اثر زیادہ بڑھ گیا تو ممکن ہے مجھے قید کر لیا جائے۔ بہرحال ہمارے پورے ملک کے نظام میں بہت سی تبدیلیاں ہوں گی اور دفتر وزارتِ خارجہ کو محدود کر دیا جائے گا۔ ممکن ہے میں بھی تخفیف میں آجاؤں۔ بہرحال میں اتنا زیادہ قنوطی بھی نہیں۔ ممکن ہے ایک دن میں ہندوستان آؤں اور باٹا کے لئے سانپ پکڑوں۔

یہ بڑا پُرلطف زمانہ ہے عظیم الشان تخریب کا زمانہ۔ معاشرتی اُبال، اقدار اور پیالوں کے زلزلے کا زمانہ۔ ہم لوگوں کی طرح تم اس کی تکلیف محسوس نہیں کر سکتے۔ تم تاریخ کا ہزار ہزار سال کے ابواب میں تصور کرتے ہو لیکن یورپ والوں کے لئے موجودہ حالات بڑے حیرت انگیز ہیں۔ غارت گروں، اور سٹے بازوں اور ڈاکوؤں کا اتنا بڑا کارخانہ۔ چیکوسلاویکیہ کی ہمت ابھی تک نہیں ٹوٹی اور قومی ہمت کی اقدار میں انسانیت اب بھی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ پھر ہم اپنے ویرانے کی بنیادوں پر نئی عمارت کھڑی کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ پھر ہم نئے زمانے دیکھیں گے اور روشن تر آفتاب، اور تب تم بھی یہاں آؤ گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھو گے ـــــ اور ہمارا شہر اس وقت آزاد شہر ہو گا۔

تمہارا مخلص دوست

"زیدنک ہروشا"

---

(۲)

۱۱ گلاڈسٹر اسٹریٹ
وکٹوریہ۔ لندن
۷ر جنوری ۱۹۳۹ء

پیارے نعیم!

تمہارے خطوط کا بہت بہت شکریہ۔ میں نہیں سمجھی تھی کہ تمہاری دوستی — تمہاری محبت اتنی دیرپا رہے گی۔ دونوں خطوط کا میں ایک ساتھ جواب دے رہی ہوں۔ ایک واقعہ پیش آیا۔ جو اور ہزاروں پر بھی گذرا ہوگا لیکن جب خود پر گذرتا ہے تو اس کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ تمہیں اس کی اطلاع دوں۔ جیمز (کراکسلے) نے یہ محسوس کیا کہ اسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی، اور ہم الگ الگ ہو گئے۔ مجھے اس سے ابھی تک اتنی ہی محبت ہے۔ مگر یہ انکشاف اس کے اپنے دل کا تھا۔ میں اسے کیسے مجبور کر سکتی۔

اور مجھے بھی اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ یہ نہیں کہ میں نے اسے کیوں اس قدر چاہا۔ بلکہ یہ کہ میں نے مسرت کو اپنے آپ میں ڈھونڈھنے کی بجائے کسی اور میں کیوں ڈھونڈا۔ جب تک میں اپنے آپ میں ساری مسرتیں ڈھونڈھتی رہی، مجھے کوئی فکر نہیں ہوئی۔ کوئی رنج نہیں ہوا۔

میں نے ابھی تک طے نہیں کیا کہ کیا کروں گی۔ سیاسی کام کے سوا میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ بچوں کی تربیت کا کچھ کام سیکھوں۔ انصاف اور انسانیت کی تعلیم بچپن سے ہونی چاہیے۔

کرسمس میں نے اور جیمز نے ساتھ گذارا تھا اور میں کس قدر خوش تھی۔ اب میں بالکل تنہا ہوں۔ دنیا نے اپنی گردش چھوڑ دی۔ نظام شمسی درہم برہم ہو گیا ابھی تک اپنی یہ تنہائی، اس سے یہ جدائی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب میں مستقبل کے ان لا متناہی لمحوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں کا تصور کرتی ہوں، جن میں میں اس سے جدا رہوں گی تو کانپ اٹھتی ہوں۔

اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ جلد ہی تصفیہ ہو گیا۔ میں نے تم سے آسٹریا ہی میں کہہ دیا تھا کہ میری اور جیمز کی نبھے گی نہیں۔ ماہ عسل کے زمانے ہی سے دونوں کو ایک دوسرے کی وفاداری کی طرف سے بدگمانی شروع ہو گئی۔ میں اس سے وفادار رہی۔ باوجود اس کے کہ میں اصولاً میاں بیوی کی جنسی وفاداری کی قائل نہیں۔ لیکن اس کی آوارہ گردی کے بعد اسے جلانے کے لئے میں اس قسم کی باتیں کرتی تھی۔ اب یہ سب کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، اور جیمز کو اب ایک اور لڑکی سے محبت ہے۔

مجھے یہ ایک بڑی ظالم اور احمقانہ سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وقت کے ایک ثانیے میں اتنی طاقت ہو کہ وہ زندگی کے دن کو رات کر دے۔ ایک لمحہ پہلے میں اپنے شوہر سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک لمحہ بعد وہ اجنبی بن کے چلا گیا۔

اب بجز اس کے کہ میں اپنے آپ کو اس قدر مصروف رکھوں کہ جیمز کا خیال بھی دل میں نہ آئے، میرے لئے اور کوئی صورت نہیں۔

میونک کی واردات اور مسٹر چیمبرلین کی کارگذاری کے قصے تو تم اخبارات میں پڑھ چکے ہوگے۔ مجھے تو اس کا اندیشہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہٹلر رکے گا نہیں۔ آئندہ بہار میں

یورپ پر پھر مصیبت آئے گی یا تو وہ پورے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کرے گا۔ یا ہالینڈ پر حملہ کرے گا یا پولینڈ کی باری آئے گی۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس بین الاقوامی ہیجان کے زمانے میں جب کام کرنے کی اس قدر سخت ضرورت ہے انسان کو اپنے ہی خانگی مسائل اتنے اہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہر زخم کی طرح یہ بھی مندمل ہو جائے گا۔

تمہاری

میری پاول"

(۳)

لندن

۱۹ جولائی ۱۹۳۹ء

عزیزی نعیم:

تمہارا خط پڑھ کے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے تعجب ہونے لگا تھا کہ آخر تمہیں ہو کیا گیا کہ تمہارا نہ خط نہ؟ جانا تو میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہیں ایک اور مختصر سا خط لکھوں اور پوچھوں کہ تم نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ میں تمہیں اب تک ایک اور خط بھی چکا ہوتا۔ مگر ایک وہ ذاتی معاملات میں مصروف تھا اور ان کے طے ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہاں اور اگر مہربانی کر کے تم اپنے خطوط پر تاریخ لکھ دیا کرو تو بڑی سہولت ہو۔ اس سے بہر حال آسانی ہوتی ہے اور خصوصاً ہندوستان سے یہاں تک خطوط کے آنے جانے میں تو کئی دن لگتے ہیں۔

میں تمہارا بہت مشکور ہوں کہ تم نے اپنے اس خط میں میری کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔
تم اس قدر دور ہو کہ حالات سے واقف نہیں۔ اس لئے اس ذکر کو چھوڑو۔ کچھ اور
حالات سہی۔

مثلاً جدید شاعری۔ تمہیں اس مہینے کی ادبی خبریں سناؤں۔ ٹی، ایس، ایلیٹ کے
نئے ڈرامے "خاندان کا اجتماع" کے متعلق نقادوں کی کج بحثی کا سلسلہ بدستور جاری
ہے۔ اسکروٹنی میں ایک نقاد نے لکھا ہے کہ اس میں جتنے حصے اچھے ہیں، وہ ایلیٹ کی
کسی ابتدائی نظم کی صدائے بازگشت ہیں۔ گویا وہ اپنے ابتدائی تخیل کی یاد ہی میں رہنا چاہتا
ہے اور پرانے فقرے الٹ پلٹ رہا ہے۔ میں نے بھی کم سے کم ایک نقص تو محسوس کیا ہے
اور وہ یہ کہ مصرعے چست نہیں ہیں اور کچھ گھٹیا سے ہیں۔ معلوم نہیں۔ کتاب ہندوستان
پہنچی اور تمہاری نظر سے گذری ہے یا نہیں لیکن مجھے تو یہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ ایلیٹ
جیسے کلاسیکی ماہرِ فن نے یہ شعر لکھے ہیں۔

سینکڑوں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر آرنلڈ ٹائن بی
کی "مطالعۂ تاریخ" ہے جس کی تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں اور تین اب شائع ہو رہی
ہیں۔ تحقیق اور مطالعے کا یہ شاہکار گذشتہ دس سال کی بہترین پیداوار ہے۔ باقی بہت سی
کتابیں سیاسیات اور سیاسی حالات کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔

برِاعظم کے متاثر حالات کے متعلق بہت سی "نامہ نگارانہ" قسم کی کتابیں چھپی ہیں۔
کوئی قابلِ ذکر ناول دیکھنے میں نہیں آیا۔ یوں شائع تو بہت سے ہوئے ہیں۔

ایک دوسرے فن میں حسبِ معمول بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مرتبہ ایپسٹائن
کے نئے مجسمے "آدم" کے متعلق۔ لیکن مجموعی طور پر اس کے متعلق یہ رائے قائم کی جا رہی

ہے کہ اس مجسمے سے بڑی طاقت اور بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے جب یہ مجسمہ پہلی بار دیکھا تو میری نظر جم نہیں سکی۔ کیونکہ اس ناقابلِ تعرض، اُمنڈتی ہوئی قوت اور اُبھرنے کی اس تمنا کا تاثر ہی مجھ پر کچھ اس طرح حاوی ہو گیا۔ یہ گویا انسان کے زمین سے اُٹھنے کی مثال ہے۔ اس سے پہلے کسی مجسمے نے مجھے اس طرح مرعوب اور متاثر نہیں کیا تھا۔

موسم ــــ یہ گرمیاں کچھ عجیب ہی ہیں۔ دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کئی بار گرج دار طوفان آئے اور جھڑیاں لگیں۔ جو لوگ چھٹیاں منا رہے ہیں۔ ان کے لئے تو موسم تکلیف دہ ہے مگر گھاس رس دار ہے اور درخت خوب گھنے ہیں۔

سیاسی صورتِ حال پیچیدہ ہے ــــ بہت زیادہ۔ تمہارے سر میں یہ خیال کہاں سے سما گیا کہ میونک کی شرمناک صورتِ حال کے بعد ہم بچ جائیں گے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں معلوم ہوا یا نہیں کہ ہروشا کو جرمنوں نے قید کر لیا ہے۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا ختم ہو چکا۔ دنیا بھر کی حالت ذلیل ہے۔ فرانس میں دلادیئے ایک غیر سرکاری آمرانہ حکومت چلا رہا ہے۔ یہاں کا جو حال ہے سو ہے ہی۔ ترکی اس جمہوری گلے میں نئے رنگروٹ بھیڑ کی طرح بھرتی ہوا ہے۔ پولینڈ میں بدترین قسم کی فوجی آمریت ابھی تک باقی ہے لیکن بہر حال انہی ممالک کو اس زمانے کی سب سے بڑی بدنہاد طاقت سے مقابلہ کرنا ہے۔ دان تسنگ کے معاملے میں ہٹلر اگر کوئی قدم نہ اٹھائے تو اس کے وقار کو اس ملک میں صدمہ پہنچے گا۔ جہاں وہ اگر برسرِ اقتدار رہنا چاہے تو اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گا ــــ یعنی جرمنی میں۔ اگر وہ قدم اٹھائے اور جمہوریتیں مقابلہ نہ کریں تو ہٹلر مرغ کی طرح بانگ دے گا اور جمہوریتوں کا وقار خاک میں مل جائے گا۔

اگر ہٹلر قدم اٹھائے اور جمہوریتیں مقابلہ کریں۔ تب تو ظاہر ہے کیا نتیجہ ہو گا — جنگ۔

چنانچہ ہر ایک اس کا منتظر ہے کہ کون اگلا قدم اٹھاتا ہے۔ مبصروں کا اندازہ ہے کہ غذا اور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے آئندہ فصل کٹنے تک ہٹلر کوئی اقدام نہیں کرے گا — پھر؟

مجموعی طور پر سب یہی کہتے ہیں کہ ٹھہرو، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس برابر باقی ہے۔ حالانکہ اب یہ ایک مسلسل پستی کی طرح محسوس ہوتا ہے سخت خوف کی صورت میں نہیں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ اس ہفتے تک کوئی نہیں کہہ سکتا اگلے ہفتے میں کیا پیش آنے والا ہے۔

اس خط کو بہرحال ختم ہونا ہے۔ میری اور اپنے متعلق میں تمہیں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ واقعات ابھی تازہ ہیں۔ میری مجھے طلاق دینے پر رضامند نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے میں اس لڑکی سے — معلوم نہیں میں نے اس سے پہلے کے خط میں اس کا نام تمہیں لکھا تھا یا نہیں — اس کا نام پیگی ہیوز ہے — فوراً شادی نہیں کر سکتا۔ ان حالات کے متعلق میں فی الحال نہیں زیادہ لکھ بھی نہیں سکتا۔

خط کے ختم پر پھر موسم کا ذکر کرتا ہوں — انگلستان سے جو خط جائے اسے موسم ہی کے ذکر پر ختم ہونا چاہیے۔ میں دو دن ہوئے اپنی والدہ کے پاس گیا تھا۔ وہاں سے سائیکل پر ایک دوست سے ملنے گیا جو کوئی بیس میل دور رہتا تھا۔ تہائی راستہ ختم کرنے سے پہلے ہی کچھ بوندیں پڑیں۔ پھر زور سے بارش ہونے لگی۔ میں نے ایک بڑے سے درخت کے نیچے پناہ لی۔ جہاں آدھے گھنٹے تک تو پناہ مل سکی۔ پھر پانی

اس طرح ٹپکنے لگا کہ میں بھیگ کے شرابور ہو گیا اور گھر واپس لوٹا تو یہ حالت دیکھی کہ ہمارے گاؤں کے اطراف پانی ہی پانی ہے۔ گویا طوفان آ گیا ہو۔ قریب کے ایک گاؤں میں اتنے سخت اولے گرے کہ موٹروں کا چلنا مشکل ہو گیا۔ آج ابر چھایا ہوا ہے۔ کبھی کبھی ہلکی سی دھوپ نکل آتی ہے اور کل ؟ اس دنیا کا رہنے والا کون انسان کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا ؟ انگلستان کے موسم سے بھی زیادہ جلد بدلنے والی صرف ایک چیز ہے۔ یعنی سیاسی صورتِ حال۔ میری دوستی ان دونوں میں سے کسی کی طرح ناپائدار نہیں۔

تمہارا دوست

"جیمز کراکسلے"

(۴)

گیبل ہاؤس

ڈنڈی اسکاٹ لینڈ

۴ ر ستمبر ۱۹۲۹ء

عزیزی نعیم!

دنیا کی حالت کے متعلق اب تمہاری کیا رائے ہے؟ گذشتہ دوشنبہ ہی سے اس ملک میں صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ اب جنگ چھڑنے ہی والی ہے۔ اس دن صبح کو لندن میں بچوں کو تخلیہ کرانے کی مشق کی گئی۔ اصلی تخلیہ دو ایک دن کے بعد شروع ہو گیا۔

بہت سے سوالات جو تم نے اپنے گذشتہ خط میں کئے تھے۔ ان کا جواب زمانے نے دے دیا۔ فی الحال تو میں لندن اور واقعات سے ذرا دور ہوں۔ میں نے غالباً تمہیں لکھا تھا کہ ۳ ستمبر کو مجھے اس نئے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی جگہ کا جائزہ لینا تھا۔ جس ریل سے میں یہاں آیا۔ اس کی کھڑکیوں سے میں انگلستان کے مناظر دیکھتا رہا۔ شاداب اور خوبصورت سرزمین۔ آزاد باشندوں کے گھر۔ ان کی حفاظت کے لئے سب کچھ، یہاں تک کہ جان کو بھی خطرے میں ڈالنا جائز ہے۔

اس اثنا میں اس گورنمنٹ نے کسی ہٹلر کی بے عیب تمکنت کی شان سے جہنم کے دروازے کھول دئیے ہیں۔ لیکن اگر یہ دروازے اب نہ کھولے جاتے تو ہم پر اس طرح کھلتے کہ پھر ہمارا جھلس جانا یقینی تھا۔ میں بھی ہیڈ ماسٹری چھوڑ کے ہوائی فوج کی تعلیم کے لئے عنقریب کہیں جاؤں گا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہاں عام لوگوں کا جنگ کے متعلق کیا خیال ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ امید و بیم کا روح فرسا دور گذر جانے کی سب کو خوشی ہے۔ اتوار کے دن ایک بجے کے قریب یہاں ایک سڑک پر میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سُنا جو جنگ کو کسی پہاڑ کے ٹوٹ کر گرنے یا کسی کان کے دب جانے کی مصیبتوں سے تشبیہ دے رہے تھے۔ لیکن مجموعی طور پر لوگ خوشی سے لڑنے کے لئے آمادہ ہیں اور پکّے قدامت پسندوں کو تو ابھی سے اس بات کا رنج ہے کہ آر، اے، ایف نے جرمنی کے شہروں پر بمباری کیوں نہیں شروع کی۔ اگر غیر فوجی باشندوں اور بچوں پر بمباری کی نوبت بھی آئے۔ تب بھی میری یہی دعا ہے کہ اس بربریت کی ابتدا ہماری طرف سے نہ ہو۔

میں اس خط کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ مجھے اس کا بھی یقین نہیں کہ یہ خط تم تک پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر تمہیں مل گیا تو جواب دینے میں دیر نہ لگانا۔ تمہارا خط آئے یا نہ آئے، میں بہرحال تمہیں اگلے مہینے ایک خط اور لکھوں گا۔

اگر خط و کتابت میں کوئی ہرج واقع ہو تو مجھے گھر کے پتے سے خط لکھنا۔ اس پتے پر غالباً مل جائے گا۔

تمہارا دوست

"جیمز کراکسلے"

(۵)

۷ گلاوسٹر اسٹریٹ

وکٹوریہ۔ لندن

۱۰ رمئی ۱۹۲۰ء

پیارے نعیم!

میں ابھی تک تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔ شاید میرا ہی خط راستے میں ضائع ہو گیا اور تم اس کا انتظار کر رہے ہوگے۔ معلوم نہیں کتنے دن میں تمہیں میرا یہ خط ملے۔

مجھے بڑی آرزو ہے کہ کاش اس وقت میں تم سے باتیں کر سکتی۔ دل کی بھڑاس نکال سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ تم اس قدر دور ہو۔ مگر دراصل دور نہیں معلوم ہوتے اگر تم اس وقت آ کے میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ تو مجھے تم کو دیکھ کے حیرت نہیں ہوگی۔ صرف اس پر تعجب ہوگا کہ جنگ کے زمانے میں تم کیسے آ گئے۔

جب سے جنگ چھڑی ہے میں ایک عجیب ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ روس کی وجہ سے۔ جرمنی اور روس کی مصالحت نے اگست ۱۹۳۹ء سے میرے دماغ کو مختل کر دیا ہے۔ جان اسٹریچی اور بہت سے دوسرے اشتمالیوں کی طرح مجھے بھی روسی اشتمالیت کی مخالفت کرنا پڑی لیکن اس سے بھی میرے قلب کو کوئی تسکین نہیں ہوئی۔ جب روس نے فن لینڈ پر حملہ کیا تو ریڈیو پر یہ خبر سُن کے میں ریڈیو کے بٹن کی طرف دیکھنے کی دیکھتی رہ گئی۔

جرمنوں نے جس برق آسانیزی سے ناروے پر حملہ کر کے فتح حاصل کی ہے اس کی وجہ سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ بالآخر چیمبرلین کے بعد چرچل وزارت بنانے میں مصروف ہے اور عمالی جماعتیں ساتھ دے رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں نے ریڈیو پر خبر سُنی ہے کہ جرمنی نے بلجیم اور ہالینڈ پر حملہ کر دیا ہے۔

ذاتی طور پر تو میں یورپ اور تمدن اور اشتمالیت سب سے بیزار ہو گئی ہوں۔ اب جنگ انگلستان سے بہت قریب آگئی ہے۔ جیمز کراکسلے سے میں ڈیڑھ سال سے نہیں ملی۔ لیکن مجھے اسی کی جان کا ڈر ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ اب وہ شاہی ہوائیہ میں ہے اور عنقریب بلجیم یا فرانس بھیج دیا جائے گا۔ یہ تو میرا دل ہمیشہ سے کہتا رہا ہے کہ اس جنگ میں اس کا مارا جانا یقینی ہے۔

معاف کرنا کہ میں ایسا پست اور رنجیدہ انداز کا خط لکھ رہی ہوں لیکن اس وقت اگر میں اپنے آپ کو خوش ظاہر کروں تو یہ جھوٹ ہوگا اور تمہیں مہملات تحریر کرنا نہ صرف بے سود ہے بلکہ میرا دل بھی اس سے مطمئن نہ ہوگا۔ میری والدہ البتہ بہت پُر امید ہیں۔

میرے دن ہمیشہ کی طرح گذر رہے ہیں۔ دن کو تخلیہ شدہ اطفال کے چال چلن کی نگرانی کرتی ہوں اور شام کو سپاہیوں کے لئے پائتابے بنتی ہوں اور نیتشے کو پڑھتی ہوں۔ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرتی ہوں۔ اس طرح میرا وقت نہ صرف سپاہیوں کے پائتابے بننے میں ضائع ہوتا ہے نہ صرف نیتشے کو پڑھتے میں۔

ہمیشہ کی طرح تمہیں بے انتہا چاہنے والی
"میری پاول"

(۶)

بیگم شہزور خاں نے نعیم کی طرف چائے کی پیالی بڑھانے سے پہلے پوچھا "کتنے چمچے شکر؟"

"دو شکریہ" نعیم نے جواب دیا اور موتی اوجھڑ بیگم شہزور خاں کی ساڑھی کی کور دیکھنے لگا۔

۲ جنوری ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ نعیم ان دنوں دہلی میں نواب شہزور خاں کے یہاں مہمان تھا۔ جب نواب صاحب نے اسے کرسمس کی چھٹیوں میں بلایا تھا اسی وقت وہ سمجھ گیا تھا کہ بیگم شہزور خاں کا اس کے مستقبل کے متعلق کوئی ارادہ ہے کیونکہ بیگم شہزور خاں منصوری، نینی تال اور دہلی میں محض اسی وجہ سے بہت مشہور تھیں کہ انہوں نے سینکڑوں نوجوانوں کی پکڑ دھکڑ کے شادیاں کرائی تھیں۔

چنانچہ یک لخت بیگم شہزور خاں نے پوچھا "تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

نواب شہزور خاں اپنی بیوی کے اس فوری حملے کا اثر نعیم کے چہرے پر دیکھنے لگے۔

ہم مسکرایا تو وہ بھی مسکرانے لگے۔
ہم نے جواب دیا یہ کیا عرض کروں بیگم صاحبہ! کوئی لڑکی نہیں ملتی؟"
خدا کی شان ہے۔ تم ماشاء اللہ آئی، سی، ایس۔ اچھی خاصی شکل وصورت،
پیام بھیجو، لوگ قدموں پہ گر کے شادی کریں۔"
س کے بعد ایک دلچسپ سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا۔ بیگم صاحبہ نے بکثرت لڑکیوں
ام گنا ڈالے۔ ان کی صفات اور ان کے حسن کا تجزیہ کیا۔ تصویریں دکھائیں اور
ں کو دکھانے اور ان سے ملانے کا وعدہ کیا۔
دوسرے دن شام کو بیگم صاحبہ ایک مقامی کالج میں انعامات تقسیم کرنے جا
ھیں۔ بیگم صاحبہ نے کچھ اس معصومانہ خلوص سے نعیم کو اس کالج چلنے اور وہاں کی
یوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کی دعوت دی کہ وہ کم از کم ساتھ چلنے
ے انکار نہ کر سکا۔
جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مرد مہمان بہت کم تھے۔ لڑکیوں کے اقارب
ر سب ہی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی۔ رنگ کے اعتبار سے
ں گوری لڑکیاں بھی تھیں۔ کالی بھی، سانولی بھی۔ ہندوستان کے ہر صوبے کی لڑکیاں جلسے
کے دوران میں نعیم اردو افسانہ نگاروں کی ان ہیروئنوں کو دیکھتا رہا۔ بالآخر اس کا ذہن
یک ناقابلِ حل گتھی کے سلجھانے میں مصروف ہو گیا۔ شلوار زیادہ بہتر لباس ہے یا ساری
رتے اور شلوار میں سینہ زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے لیکن شلوار میں اتنی نسوانیت
ہیں جتنی ساری میں ہے۔ خصوصاً رفتار کا لطف تو ساری میں ہی آتا ہے۔ ذوق اور
سائش میں بھی ساری بڑھ کے ہے لیکن شلوار کی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں ——

لی در ازقد ہو اور اس کا سینہ ابھرا ہوا ہو تو شلوار اس پر ساری سے ہزار گنا
بھی معلوم ہوگی۔
ـ لڑکی تقریر کرنے لگی۔ تنگ مہری کا پاجامہ، اونچی ایڑی کے جوتے، اطلس
ـٹ پہنے اور دوپٹہ اوڑھے تھی مگر رنگ سانولا تھا۔ اور خدوخال بالکل
تھے۔
ہم سوچنے لگا کہ جو لڑکیاں قمیص اور شلوار پہنتی ہیں۔ ان کے دوپٹے عموماً ان
زن کا ہار بن کے رہ جاتے ہیں۔ سینے پر نہیں رہتے۔ اور ان کے سینے بڑے
معلوم ہوتے ہیں۔
جلسے کے باہر سبزے کے تختے پر چائے کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو دو تین تین کی
ہیں وہ ادھر سے ادھر آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ زیادہ تر لڑکیاں رنگین
اور سفید شلواریں پہنے تھیں۔ ایک کالی شلوار پہنے تھی۔
نعیم پھر سوچنے لگا۔ اگر مزدوروں کی تمام تحریکیں مٹا دی جائیں، اگر روس کو
یقت شکست ہو جائے تو اس صورت میں بجائے سرمایہ داری کی مخالفت کی
ـ کے اگر ساری کی مخالفت کی ایک تحریک شروع کی جائے تو کس قدر
ب ہوگا۔ ساڑی کی مخالفت میں ہر ضلع اور ہر تحصیل میں کمیٹیاں اور سب کمیٹیاں
ی جائیں۔ اور کوہ ہندوکش سے لے کر راس کماری کے اس پار تک اور کیپ چینگا
ولمو تک شلوار ہی شلوار ہو۔ شلوار زندہ باد۔
سامنے کی میز پر دو بڑی خوبصورت پا[illegible] ہندو لڑکی
ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھیں۔ اتنے میں [illegible] والی لڑکی کو بیگم شہزور خان

نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ یہ لڑکی قریب آئی۔ تو نعیم نے دیکھا کہ اس کے خوبصورت ہونے میں شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ہلکے بھورے بال جو گھٹنوں کے قریب قریب پہنچتے تھے۔ دراز قد، جسم ذرا گداز، رنگ بہت صاف، ناک نقشہ بہت اچھا۔ بیگم شہزور خاں نے نعیم سے اس کا تعارف کرایا۔ اور لڑکی کا نام ماہ پارہ صلاح الدین بتایا۔ وہ پنجاب کے کسی کمشنر (پنشن یافتہ) کی لڑکی تھی اس نے نعیم سے باتیں بھی کیں۔ لیکن نعیم کو بلقیس یاد آنے لگی۔ یہ سب موم کی گڑیاں اس کے لئے نہیں بنی تھیں اور بلقیس اس کی قسمت میں نہ تھی۔

واپسی میں موٹر میں بیگم شہزور خاں نے نعیم سے پوچھا "کیوں ماہ پارہ تمہیں پسند آئی؟"

نعیم نے جواب دیا "جی ہاں، بڑی اچھی لڑکی ہے، کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرا دیجئے۔"

"تم نہیں کرو گے؟" بیگم شہزور خاں نے سوال کیا۔

نعیم مسکرا کے آٹوگراف کی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگا۔

بیگم صاحبہ نے پھر وہی سوال دہرایا تو نعیم نے بات ٹالنے کے لئے پوچھا "بیگم صاحبہ آپ اجازت دے دیں تو میں ان آٹوگراف کی کتابوں کے کچھ حصے آپ کو سناؤں جو ان لڑکیوں نے آپ کی دستخط کی عزت حاصل کرنے کے لئے پیش کی ہیں؟"

بیگم صاحبہ خاموش ہو گئیں تو نعیم نے ایک آٹوگراف کی کتاب کھولی۔

نعیم نے سنانا شروع کیا "صاحبزادی کا نام ہے، جہاں آرا قریشی"

بیگم صاحبہ بول اُٹھیں "یہ ہاں میں اس لڑکی کو جانتی ہوں"
نعیم نے کہا "سُنئے ان کی ایک سہیلی روح پرور بانو نے ان کی آٹوگراف بک میں کیا لکھا ہے:

"جہاں تم نے مجھ سے لکھنے کو کہا ہے اور ایسے زمانے میں جب میرے رنج کا سیلاب صبر و سکون کی حد سے ٹکرا رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں اس بند کی بندش کو توڑ نہ دے۔ غور کرتی ہوں کہ کیا لکھوں۔ یہ تو بالکل کافی نہیں۔ اور پھر میرے قلم سے، کہ جیتی رہو اور خوش رہو۔ پھر آخر کیا لکھوں۔ خیر جو کچھ دماغ میں آتا ہے صفحۂ قرطاس پر لکھتی ہوں۔

جہاں آرا تم اس حسین دھنک کی طرح ہو جو بارش کے بعد آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔ تم اس تیتری کی مانند ہو جس کے پروں پر قوسِ قزح کے رنگ ہوتے ہیں تم عطر بیز نسیم ہو، غرض اور کیا کچھ لکھوں۔ بس یہیں تک لن ترانی ٹھیک ہے۔ خدا تمہاری ہر ایک خواہش میں تم کو کامیاب اور کامران رکھے۔

تمہاری قابلِ فراموش

"روح پرور بانو"

نعیم نے ہنس کے رائے دینی شروع کی "سبحان اللہ، سبحان اللہ، بیگم صاحبہ ملاحظہ فرمائیے، کیا انشا پردازی ہے، اور سہیلوں کے آپس کے جذبات تو ملاحظہ فرمائیے"

بیگم شہزور رحماں نے کہا "تم رہنے بھی دو۔ لڑکیوں نے یہ کتابیں اس لئے تو نہیں دی ہیں کہ تم ان کا مذاق اڑاؤ"

"نیم نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہا "اور سُنئے، کچھ نظم نما نثر بھی ہے جو صاحبزادے اس کے مصنف ہیں ان کا اسم گرامی خالد ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں :

"ایسی کتاب میں کچھ لکھنا
جسے خواتین دیکھیں
اور جسے مرد چھپ چھپ کے پڑھیں
یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا
میں شرمیلا ہوں
اس لئے خدا حافظ
بے انتہا پیار کے ساتھ .....
تمہارا اپنا
خالد "

"یہ صاحبزادی تو معلوم ہوتا ہے، دِل وِل دے چکی ہیں۔ اب بیگم صاحبہ ان سے شادی کرانے سے کیا حاصل ؟"

بیگم شہزور خاں نے کہا "بھئی تم بڑے شریر ہو۔ میں تو تم سے ماہ پارہ سے شادی کرنے کو کہہ رہی ہوں ۔"

"اچھا دیکھئے یہ ہے ماہ پارہ کی آٹوگراف کی کتاب۔ کیوں کچھ سنئے گا ؟"

"بھئی تم رہنے بھی دو۔ ان کتابوں میں کیا رکھا ہے ؟"

"سنئے آپ کی ماہ پارہ بیگم کی ایک سہیلی گیتی کا ارشاد ہے ــــــ

اچھا، یہ ماہ پارہ بیگم کونوٹس میں بھی پڑھ چکی ہیں، گریجویٹ ہیں، یہاں ایم اے میں آئی ہیں؟ بیگم صاحبہ دلہن تو آپ نے میرے لئے خوب انتخاب کی ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے ان کی سہیلی گلسی بیگم کا ارشاد ہے:

”میری پیاری ماہ پارہ۔ تم نے ایسے وقت میں مجھے آٹو عنایت کی ہے کہ ایک تو امتحان سر پر سوار ہے، دوسرے رمضان شریف تشریف رکھتے ہیں۔ تم خود انصاف کر سکتی ہو کہ مجھ جیسی کمزور ناتواں بھولی بھالی لڑکی کس طرح اپنے خیالوں کو یکجا کر سکتی ہے۔ مگر تم جیسی ہستی کے لئے ہر بات ممکن ہو سکتی ہے۔ اب میرے اس لکھے ہوئے پر عمل کرو۔ محبت دنیا کو آباد کرتی ہے۔ محبت کی طاقت بے انتہا ہے ——— بے حد ہے جو لوگ محبت کی دنیا سے باہر رہتے ہیں ——— ان کی زندگی سرد ——— خشک ——— بے مزا ——— بے کار اور بے معنی ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو محبت کے حوالے کر دو اور اسے رہبری کرنے دو ——— وہ تمہیں ایسے راستوں پہ لے جائے گی جو پھولوں سے پُر ہوں گے ——— تم پر طرح طرح کی بلائیں ٹوٹ پڑیں گی جو تمہاری دنیا کو عارضی جنت یا جہنم میں تبدیل کر دیں گی ——— مگر ——— کچھ دنوں کے لئے ——— ان سے مت گھبراؤ۔ کبھی محبت کا ساتھ بھولے سے بھی مت چھوڑو۔ محبت کا دامن ہمیشہ پکڑے رہو۔ بلکہ محبت سے چمٹی رہو۔ محبت کے سانچے میں پیدا ہوئی ہو، اسی میں رہو۔ اسی میں مرو۔ تم قانونِ قدرت کی پابندی کرو گی اور ——— یہی تمہاری زندگی کا اصل مقصد ہے۔

۲۰

تمہاری اپنی دوست

"گیتی آرا"

بیگم شہزور خاں نے پوچھا "کیوں چپ کیوں ہو گئے۔ اس میں بُری بات کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" نعیم نے جواب دیا "بجز اس کے کہ میرے خیال میں گیتی آرا بیگم نے یہ پورا مضمون کسی تیسرے درجے کی اُردو کتاب یا رسالے سے چُرایا ہے"

"تو اس میں ماہ پارہ کا کیا قصور ہے؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، اور سنئے کوئی عالیہ صاحبہ ہیں۔ انہوں نے آپ کی ماہ پارہ کا اسی مضمون کا ایک شعر مرحمت فرمایا ہے، لکھتی ہیں:

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی

سُناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

ماہ پارہ کے لئے ایک خاص نصیحت آمیز شعر

آپ کی بہن "عالیہ"

"ماشاءاللہ کیا دل پھینک لڑکیاں واقع ہوئی ہیں"

اتنے میں موٹر نواب شہزور خاں کی کوٹھی میں جا کے ٹھہر گئی۔ نواب صاحب باہر ٹہل رہے تھے۔ وہ فوراً ہی موٹر کے قریب آئے اور پوچھنے لگے "کیوں نعیم صاحب جلسہ کیسا تھا؟"

"جلسہ تو اچھا خاصا تھا۔ میں نے طے کیا ہے۔ اگر کسی سبب سے منٹن ختم

کر دی جائے تو اشتمالیوں کو مشورہ دوں کہ ایک کل ہند انجمن حمایتِ مشلار قائم کی جائے اور ایک بین الاقوامی محاذ ساری کے خلاف تیار ہو۔"

"کوئی لڑکی پسند نہیں آئی؟" نواب شہزور خاں نے پوچھا۔

"ایک لڑکی کو بیگم صاحبہ نے میرے لیے پسند فرمایا ہے۔ ماہ پارہ نام ہے — پنجاب میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں تعلیم پائی اور دہلی میں تعلیم کی تکمیل کر رہی ہے۔ ماشاءاللہ۔ بالکل بین الصوبہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اس کی آٹوگراف کی کتاب ہے۔ نواب صاحب ذرا یہ نقشہ ملاحظہ فرمائیے ....."

نام	سہیلی	نوجوان دوست جس سے فلرٹ کیا کرتی ہو	محبوب جانور	محبوب پھول	مشغلہ	پسندیدہ ایکٹر	پسندیدہ ایکٹرس	مستقبل کا ارادہ
ماہ پارہ	گیتی آرا	"س"	خرگوش	کوکنار	کھانا	لیزلی ہورڈ	نینا	خانہ آبادی
گیتی آرا	ماہ پارہ	"ی ج"	کتّا	جوہی	تصویریں جمع کرنا	اشوک کمار	نسیم	ڈاکٹری
جہاں آرا	روح پرور	"ک ن ا"	بلّی	گلاب	پرانے ٹکٹ جمع کرنا	ہارڈی لارل	خورشید	شادی

نعیم اور نواب صاحب دونوں ہنسنے لگے۔ بیگم صاحبہ نے کہا "ذرا میں بھی دیکھوں۔"

نعیم نے آٹوگراف البم ان کے سپرد کئے۔ بیگم صاحبہ نے کہا "اس میں کیا ہے۔ یہ تو لڑکیوں کا کھیل ہے۔"

نعیم نے جواب دیا "بجا ارشاد ہوا۔ لیکن آپ ہی فرمائیے۔ میں نہ تو ماہ پارہ بیگم کا نوجوان دوست "دس" ہوں۔ نہ ان کا محبوب جانور خرگوش، نہ ان کا پسندیدہ ایکٹر 'لیزلی ہوورڈ'۔ اب آپ نے اگر مجھ سے ان کی شادی کر بھی دی تو بتائیے وہ بھلا کیا خوش رہیں گی۔ پھر معلوم نہیں یہ 'غالباً شادی' کیسی ہوتی ہے۔"

نواب صاحب نے کہا "نہ تو سب بے ضرورت سی باتیں ہیں۔"

(۷)

۱۹۴۲ء میں کشمیر گلمرگ کے مزدور اب بھی کئی کئی من کے ٹرنک اپنی پیٹھ پر لاد کر تین ہزار فیٹ کی بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ اب بھی جہلم کے کنارے مزدور سینوں پر رسیاں باندھے دریا کے بہاؤ کے خلاف ڈونگوں کو کھینچتے جاتے گویا دانتے کے جہنم میں گنہگاروں کی روحیں جانوروں کی طرح اپنے گناہوں کے بوجھ کھینچ رہی ہیں — کبھی کبھی مرد تو ڈونگوں اور کشتیوں میں بیٹھے رہتے اور مزدور عورتیں اور بچے سینوں پر رسیاں باندھے ان کشتیوں کو کھینچتے دکھائی دیتے اور نعیم کو تعجب ہوتا کہ کیا ان عورتوں کے شفاف سینے اسی لئے بنائے گئے ہیں۔ اب بھی ٹٹو والے اپنے ٹٹو کے ساتھ پہلگام سے چندن واڑی تک اٹھارہ میل کا چکر لگاتے تو ان کو دو روپے تین آنے مزدوری ملتی۔ اور اگر وہ پہلگام کے ایک ہوٹل میں کسی مسافر سے اپنے کرائے کے پیسے مانگنے آتے تو ہوٹل کا مالک چھڑی سے انہیں جانوروں کی طرح مارتا۔ اس سال سیاحوں کی کثرت تھی۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے انگریز یورپ نہیں جا سکتے تھے۔ بہت سوں نے

کشمیر کا رُخ کیا۔

نعیم نے کشمیر کی اچھی خاصی سیر کی۔ سری نگر میں بطور ہوٹل میں ٹھہرا۔ نشاط باغ دیکھا، شالامار دیکھا — نئے اور پرانے پل دیکھے۔ ڈل جھیل دیکھی جس کے مقابلے میں کومو اور جھیل لیمان حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ سونا مرگ گیا، جہاں ہر سال برف پڑتی ہے اور ہر سال پہاڑ سے بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ کر گرتی ہیں۔ ایک چٹان ٹوٹ کر گری تھی اور اب تک راستے پر پتھر گرتے تھے۔ ماجواس سے اس نے گلیشیروں کی وادی کا منظر دیکھا۔ نئے وادی میں ایک تیز رفتار چشمہ بہتا ہے۔ صنوبر کے درخت پہاڑوں پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بلندی پر پہنچ کے صنوبروں کی زندگی مشکل ہو جاتی تھی اور پھر برف ہی برف تھی۔ ہزاروں فیٹ کی چوٹیوں تک بلند ہوتی ہوئی برف۔ سامنے ماجواس کا گلیشیر تھا۔ تہ بہ تہ ناسس پر قاش برف۔ برف کی چٹانیں۔ گلیشیروں کی وادی کے سرے پر کولاہوئی کا گلیشیر تھا اور کولاہوئی کے پہاڑ کی چوٹی۔ اس وادی کا حسنِ ہیبت ناک انسان کی نفسیاتِ خودی پر پہاڑ کی طرح حاوی معلوم ہوتا تھا۔ گویا قدرت کی بلندی بجائے خود ایک ایسی لالٹین ہے جو انسانی نظر تک کو پیس کے رکھ دیتی ہے۔

ماجواس میں اس وادی کے سامنے خیمہ لگائے، آرام کرسی پر دراز نعیم شیلے کی نظم الاسٹر پڑھ رہا تھا۔ وہ ان اشعار تک پہنچا، جو بڑے حسبِ حال معلوم ہوئے:

"شاعر بھٹکتا ہوا

عرب اور ایران اور کارینی بنجر زمینوں سے ہٹتا ہوا گندا
اور ان ہوائی پہاڑوں پر سے جو اپنے برفانی غاروں سے
دریائے سندھ اور دریائے جہلم کو انڈیلتے ہیں
مسرت اور انبساط اس کے ہمرکاب تھے
یہاں تک کہ کشمیر کی وادی میں (کشمیر کی) سب سے پیاری گھاٹی
میں بہت دور جہاں خوشبودار پودے
کھوکھلی چٹانوں کے پیچھے آپس میں لپٹ کے
ایک قدرتی برگ پوش مسکن بناتے ہیں
ایک چمکتی ہوئی ندی کے کنارے
اس نے اپنے تھکے ہوئے ہاتھ پاؤں پھیلائے "

لیکن دو ہی چار منٹ کے بعد جب نعیم نے ٹٹو والے سے اس منظر کی تعریف کی تو اس نے جواب دیا "جناب ہم کیا کرے گا۔ ہمارے واسطے تو یہ جہنم ہے جناب۔ ادھر غربت بہت ہے۔ ہم پر بڑا ظلم ہوتا ہے سال میں چھ مہینے بخشش مل جاتا ہے چھ مہینے ہم گھر میں بیٹھا ہے۔ بھیڑ کے اون سے کپڑے بناتا ہے۔ جناب کپڑا بہت مہنگا ہوگیا ہے۔ ادھر غریب پر بہت ظلم ہوتا ہے۔"

زوجی لا کا پہاڑ سونامرگ کے ہرے بھرے مرغزاروں سے بڑا خوشنما نظر آتا ہے۔ ہوا اتنی لطیف ہے کہ کبھی کبھی مسافروں کے تین بجے زوجی لا کی چوٹی سے اوپر بے نور چاند کو صاف دیکھ لیتا ہے۔ سونامرگ کے ایک تنگ راستے پر ٹٹو پر بیٹھے بیٹھے نعیم زوجی لا کی سفید چوٹی سے بھی بہت اونچے چاند کو دیکھ رہا تھا کہ ایک

ٹٹو والے نے جو سامنے سے آرہا تھا، زور سے " ہوشیار ہوشیار" کہا۔ اس ٹٹو پر ایک انگریز عورت سوار تھی۔ کارڈورا۔ ے کے سلیک پہنے۔ دفعتہً اس نے اپنا ٹٹو روک لیا اور تعجب اور خوشی سے کہا "نعیم!"

نعیم نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے چہرے پر کہیں کہیں ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ لیکن ان سیاہ حلقوں، ان شکنوں کے پیچھے اس نے میری پاول کو پہچان لیا۔

"میری!" اس نے بھی اسی خوشی اور استعجاب سے اس کا نام دہرایا "مگر تم یہاں کہاں؟"

"دنیا بہت مختصر ہے، ہے نا؟" میری نے جواب دیا۔

آہستہ غیر متوقع طور پر میری سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سہ پہر پھر انتظار کرا کے رات کو وہ ہرونشا کے ساتھ پیرس کے قہوہ خانے میں نمودار ہوئی تھی۔ اس کے اپنے کمرے میں وہ اس وقت آئی جب اسے سان گمان بھی نہ تھا۔ اسی طرح ہندوستان جاتے وقت وی آنا کے اسٹیشن پر اس سے ملاقات بھی عجب اتفاق تھا، اور اب یہاں۔ سونا مرگ میں۔

دونوں اپنے ٹٹوؤں سے اتر پڑے۔ میری یہاں خیمہ لگا کے گلیشیر کی تصویر بنانا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں، اس نے مصوری کب سے شروع کی تھی۔ نعیم نے بھی سری نگر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میری پر بلکلنت خزاں آگئی تھی۔ بلکہ آ کے گذر بھی گئی تھی اور اب سرما ہی سرما تھا۔ اس قدر جلد! تیس سال سے کچھ اوپر اس کی عمر تھی مگر وہ چالیس کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ

زیبا چھک بھی گئی تھی۔ یہ گلِ سُرخ " کی ساری شادابی اور سُرخی رخصت ہو چکی تھی۔ سفیدی
کے سوا اب زردی ہی زردی تھی۔
ہیری نے کہا "جیمز کے متعلق تمہیں معلوم ہوا ؟"
نعیم نے کہا "نہیں سال ڈیڑھ سال سے نہ جیمز کا کوئی خط ملا نہ تمہارا"
ہیری نے آہستہ سے جواب دیا "جیمز کرا کسلے اب کبھی نہیں خط نہ لکھے گا کیونکہ
وہ واپس نہیں آیا۔ اس کی موت کی تصدیق ہو چکی ہے"
اور اس کے بعد ہیری نے اپنا قصہ سنایا۔ وہ یونان ہی تھی۔ وہاں سے
اور تخلیہ کنندگان کے ساتھ ساتھ وہ ترکی اور پھر ایران آئی۔ جب ایران پر اتحادی
فوجوں نے حملہ کیا تو وہ بلوچستان پہنچی اور وہاں سے کشمیر۔ اپنی پریشانیوں
کی وجہ سے وہ نعیم کو خط نہ لکھ سکی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ نعیم سے بہر صورت
ضرور ملاقات ہوگی۔
نعیم نے ہیری کا بوسہ لیا تو اس نے اس کے لبوں پر موت کی سی سردی محسوس
کی۔ ہیری کی پسلیاں نکل آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کبھی ایک شعور کی ایک
جھلک سی چمک تھی۔ ان بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کے درمیان وہ ایک
لاش معلوم ہوتی تھی۔ موت آ چکی تھی اور اب نہ اس کا جسم زندہ تھا، نہ اس
کی روح۔ ہیری شا نے کہا تھا کہ جب ہیری پر خزاں آئے گی تو تکلیف آئے گی۔
جب تک "گلِ سُرخ" زندگی کا مقابلہ کرتی رہے گی، اس کے رنگ میں
فرق نہ آئے گا۔ مگر جس دن وہ زندگی سے ہار مان لے گی۔ اسی دن وہ بدنما
ہو جائے گی۔

(۸)

شکارے میں بیٹھ کر سری نگر کے سات پُلوں کی سیر کرتے وقت نعیمہ کے دل میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ جہلم کتنی گندی ہے۔ اس کا پانی کتنا بدبودار کنارے پر یہ بوسیدہ مکانات۔ یہ قرونِ وسطیٰ کا سا منظر اور یہ ہارون الرشید زمانے کا بغداد۔ اس جنت کی عورتیں، غلیظ اور کثیف کپڑوں کے باوجود حُسنِ نسوانی کا یہ عالم کہ آنکھیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں۔ ان چہروں کو دیکھ کر نظر بانسکی یاد نہیں ہے

کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد
بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد

اس غلاظت اور اس غربت میں بھی حُسن اس طرح نمایاں ہے۔ یہ حُسن کی بڑی دلیل ہے۔ بدلیوں میں بھی آفتاب کی چمک باقی ہے۔
لیکن اس کا اپنا ہاتھ بھی کسی کی گردن میں خم ہوگا؟ ابھی اس کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ تین ...ں سے اس کا خط نہیں آیا۔ میری بھتنی بن گئی ہے۔ بلقیس کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن کیا اس کا امکان نہیں کہ بلقیس کے اور راحت خاں کے تعلقات دن بدن خراب ہوتے جائیں اور جیسا کہ خانم نے کہا تھا۔ واقعۃً طلاق یا خلع کی نوبت پہنچے۔ کیا جذبِ دل سے بلقیس تب بھی اس کی طرف نہ جھکے گی؟ بلقیس کی آنکھوں نے تو بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ ممکن ہے، ممکن ہے، کون جانے؟
یا ماہ پارہ صلاح الدین؟ ماہ پارہ اور صلاح الدین کا بھلا ذرا جوڑ بھی ہے — فاتح فلسطین کے ہمنام کی لڑکی کا نام ترکی کنیزوں جیسا۔ مگر یہ اس کا نوجوان دوست

"بس" کرن ہے۔ غالباً بچپن کا خواب و خیال کا بے صبر ... روں سال
کچھ نہیں اور اگر کہیں ماہ پارہ سے شادی ہو جائے تو گھر کا ... طرح بہت
کوئی دس پندرہ پالتو خرگوش سفرسٹ شہر میں لیزلی ہوورڈ کا کوئی ...
... کا فلم۔ گھر کے صحن میں کو کنار کے پھول۔ معلوم نہیں پریم پتر کے ...
اُگیں گے بھی یا نہیں۔ خیر کھانا تو اچھا ملے گا۔ اور کبھی کبھی گیتی آرا بیگم آ...
کے فضائل پر تقریریں کیا کریں گی۔ ماشاءاللہ کیا دلچسپ زندگی ہو گی اور ...
نے مسکرا کے فیصلہ کیا۔ "نہیں بھئی یہ ماہ پارہ بیگم تو میرے بس کی نہیں ...
کا ما نہیں یا نہ مانیں۔ میں تو معذور رہوں۔"

ٹخلیہ ... کے پار قدر سرائے سے آگے بڑھ چکا تھا۔ دو پہر ...
... منظر کے ... اور خود ایک بلندی پہ ہری پربت کا قلعہ ...
... معلوم ہو رہا تھا۔

جہانگیر بھی اسی طرح جہلم کی سیر کرتا ہو گا۔ اگر روشنی سے زیادہ تیز ...
روشنی سے زیادہ تیز رفتار سے ماضی میں سفر کیا جائے تو جہانگیر کے زمانے
اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر آئن سٹائن نے یہ بھی تو کہا
کہ کسی مادی جسم کا روشنی سے زیادہ تیز سفر کرنا ناممکن ہے۔ چھٹے جو ...
بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ اس مختصر سی زندگی میں انگلستان کے تین بادشاہوں کی
بادشاہت دیکھ لی۔ یہی کیا کم غنیمت ہے۔

وہ تمام عمر کنوارا ہی کیوں نہ رہے؟ اس میں کیا برائی ہے۔ جنگ کے بعد
ہر دوسرے تیسرے سال یورپ کا سفر۔

ظلمت ۔ خدا کی پناہ ۔
یت ڈان کا رنگ سُرخ ہے ۔ حملہ آور مجرموں کے خون سے ۔ کیا
دل میں اشتمالیت اور انسانی مساوات کے تصور کی ذرا بھی چنگاری
کاش اس میں اتنی ہمت ہوتی ۔ کاش اس میں اتنی جرأت ہوتی ۔ وہ
لے کنارے کی کرٹی اور جہلم کی سطح کے شکارے دونوں کو چھوڑتا ـــــ
لے کی طرح اس کا ہوائی جہاز کبھی نانسی آسمانوں پر اڑتا ۔ وہ ڈان میں
ظلوموں کے خون کی سُرخ روانی کو دیکھتا اور پھر اس کے بعد دنیا کا
نظر نہ دیکھ سکتا ۔ لیکن اس کی قربانی اور اس جیسے دوسروں کی قربانی
یا کہ نانسی کبھی ڈان کے آگے نہ بڑھ سکتے ۔
لم کے شکاروں کے گدے بہت نرم ہوتے ہیں اور جہلم لاکھ غلیظ سہی
ہارون الرشید کے بغداد اور دجلہ کی یاد دلاتی ہیں ۔

(۹)

بیٹیوں کا زمانہ ختم ہونے کو آیا ۔ سرکاری عہدہ دار کو پھر اپنے فرائضِ منصبی
لگر جانا تھا ۔ کشمیر میں ڈیڑھ مہینہ اچھا گزرا ۔ فطری مناظر اور
باہمی ہمدردی کا مشاہدہ کرنے کا ذرا سا موقع ملا ۔ غریبوں پر ترس بھی
ات کی بھی ایک سرکاری حد ہوتی ہے اور انسانی ہمدردیوں کی بھی ۔
ب کر ڈیوٹی پہ واپس جانا تھا ۔ نعیم کے سرکاری جوتوں کے
کی زمین کانپنے لگی ۔ حکومت کرنے والے اور ہوتے ہیں اور محبت

مگر برہم پتر کا پانی اسی شان سے [illegible]
سے بہتا رہا ہے۔ برہم پتر نے بھی [illegible]
سے تماشے دیکھے ہیں۔ ان دریا [illegible]

بے نقش اگر [illegible]
کیا تجھ کو خوش [illegible] آدم کی یہ [illegible]

C11502